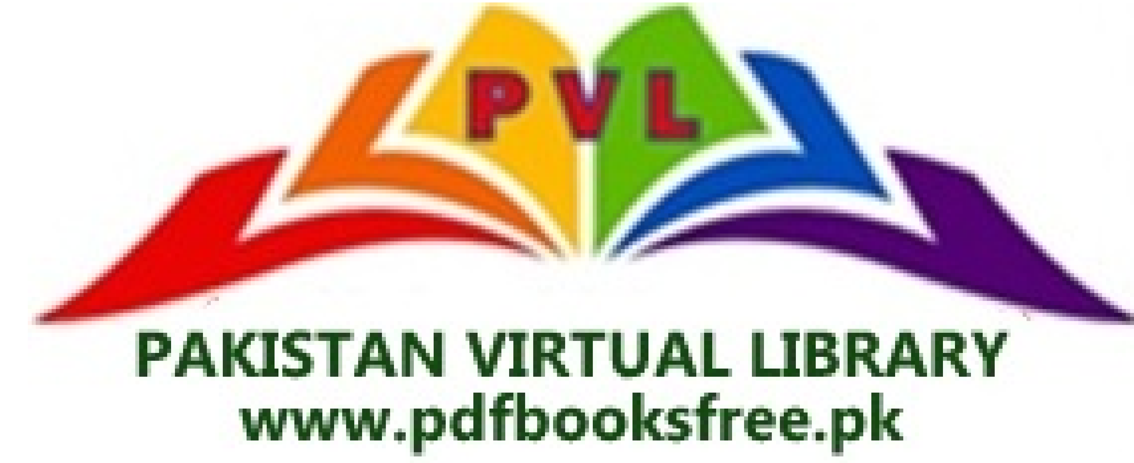
جہنم سے فرار

مقبول جہانگیر



چند سطریں

مہم جوئی اور مشکل پسندی روز ازل سے انسانی فطرت کا خاصا ہے۔ انسان نے جب سے شعور کی آنکھ کھولی ہے، اس کائنات کی تسخیر میں مصروف ہے۔ اَن گِنت حادثے اور لاتعداد رکاوٹیں اس کی راہ میں آئیں، لیکن اپنی بلند ہمتی، جرأت، استقلال، ایثار اور آہنی عزم کے سہارے بڑی سے بڑی مشکل آسان ہوئی اور کڑی سے کڑی منزل اس نے سر کر لی۔ انسان کی بقا کا راز بھی اسی حقیقت میں پوشیدہ ہے کہ قدرت نے اسے جو اعلیٰ صلاحیتیں ودیعت کی ہیں، انہیں بروئے کار لائے اور ہر آن اور ہر گھڑی نت نئی مہمیں طے کرتا رہے۔

موجیم کہ آسودگی ما عدم ماست
مازندہ ازانیم کہ آرام نہ گیریم

اس کتاب میں اسی قسم کے واقعات پیش کیے گئے ہیں جنہیں پڑھ کر آپ کو اندازہ ہوگا کہ انسانی عزم اور حوصلہ کیسے کیسے محیّر العقول کارنامے انجام دیتا ہے۔ یہ واقعات مختلف ملکوں میں مختلف لوگوں کو پیش آئے ہیں۔ ان میں بے کراں سمندروں کو بے سروسامانی کی حالت میں عبور کرنے کا لرزہ خیز ذکر بھی ہے اور صحراؤں اور برفانی میدانوں میں بھٹک کر اپنی منزل مقصود پر پہنچ جانے والوں کی ہولناک داستانیں بھی۔ پہاڑوں کا جگر چیرنے والے بھی آپ کو نظر آئیں گے اور انتہائی حوصلہ شکن حالات میں موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرانے والے بھی ملیں گے۔ ہر واقعہ روزِ روشن کی طرح سچا اور صاف ہے۔ بعض ناقابل فراموش اور ہولناک واقعات ایسے ہیں جنہیں آپ بھلانا چاہیں بھی تو نہ بھلا سکیں گے۔

مقبول جہانگیر

جہنم سے فرار

ڈیول آئی لینڈ جس کا ترجمہ شیطانی جزیرہ ہی کیا جاسکتا ہے، دنیا کا شاید ہیبت ناک ترین مقام ہے، جہاں فرانس کے وہ مجرم سزا بھگتنے کے لیے بھیجے جاتے تھے جنہوں نے قتل کیے ہوں۔ بڑے بڑے ڈاکے مارے ہوں یا معصوم لڑکیوں کے دامن عصمت کو تار تار کیا ہو، ایسے سبھی مجرموں کو، جو فرانس کے سرکاری چھرے (گلوٹین) سے بچ جاتے تھے، اس جزیرے میں نامعلوم مدت کے لیے قید کر دیا جاتا تھا۔ ان میں سے بہت کم ایسے ہوتے جو اپنی سخت جانی کے باعث یہ عذاب برسوں تک جھیلنے کے باوجود صحیح سلامت اپنے وطن تک پہنچ جاتے، ورنہ ان کی قبریں اس جزیرے میں بنتیں...... مجھے خوب یاد ہے کہ بچپن میں کئی مرتبہ میں نے ڈیول آئی لینڈ کا نام اور اس کے ڈراؤنے قصے مختلف لوگوں کی زبانی سنے تھے۔ لوگوں میں اس کے متعلق طرح طرح کی داستانیں مشہور تھیں جنہیں سن کر ہول آتا۔ ایک بار تو میں نے اس جزیرے کو خواب میں بھی دیکھا۔ آہ...... ان دنوں مجھے کیا معلوم تھا کہ ایک روز میں بھی مجرم بن کر اس جزیرے پر اس حال میں پہنچایا جاؤں گا کہ میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پیروں میں بیڑیاں ہوں گی اور دس سال کی بجائے مجھے اس شیطانی جزیرے پر 35 سال کاٹنے پڑیں گے...... خدا مجھ پر رحم کرے...... میں عمر کی اس منزل میں ہوں جہاں آدمی ہر لمحے موت کی آرزو کرتا ہے، لیکن اگر کوئی مجھے اب بھی وہاں بھیجنے کی سفارش کرے، تو میں خودکشی

کرلوں گا۔ 35 سال اور ان کا ایک ایک لمحہ میرے حافظے کی لوح پر اس طرح نقش ہو چکا ہے کہ اس کا محو ہونا ناممکن ہے۔ بعض اوقات مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اتنی مدت تک میں نے ایک بھیانک خواب دیکھا جس میں ذہنی اذیتیں، فاقہ کشی اور کڑی جسمانی سزاؤں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا۔ میں نے اس جزیرے سے فرار ہونے کے لیے 22 مرتبہ اپنی جان ہتھیلی پر رکھی، مگر ہر بار مجھے پکڑ لیا جاتا رہا۔ یہاں کے پہرے داروں نے مجھ پر مار پیٹ اور سختیوں کی انتہا کر دی، حتیٰ کہ مجھے ایک بار گولی مار دی گئی، لیکن زندگی ہی بے حیا تھی، میں ہر بار بال بال بچا، لیکن تمام وحشیانہ مظالم کے باوجود وہ میرے اندر آزادی کی بھڑکنے والی آگ کو سرد نہ کر سکے، بلکہ ان کی سختیاں جس طرح بڑھتی جاتی تھیں، اسی قدر میرا یہ جذبہ آزادی بھڑکتا اور تیز ہوتا تھا۔ آخر ایک روز ایسا آیا کہ میں یہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا اور پھر کبھی وہ مجھے تلاش نہ کر سکے۔ ان اوراق میں آپ میری یہی دکھ بھری، لیکن ڈرامائی داستان پڑھیں گے اور یقین کیجیے کہ اس داستان کا ایک ایک حرف صحیح ہے۔

❋ ❋ ❋

اُن دنوں ہم الجیریا میں رہتے تھے۔ میرے والد شراب کے بڑے تاجر تھے اور ان کا ارادہ تھا کہ جب میں اپنی تعلیمی مصروفیات سے فارغ ہو جاؤں گا، تو وہ کاروبار میرے سپرد کریں گے۔ میری عمر سترہ سال کی تھی اور میں الجیریا کے ایک زرعی کالج میں پڑھ رہا تھا۔ اس زمانے میں ایک عجیب اتفاق کے تحت میرا رجحان مجسمہ سازی اور مصوری کی طرف ہو گیا جس نے میری زندگی کا رُخ ہی بدل دیا۔ ایک روز میں اپنے کمرے میں بیٹھا مٹی کے بعض نمونوں پر تجربے کر رہا تھا...... خدا جانے کیا سوجھی کہ میں نے گندھی ہوئی چکنی مٹی سے انگڑائی لیتے ہوئے شیر کا ایک مجسمہ بنا دیا...... میں نے محسوس کیا کہ اگر میں مجسمہ سازی کا فن اختیار کرلوں تو اس میں بڑی ترقی کر سکتا ہوں۔ میرے والد اس ارادے پر خوش نہ تھے، لیکن میری ضد کے آگے انہیں ہتھیار ڈالنے پڑے۔ میں

نے زرعی کالج کو خیرباد کہا اور ایک آرٹ کالج میں داخلہ لیا۔ جلد ہی میرا یہ شوق جنون کی حدوں کو چھونے لگا۔ میں اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے تک لگاتار مجسمہ سازی میں مصروف رہتا۔ مٹی کے مجسمے بنانے کے بعد سنگ مرمر اور دوسرے پتھروں کی باری آئی میرا ہاتھ ان پر خوب رواں ہو گیا۔ جب میرا دایاں بازو ہتھوڑا چلاتے چلاتے شل ہو جاتا، تو میں بائیں ہاتھ میں ہتھوڑا سنبھال لیتا۔ دو سال تک میں نے یہ فن سیکھا اور نہ صرف اس کی تمام اصناف پر عبور حاصل کیا، بلکہ میرے دونوں بازو بھی بے حد مضبوط اور قوی ہو گئے۔ اب میرا بایاں بازو بھی اتنا ہی طاقت ور تھا جتنا دایاں بازو...... تیسرے سال جب امتحان لیا گیا، تو 220 طالب علموں کی جماعت میں میں دوم آیا اور حکومت کی طرف سے دو سال کے لیے پیرس میں تعلیم حاصل کرنے کا وظیفہ بھی منظور ہو گیا، لیکن جب مجھے پتہ چلا کہ بعض قانونی وجوہ کے باعث، جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں، میں پیرس نہیں جا سکتا' تو میں مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گیا۔ مجھے اپنی محنت پر پانی پھرتا نظر آنے لگا۔ میں نے پیرس کا پاسپورٹ حاصل کرنے کی بڑی تگ و دَو کی، مگر ناکام رہا۔ اس دوران میں ایک فرانسیسی فوجی افسر نے مجھے مشورہ دیا کہ اگر میں فرنچ فارن لیجن میں چار سال تک ملازمت کروں، تو پھر مجھے پیرس کا پاسپورٹ آسانی سے مل جائے گا۔ چار سال کی مدت بہت تھی لیکن اپنی مہم پسند طبیعت کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے فرنچ فارن لیجن میں ملازمت کی درخواست بھیج دی اور فوراً مجھے لے لیا گیا اور شمالی افریقہ میں بھیج دیا گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ قدرت آنے والے مصائب و حادثات کے لیے مجھے اسی طرح تیار کر رہی تھی۔ میری صحت چونکہ بہت اچھی تھی' بازو قوی تھے، اس لیے مجھے لائٹ ہیوی ویٹ چیمپئن ٹیم میں شامل کر لیا گیا۔ دوسری طرف فرصت کے اوقات میں میں اپنے ساتھیوں اور دوستوں کے مٹی کے چھوٹے چھوٹے مجسمے بناتا اور ان کو تحفے کے طور پر پیش کر دیتا۔ ان ''خوبیوں'' نے مجھے لیجن میں کافی ہر دل عزیز بنا دیا تھا۔ دن خاصے اچھے بسر ہو رہے تھے، کھانے پینے کی چیزیں عمدہ اور باافراط ملتی

تھیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ چار سال چٹکی بجاتے گزر جائیں گے، پھر میں پیرس جا کر مجسمہ سازی کے فن کی تکمیل کرلوں گا، لیکن قدرت میرے ان ارادوں پر مسکرا رہی تھی۔

1909ء کے موسم بہار کا ذکر ہے۔ ان دنوں شہر میخاریہ کے قلعے کی فصیل کے بیرونی جانب ہماری لجن کا قیام تھا۔ شام کے وقت یار لوگوں نے مجھے اور سارجنٹ تیکورتھ کو باکسنگ کے لیے آمادہ کرلیا۔ سارجنٹ تیکورتھ بھی میری طرح لمبا تڑنگا اور بے حد مضبوط آدمی تھا اور مجھے معلوم تھا کہ وہ میری ہردلعزیزی سے حسد کرتا ہے۔ میں چونکہ ایک معمولی سپاہی تھا، اس لیے مجھے خواہ مخواہ اس کا رُعب جھیلنا پڑتا تھا۔ دراصل لجن میں میرے آنے سے پیشتر سارجنٹ تیکورتھ ہی سب سے بڑا ''چمپئن'' سمجھا جاتا تھا، مگر دو ایک مقابلوں میں مجھ سے شکست کھا گیا، تو اس کی ساری شیخی کرکری ہوگئی۔ اب وہ مجھ سے بدلہ لینے کا موقع ڈھونڈ رہا تھا۔ میں نے ہرچند اس مقابلے سے انکار کیا، مگر دوستوں نے بڑی ضد کی اور کہا کہ اگر آج تم نے سارجنٹ سے دو دو ہاتھ نہ کیے، تو ہم شرط ہار جائیں گے۔ قصہ مختصر مجھے راضی ہونا پڑا، البتہ میں نے سوچ لیا کہ سارجنٹ سے خواہ مخواہ کی ضد بحث اچھی نہیں۔ میں اس سے ہار ہی مان لوں تو اچھا ہے، لیکن جب ہم رِنگ میں داخل ہوئے، تو سارجنٹ نے باکسنگ کے اصولوں کی پروا نہ کرتے ہوئے مجھ پر بے دریغ گھونسوں کی بارش کردی۔ رِنگ کے اندر چھوٹے بڑے عہدے کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا۔ میں چاہتا، تو اسے چھٹی کا دودھ یاد دلا سکتا تھا، مگر میں نے کوئی جوابی حملہ نہ کیا۔ سارجنٹ سمجھا کہ شاید میں ڈر گیا ہوں۔ اس نے میری ناک پر ایسا گھونسا مارا کہ خون جاری ہوگیا۔ میں نے اسے وحشیانہ حملوں سے روکنے کی کوشش کی، مگر وہ مجھ سے پورا انتقام لینے پر تُلا ہوا تھا۔ اس کا بس چلتا تو مجھے مار ہی ڈالتا۔ مجبوراً میں نے بھی ہاتھ دکھائے اور جلد ہی بیہوش سارجنٹ تیکورتھ کو چند نوجوان ڈنڈا ڈولی کی صورت میں رِنگ سے باہر لے گئے۔

منہ ہاتھ دھونے کے بعد میں نے اپنی وردی پہنی اور اس ناخوشگوار حادثے کی

کوفت مٹانے کے لیے میخاریا کے سب سے شاندار کیفے کی طرف چل دیا۔ راستے میں میخاریا کی سب سے حسین پیشہ ور لڑکی کوریٹا سے میری ملاقات ہوئی۔ ہم دونوں کیفے میں بیٹھے شراب پیتے اور خوش گپیاں کرتے رہے، یکا یک میرے کان میں کسی غیبی آواز نے کہا: ''اس لڑکی کو جی بھر کر دیکھ لو، ممکن ہے تمہیں اس کے بعد برسوں تک عورت کی شکل دیکھنے کا موقع نہ ملے۔'' میں ابھی دل کی اس آواز پر غور کر ہی رہا تھا کہ دفعتہً سارجنٹ تیکورتھ اپنے سوجے ہوئے چہرے کے ساتھ فوجی وردی پہنے کیفے میں داخل ہوا۔ اس نے خوب پی رکھی تھی۔ قدم کہیں رکھتا تھا، پڑتا کہیں تھا۔ اس نے پہلے مجھے نہیں دیکھا، بلکہ کوریٹا پر للچائی ہوئی نظریں جمادیں۔ پھر جھومتا ہوا جب وہ میز کے قریب آیا، تو اس نے مجھے پہچان لیا۔ اس کا چہرہ جو پہلے ہی سرخ ہو رہا تھا، غصے سے اور تپ گیا۔ اس نے مجھ سے کہا:

''یہاں سے بھاگ جاؤ......''

چونکہ ہم دونوں وردیاں پہنے ہوئے تھے، اس لیے سارجنٹ کا حکم ماننا میرا فرض تھا۔ میں نے بے چون و چرا کرسی چھوڑ دی۔ دوسرے ہی لمحے اس نے کوریٹا پر ہاتھ ڈال دیا اور بدتمیزی کا اعلانیہ مظاہرہ کرنے لگا۔ کوریٹا اس موذی کی دراز دستی سے بچنے کے لیے چیخنے چلانے لگی......اس نے سارجنٹ کے منہ پر تھوکا اور کہا: ''دور ہو ناپاک کتے......'' سارجنٹ تیکورتھ کے سر پر قضا کھیل رہی تھی، وہ بھلا کہاں مانتا۔ اس نے کوریٹا کو پکڑ کر اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کی اور جب وہ نہ مانی، تو اس نے شراب سے بھرا ہوا گلاس اٹھایا اور کوریٹا کے منہ پر دے مارا۔ خون کی ایک پتلی سی دھار کوریٹا کی پیشانی سے نکلی اور اس کے کپڑوں کو تر کرگئی۔ یہ دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ نتیجے کی پروا کیے بغیر ایک ثانیے کے اندر میں نے جھپٹ کر سارجنٹ کا گلا دبا دیا اور اس وقت تک گرفت کمزور نہ کی جب تک اس کا دم نہ نکل گیا۔

قصہ مختصر مجھے موقعے ہی پر گرفتار کرلیا گیا۔ میرا کورٹ مارشل ہوا......شہادتیں

میرے حق میں تھیں اور خود میں نے اپنے بیان میں یہ کہا کہ میری نیت سارجنٹ کو ہلاک کرنے کی نہیں تھی۔ ان شہادتوں کے پیش نظر فوجی عدالت نے کم از کم یہ سزا تجویز کی کہ مجھے دس سال کے لیے ڈیول آئی لینڈ بھیج دیا جائے۔ سب سے پہلے الجیرز کے خوف ناک قید خانے میس کیری سے میرا سابقہ پڑا۔ مجھے اس قید خانے میں اس وقت تک رہنا تھا جب تک ڈیول آئی لینڈ جانے والا جہاز ''لالوری'' واپس نہیں آ جاتا۔ اس قید خانے میں ہر ہفتے فرانسیسی نو آبادیوں سے ان قیدیوں کی کھیپ لائی جاتی جنہیں قسمت نے سرکاری چھرے سے بچا دیا تھا۔ یہ سب کے سب قیدی ''خطرناک ترین'' تھے اور ان کے لیے ڈیول آئی لینڈ سے زیادہ مناسب جگہ دنیا بھر میں کہیں اور نہ تھی۔ ان میں سے اکثر ایسے مجرم تھے جن کا کام ہی بے گناہ لوگوں کو معمولی معمولی باتوں پر قتل کرنا تھا۔ میری ملاقات یہاں انڈوچائنا سے لائے گئے ایک ''آدم خور قاتل'' سے ہوئی جس نے بھوکا ہونے کے باعث ایک کمسن بچے کو ہلاک کر کے گوشت بھون کر کھایا تھا...... میں خدا کا شکر ادا کرتا تھا کہ قید خانے کے محافظوں نے مجھے علیحدہ کوٹھڑی میں بند کیا تھا، کیونکہ وہ مجھے ''خطرناک ترین'' مجرم کے ساتھ ''طاقت ور ترین'' آدمی بھی سمجھتے تھے جو ایک ہی مرتبہ ہٹے کٹے سارجنٹ کا گلا دبا کر ہلاک کر دینے پر قادر تھا۔

میس کیری کے قید خانے میں ایک روز میرا باپ مجھ سے ملنے آیا۔ اگرچہ مجرموں سے ملنے کی اجازت کسی کو نہ تھی، لیکن اس نے محافظوں کو رشوت وغیرہ دے کر چند منٹ کے لیے اجازت حاصل کر ہی لی۔ وہ جانتا تھا کہ میں نے سارجنٹ تیکورتھ کو دانستہ ہلاک نہیں کیا، تاہم اسے صدمہ تھا کہ وہ ایک ایسے قاتل بیٹے کا باپ ہے جسے ڈیول آئی لینڈ میں بھیجا جا رہا ہے۔ اس نے جو الفاظ کہے وہ برسہا برس تک میرے کانوں میں گونجتے رہے۔

''بدبخت! تو نے ہمارے خاندان کے نام کو بٹہ لگا دیا ہے۔ کاش تو پیدا ہوتے ہی مر جاتا۔'' آخر دو ماہ کے شدید انتظار اور بے شمار ذہنی تکالیف برداشت کرنے کے بعد

جہاز لالوری قیدیوں کو ڈیول آئی لینڈ لے جانے کے لیے آیا۔ اس دوران میں چار سو خطرناک قیدی جمع ہو چکے تھے۔ ان کو بھیڑ بکریوں کی طرح جہاز کے پنجروں میں بند کر دیا گیا۔ جہاز کافی بڑا تھا اور اس میں لوہے کی موٹی موٹی سلاخوں کے پندرہ بڑے پنجرے قیدیوں کے لیے بنائے گئے تھے۔ سفر کے دوران میں کسی قیدی کو ان پنجروں سے باہر نکلنے کی اجازت نہ تھی۔ ہر پنجرے کے باہر قوی ہیکل مسلح محافظ دن رات پہرہ دیتے۔ لالوری کا وہ سفر میں ساری زندگی نہ بھول سکوں گا۔ یہ ایک ایسا عذاب تھا جو انسان کی قوت برداشت سے باہر تھا۔ کھانے کے لیے صرف اُبلے ہوئے چاول دیئے جاتے جن سے بدبو کے بھبکے اٹھتے تھے۔ ایک ماہ تک جہاز چلتا رہا اور روزانہ ایک دو قیدی زندگی کی قید سے آزاد ہوتے رہے۔ ان کی لاشیں فوراً سمندر میں پھینک دی جاتی تھیں جہاں جہاز کے ساتھ ساتھ تیرتی ہوئی سینکڑوں شارک مچھلیاں انہیں آن واحد میں چٹ کر جاتیں۔ قیدیوں کو مرعوب کرنے کے لیے جہاز والوں نے ایک ایسا انتظام کر رکھا تھا کہ اس کے تصور ہی سے روح فنا ہوتی تھی۔ ہر پنجرے کے اوپر ایک موٹا سا لوہے کا کھلا پائپ لگا ہوا تھا جس میں سے بدن کو جھلسا دینے والی بھاپ نکلتی تھی۔ ایک بار چند قیدی آپس میں لڑ پڑے۔ محافظوں نے انہیں روکنا چاہا، مگر لڑائی اور تیزی ہو گئی۔ مجبور ہو کر انہوں نے پائپ میں سے بھاپ چھوڑ دی۔ خدا کی پناہ...... بدنصیب قیدیوں کی وہ فلک شگاف چیخیں آج بھی میرے کانوں میں گونجتی ہیں۔ چند سیکنڈ بعد ہی وہ سب کے سب ایک دوسرے کے اوپر بے ہوش پڑے تھے۔ پھر کئی روز تک ان میں ہلنے جلنے کی سکت نہ رہی۔ بعد ازاں ڈیول آئی لینڈ پہنچ کر ان میں سے ایک قیدی نے مجھے بتایا کہ ''بھاپ جوں ہی میرے جسم پر لگی، یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے مجھے دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹا دیا ہے۔'' جہاز کے محافظ خود کہتے تھے کہ اگر اس بھاپ کو آدھے گھنٹے تک کھلا رکھا جائے تو یہ سب لوگ اسی طرح اُبل جائیں جس طرح کھولتے پانی میں انڈے اُبالے جاتے ہیں۔

ایک ماہ بعد یہ ہولناک سفر ختم ہوا۔ ایک روز ہمارے پنجرے کا دروازہ کھولا گیا اور قیدیوں کو باہر آنے کا حکم ملا۔ اس تمام عرصے میں ہم میں سے کسی نے سورج کو نہ دیکھا تھا۔ معلوم ہوا کہ صرف ساٹھ قیدی ڈیول آئی لینڈ کے قید خانے ''کاینی'' میں بھیجے جائیں گے۔ باقی کہاں جائیں گے، یہ ہمیں اس وقت پتہ نہ چلا۔ جونہی ہم جہاز کے عرشے پر آئے، سورج کی تیز دھوپ میں قیدیوں کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ میں نے محسوس کیا کہ میں ہمیشہ کے لیے اندھا ہو جاؤں گا۔ سورج کی کرنیں سوئیوں کی مانند آنکھوں میں کھُبی جاتی تھیں۔ ایک گھنٹے تک یہی کیفیت رہی، اس کے بعد کچھ کچھ دکھائی دینے لگا۔

جیسا کہ میں نے پہلے بتایا، کاینی کے مقام پر صرف ساٹھ قیدیوں کو اتارا گیا۔ کاینی، فرنچ گیانا کا ایک ساحلی جزیرہ ہے جو ڈیول آئی لینڈ میں شامل ہے، لیکن کہا جاتا ہے کہ دوسرے تمام جیل خانوں کی نسبت یہاں قیدیوں کے ساتھ 'زیادہ بُرا'' برتاؤ نہیں کیا جاتا۔ میرا نمبر 37,406 تھا۔ دیر تک میں اپنے سے پہلے یہاں آنے والے ہزاروں قیدیوں کے بارے میں سوچتا رہا کہ ان بدنصیبوں پر نہ جانے کیا بیتی ہوگی اور اب میرا بھی وہی حشر ہونے والا ہے۔ سب سے پہلے ڈیول آئی لینڈ کو نپولین، شاہ فرانس نے سیاسی قیدیوں کی نظر بندی کے لیے استعمال کیا تھا۔ وہ اپنے مخالفوں اور سیاسی حریفوں کو جان سے مارنے کے بجائے ڈیول آئی لینڈ بھجوا دیا کرتا تھا۔ ان سیاسی حریفوں کو پھر کبھی اپنے وطن پہنچنا نصیب نہ ہوتا، کیونکہ یہ جزائر فرانس سے ہزارہا میل دور ہیں اور عرصہ دراز سے فرانس نے ان پر قبضہ جما رکھا ہے۔ جس زمانے میں میں یہاں پہنچا، ان دنوں بھی بے شمار سیاسی قیدی یہاں نظر بند تھے، لیکن اخلاقی قیدیوں کے برعکس ان کو کافی مراعات حاصل تھیں۔ اچھی غذا ملتی تھی۔ ان کی مصروفیت کے سامان بہم پہنچائے گئے تھے اور دیکھ بھال کے لیے ڈاکٹروں کی ایک جماعت ہر وقت حاضر رہتی تھی۔ کاینی کے علاوہ ڈیول آئی لینڈ میں رائل اور سینٹ جوزف کے مقامات پر بھی

قیدیوں کو بھیجا جاتا تھا جہاں ان کے مختلف کیمپ بنائے گئے تھے۔ ان کے نام ہی ایسے تھے کہ سُن کر بدن پر کپکپی طاری ہو جاتی تھی۔

مجھے دس سال کی سزا ہوئی تھی، اس لیے مجھے دوسرے درجے کا قیدی سمجھا گیا۔ اس طرح کاینی پر اتارے جانے والے بقیہ اُنسٹھ قیدی بھی دوسرے درجے کے تھے، لیکن ان کے علاوہ باقی سب کو تیسرے درجے کے خطرناک ترین مجرم قرار دے کر رائل کے مقام پر بھیج دیا گیا۔ رائل کے قیدخانے میں مشہور زمانہ قاتلوں اور ڈاکوؤں کو رکھا جاتا تھا۔ یہاں آنے کے بعد بھی ان میں سے کوئی مجرم ہنگامہ پیدا کرتا یا فرار ہونے کی کوشش کرتا تو اسے سینٹ جوزف کے مقام پر منتقل کر دیا جاتا۔ کہتے ہیں کہ اس مقام پر آنے کے بعد بہت کم قیدی تھے جو زندہ بچ کر رائل کے قید خانے میں واپس آ سکتے...... یہاں ایسی سختیاں کی جاتی تھیں کہ بڑے سے بڑا بدمعاش چیں بول جاتا۔ کاینی میں آنے کے چند روز کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ ان جیل خانوں کے علاوہ بھی اور کئی مقامات ایسے ہیں جہاں ''چیدہ چیدہ مجرم'' بھیجے جاتے ہیں۔ مثلاً مورن کا کیمپ...... جسے وہاں ''موت کا کیمپ'' کہا جاتا تھا۔ یہ کیمپ جزیرے کے بہت ہی خطرناک مقام پر بنایا گیا تھا جس کے ایک جانب ہزارہا فٹ گہری دلدل تھی اور دوسرے جانب جنگل میں قسم قسم کے زہریلے سانپوں اور حشرات الارض کی حکومت تھی۔ ان کے علاوہ بڑے بڑے مچھروں کی بستیاں بھی یہیں آباد تھیں جو انسانی خون چوس چوس کر پروان چڑھتے تھے اور ملیریا بخار پھیلاتے تھے۔ ایک مرتبہ جو قیدی اس بخار میں مبتلا ہو جاتا، اس کا زندہ بچنا محال تھا، کیوں کہ علاج معالجے کی سہولتیں صرف محافظوں اور پہرے داروں کو میسر تھیں۔ اسی طرح ایک اور کیمپ تھا جسے ''معجزوں کا کیمپ'' کہا جاتا تھا۔ یہ جگہ اتنی بھیانک اور تکلیف دہ تھی کہ وہاں سے زندہ واپس آنے کو ایک معجزہ ہی خیال کیا جاتا۔ ایسے تمام مجرموں کو جو حادثوں اور مار پیٹ کے باعث اندھے، لُنجے، لنگڑے کوڑھی اور اپاہج ہو جائیں، اسی کیمپ میں بھیج دیا جاتا تھا جہاں وہ چند ہی روز میں ایڑیاں

رگڑ رگڑ کر مر جاتے تھے۔ اسی طرح ان قیدیوں کو بھی جو تپدق، دمے یا بواسیر جیسے لاعلاج امراض میں مبتلا ہو جاتے، مرنے کے لیے یہیں دھکیل دیا جاتا۔

رات کو جب میں اپنی کال کوٹھڑی میں زمین پر بچھے ہوئے ایک کمبل پر سونے کے لیے لیٹتا، تو ان تمام کیمپوں کی تصویریں میری آنکھوں کے آگے رقص کرنے لگتیں۔ میں سوچتا کیا واقعی یہ ممکن ہے کہ انسان اپنے ہی ہم جنسوں پر ایسے مظالم روا رکھے جو اس کی قوت برداشت سے باہر ہوں۔ انسانیت کی اس سے بڑی توہین و تذلیل اور کیا ہو سکتی ہے۔ کبھی کبھی میں اس امر پر خدا کا شکر ادا کرتا کہ میں دوسرے درجے کا قیدی ہوں، ورنہ میرا بھی ایسا ہی حشر ہوتا...... لیکن مجھے معلوم نہ تھا کہ میری یہ خوش فہمی جلد ہی دور ہو جائے گی اور عنقریب وہ وقت آنے والا ہے کہ باری باری ان تمام جہنم زار کیمپوں سے مجھے گزرنا پڑے گا۔

کائینی میں آنے کے دوسرے ہی روز انچارج نے مجھے اپنے پاس بلایا اور کہا:
"تمہارے متعلق کمانڈر کی رپورٹ یہ ہے کہ تم ایک اچھے آدمی ہو۔ اگرچہ تم نے ایک فوجی افسر کو قتل کیا ہے، لیکن رپورٹ میں لکھا ہے کہ یہ واردات اتفاقیہ ہوئی ہے۔ تمہاری نیت اسے قتل کرنے کی نہ تھی۔ اب میں تمہیں تنبیہ کرتا ہوں کہ اگر اس دوران میں تمہارا رویہ اچھا رہا، تو میں بھی تمہاری اچھی سفارش کروں گا، لیکن......" اس نے ایک لحہ توقف کیا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بھاری لہجے میں کہا: "اگر تم نے قواعد کی خلاف ورزی کی، تو نتیجہ اچھا نہ ہوگا...... میں نے تمہارے لیے ہلکا سا کام تجویز کیا ہے...... تم "پبلک ورکس" کے لیے کام کرو گے۔"

"پبلک ورکس" یہ تھا کہ کھجور کی بنی ہوئی ایک موٹی سی جھاڑو میرے ہاتھ میں تھما دی گئی اور حکم دیا گیا کہ کائینی کی اس سڑک کو صاف کیا کروں جو بندرگاہ تک جاتی ہے۔ اس سڑک پر گھوڑا گاڑیوں اور مویشیوں کی آمدورفت کے باعث جگہ جگہ لید بکھری ہوئی تھی اور مجھے اس لید کو صاف کرنا تھا۔ یہی خدمت میرے اور چند ساتھی قیدیوں کو بھی

سونپی گئی اور ہم جھاڑوؤں سمیت چار محافظوں کی معیت میں کائینی کی اس بڑی سڑک پر نکل آئے۔ ہمیں اس سڑک پر چھوڑ کر محافظ دوسری جانب چلے گئے۔ ہم جلدی جلدی جھاڑو دینے لگے۔ چند منٹ بعد میں اپنے ساتھیوں سے علیحدہ ہو کر کافی دور نکل آیا...... یہاں تک کہ سمندر کا گہرا سیاہ پانی جس میں شارک مچھلیاں اچھل رہی تھیں، مجھے دکھائی دینے لگا...... فرار ہونے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ آگے سمندر تھا اور عقب میں گھنا جنگل جہاں قدم قدم پر دلدلی قطعے انسانوں کو نگل لینے کے منتظر تھے۔ اس روز میرے کام کی نگرانی کسی نے نہ کی...... میں ایک سیاح کی حیثیت میں سارے کائینی کا معائنہ کرتا رہا۔ بلاشبہ اس بھیانک مقام کو قدرت نے حسن و جمال کا لازوال خزانہ بخشا تھا۔ مغرب میں اونچی اونچی سرسبز پہاڑیاں دعوت نظارہ دے رہی تھیں۔ ایک جانب کھجوروں کا جھنڈ میلوں تک پھیلا ہوا تھا۔ یہاں سے سمندر کا نظارہ بھی بڑا دل کش تھا۔

کائینی کا قصبہ کچھ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اس میں صرف چند ہی گلیاں لمبی لمبی تھیں جن کے دوطرفہ کھجوروں کے درخت لگے ہوئے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ بعض درختوں کی بلندی اسّی فٹ سے بھی زیادہ تھی۔ یہ مجرموں کی بستی تھی...... یہ لوگ سالہا سال سے یہیں رہتے آئے تھے۔ ان میں سے اکثر ایسے تھے جو یہاں تیس تیس سال سے موجود تھے۔ ان کے چہروں پر گھنی ڈاڑھیاں تھیں اور محنت مشقت کے باعث جسم مضبوط تھے۔ اگرچہ وہ اپنی اپنی سزا کی مدت پوری کر چکے تھے، مگر کائینی سے جانے کی اجازت نہ تھی۔ ان کی نگرانی نہ کی جاتی تھی، البتہ جو کام وہ کرتے تھے، حکومت کی جانب سے اس کا معاوضہ انہیں ادا کیا جاتا تھا۔ اس معاوضے سے وہ اپنا پیٹ پالتے اور چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیوں میں رہتے تھے۔ وہ آپس میں لڑتے جھگڑتے نہ تھے۔ کیونکہ جانتے تھے کہ اگر ایسا ہوا، تو انہیں فوراً دوسرے کیمپوں میں بھیج دیا جائے گا۔ اکثر لوگ جنگل میں لکڑی چیرنے، درخت کاٹنے، پتھر کوٹنے، شہد جمع کرنے اور اسی طرح کے مختلف کام کاج کرتے تھے۔ ان کے علاوہ اپنے نگرانوں، محافظوں اور پہرے داروں کی خدمت

گزاری بھی کرتے۔ ان کی پوری کوشش ہوتی کہ ان لوگوں کو خوش رکھیں۔ ان مجرموں کو ''آزاد قیدی'' کہا جاتا تھا۔

میری ڈیوٹی کے اوقات مقامی وقت کے مطابق صبح نو سے شام چار بجے تک تھے اور کام وہی خاکروب کا...... اس دوران میں میں سڑک پر جھاڑو تو آدھے گھنٹے ہی دیتا تھا، بقیہ وقت آوارہ گردی میں صرف ہوتا تھا۔ مجھ سے کبھی کسی پہرے دار یا افسر نے پوچھ گچھ یا ڈانٹ ڈپٹ نہیں کی۔ اس اعتبار سے میں اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتا تھا۔ شام کو ڈیوٹی سے واپس آ کر انچارج کے پاس کام کی رپورٹ دینا لازمی تھا۔ اس کے بعد ہمیں معاوضے کے طور پر ایک بڑا گلاس شراب کا اور تمباکو سے بھری ہوئی تھیلی عطا کی جاتی۔ شام کو پانچ بجے ہمیں اپنی اپنی کوٹھڑیوں میں چلے جانے اور باہر نہ نکلنے کی سختی سے ہدایت تھی۔ اس جزیرے پر تمباکو دنیا کی وہ نعمت غیر مترقبہ تھی جو چیدہ چیدہ قیدیوں ہی کو عطا کی جاتی تھی۔ میں نے اس عطیے سے خوب فائدہ اٹھایا۔ تمباکو پینے کا عادی نہ تھا، اس لیے اس کو سگریٹوں کی شکل میں تبدیل کر کے دوسرے قیدیوں کے ہاتھ کیلوں، چاول اور شوربے کے عوض فروخت کر دیتا۔ گوشت یہاں عنقا تھا۔ باہر سے بہت کم مقدار میں لایا جاتا۔ چند خوش نصیب قیدیوں کو، جن سے افسر اور گارڈ خوش تھے، ہفتے میں ایک دو بار گوشت کی زیارت ہوجاتی۔ یہ قیدی اس گوشت کو تمباکو کے عوض بیچ دیتے۔ ایک اونس تمباکو کے بدلے گوشت کا ایک بڑا سا اُبلا ہوا ٹکڑا مل جاتا اور ہم اسی کو من وسلویٰ سمجھ کر ندیدوں کی طرح کئی کئی روز چکھتے۔

چند ماہ اسی طرح گزر گئے...... میرے کام سے سبھی مطمئن تھے۔ میں نے آہستہ آہستہ پہرے داروں کو رشوت دے کر راضی کر لیا۔ وہ مجھ پر اب اس حد تک اعتماد کرنے لگے کہ مجھے بندرگاہ پر بھی کام کرنے کی اجازت مل گئی۔ بندرگاہ پر کبھی کبھار اس راہ سے گزرنے والے دوسرے ملکوں کے مسافر جہاز ٹھہرا کرتے۔ میں نے سوچا اگر مجھے کوئی کشتی مل جائے، تو میں جزیرے سے پھل وغیرہ لے کر ان مسافروں کے ہاتھ

معقول قیمت پر فروخت کر سکتا ہوں۔ میں نے چند پہرے داروں سے ذکر کیا۔ وہ کہنے لگے کہ کشتی اس شرط پر مہیا کی جاسکتی ہے کہ آمدنی کے تین حصے انہیں دوں اور ایک حصہ اپنے پاس رکھوں...... میں نے خاکروب کے پیشے سے نجات حاصل کرنے کے لیے فوراً یہ شرط مان لی...... اگلے ہی روز مجھے انہوں نے ایک چھوٹی سی کشتی مہیا کر دی اور میں کیلے، کھجوریں اور دوسرے جنگلی پھل لاد کر بندرگاہ پر رُکے ہوئے جہازوں کی طرف چل پڑا۔ یہ پھل مسافروں نے خوشی خوشی خریدے اور نہ صرف قیمت ادا کی، بلکہ مجھے ''ٹپ'' کے طور پر بھی خاصے پیسے مل گئے۔ چھ ماہ تک میں یہ تجارت کرتا رہا...... اگرچہ آمدنی کا بڑا حصہ پہرے داروں کی نذر ہوجاتا تھا، مگر میں نے بھی چپکے چپکے خاصی معقول رقم پس انداز کر لی۔ اس کے علاوہ پہرے داروں اور محافظوں سے بھی گاڑھی چھننے لگی۔ میں نے فرصت کے اوقات میں ان کے مجسمے بھی بنائے۔ وہ مجھ سے بڑے خوش تھے اور کہتے تھے کہ ڈیول آئی لینڈ کی تاریخ میں مجھ جیسا ''شریف بدمعاش'' اس سے پہلے نہیں آیا۔ انہوں نے مجھے افسرانِ بالا کی لاعلمی میں ایسی رعایتیں دے رکھی تھیں جو دوسرے قیدیوں کو نصیب نہ تھیں۔ مثلاً مجھے ایک علیحدہ کوٹھڑی ملی ہوئی تھی جب کہ دوسری کوٹھڑیوں میں بیک وقت دس دس قیدی رہتے تھے۔ رات کو انہیں ایک مقررہ وقت تک بتی جلانے کی اجازت تھی، مگر میں ساری رات بتی جلا سکتا تھا۔ انہوں نے مجھے کتابیں اور رسالے بھی پڑھنے کے لیے بہم پہنچائے۔ ان تمام رعایتوں کے باوجود اگر میں فرار ہونے کی کوشش کرتا، تو آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ میں کس ہولناک سزا کا مستحق ٹھہرتا، لیکن میں تقدیر کے لکھے کو کس طرح ٹال سکتا تھا؟

ایک روز ایسا اتفاق ہوا کہ بندرگاہ پر کام کرتے ہوئے ایک وزنی میرے بائیں ہاتھ پر آن پڑا۔ ہڈی تو نہیں ٹوٹی، البتہ انگوٹھا کچلا گیا۔ مجھے فوراً مقامی ہسپتال میں لے جایا گیا جہاں زندگی سے بیزار صرف ایک ہی ڈاکٹر قیدیوں کے معمولی علاج معالجے پر مقرر تھا۔ اس نے انگوٹھے کی مرہم پٹی کی اور مجھے ہدایت کی کہ چند روز تک

اس ہاتھ کو آرام دوں...... باتوں باتوں میں جب میں نے اسے بتایا کہ میں ایک پڑھا لکھا آدمی ہوں، تو وہ خوش ہوا اور کہنے لگا: ''میں آج ہی تمہارے بارے میں سفارش کروں گا کہ تمہیں ہسپتال کے اندر اردلی کی حیثیت سے کام کرنے کا موقع دیا جائے۔ یہاں پہلے ہی سے تین پڑھے لکھے قیدی کام کر رہے ہیں، لیکن کام زیادہ ہے۔ اب تم ان کا ہاتھ بٹاؤ گے......'' چند روز بعد اوپر سے حکم آیا کہ مجھے نئے کام پر لگا دیا جائے۔ ہسپتال کی بجائے مجھے اس شعبے میں بھیجا گیا جہاں مجرموں کی انگلیوں کے نشانات کا ریکارڈ رکھا جاتا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جو ہسپتال کی عمارت کے ساتھ ہی واقع تھا۔ یہاں وہی تینوں قیدی اس ریکارڈ کی دیکھ بھال پر مقرر تھے۔

انہوں نے انگلیوں کے نشانات کا تمام ریکارڈ میرے حوالے کیا کہ اسے ترتیب دو۔ یہاں اصول یہ تھا کہ ہر قیدی کے ہاتھوں اور پیروں کی انگلیوں کے نشانات کی تین نقلیں تیار کی جاتی تھیں۔ ایک نقل رائل کے ہیڈ کوارٹر میں، دوسری نقل کائنی میں اور تیسری نقل قیدی کے ساتھ ساتھ جہاں اسے منتقل کیا جاتا، وہیں بھیجی جاتی تھی۔ جب کوئی قیدی مر جاتا، تو اس کی انگلیوں کے نشانات کی تمام نقلیں ''مردہ فائل'' میں جمع کر دی جاتیں اور اس کا نمبر شمار آنے والے نئے قیدی کو دے دیا جاتا۔ ایک ہفتے کے اندر اندر میں نے ''مردہ فائل'' کا اچھی طرح معائنہ کیا۔ اس کے بعد ''زندہ فائل'' کی باری آئی۔ ان نشانات کا بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ اتفاق دیکھیے کہ سب سے پہلے جس شخص کی انگلیوں کے نشانات میرے سامنے آئے، وہ میں خود تھا۔ چند ثانیے تک میں پھٹی پھٹی نظروں سے ان نشانوں کو تکتا رہا۔ دہشت کی ایک نامعلوم سی لہر میرے تن بدن میں دوڑنے لگی۔ سب سے اوپر میرا نام اور نمبر درج تھا اور پھر نشانات کے نیچے سرخ روشنائی سے جلی حروف میں صرف ایک لفظ تحریر تھا جسے دیکھ کر میرا دل بیٹھ گیا۔ ''قاتل''...... اُف...... کتنا بھیانک لفظ تھا...... دفعتہً ایک خیال بجلی کی مانند میرے ذہن کے اُفق پر نمودار ہوا۔ میں نے کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھا...... میں وہاں تنہا تھا...... فوراً ہی میں

نے اس انوکھے خیال کو عملی جامہ پہنا دیا۔ میں نے ایک مردہ قیدی کے نمبروں سے اپنا نمبر تبدیل کر دیا...... اپنی انگلیوں کے نشانات کی تینوں نقلیں ''مردہ فائل'' میں جمع کر دیں اور اس مرے ہوئے قیدی کے نشانات ''زندہ فائل'' میں اپنے نام کے ساتھ چسپاں کر دیئے۔ یہ کام میں نے اس پھرتی سے سرانجام دیا کہ کئی روز مجھے خود حیرت ہوتی رہی کہ آخر وہ کون سی مخفی قوت تھی جس نے مجھے نہ صرف بے مثال تدبیر سجھائی، بلکہ اس کا بہترین موقع بھی فراہم کر دیا...... مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں نے کوئی معرکہ سر کر لیا ہے۔ میں جانتا تھا کہ اگر کوئی قیدی ڈیول آئی لینڈ سے فرار ہو کر جارج ٹاؤن، ٹرینی ڈیڈیا ہوانا چلا جائے، تو وہ پھر بھی انگلیوں کے انہی نشانات کے ذریعے شناخت کر کے گرفتار کیا جا سکتا ہے۔ اگر میں یہاں سے بھاگ نکلوں، تو یہ ظالم مجھے دوبارہ کبھی نہیں پا سکیں گے، لیکن جیسا کہ بعد میں رونما ہونے والے واقعات نے بتایا، یہ محض میری خوش فہمی تھی۔ ڈیول آئی لینڈ والے شیطان اتنی کچی گولیاں کھیلے ہوئے نہیں تھے کہ صرف انگلیوں کے نشانات ہی کے محتاج ہوتے۔ وہ تو ہر قیدی کے جسم پر ایک ایسی مہر لگاتے تھے جو داغ کی شکل میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کے جرم کی گواہی دینے کے لیے تیار رہتی تھی۔

پہرے داروں اور محافظوں کو میری یہ نئی ڈیوٹی پسند نہ تھی، کیونکہ ان کی آمدنی کے بیرونی ذرائع رُک گئے تھے۔ میرا انگوٹھا ٹھیک ہونے کے بعد انہوں نے پھر مجھے وہاں سے تبدیل کروایا اور وہی جھاڑو ہاتھ میں تھما دی...... لیکن اب یہ کام محض افسروں کو دکھانے کے لیے تھا۔ میں اپنی کشتی لے کر حسب معمول بندرگاہ پر پھل بیچنے کا دھندا کرنے لگا۔ ایک روز جو شامت آئی، تو میں پہرے داروں سے ملے بغیر ہی بندرگاہ پر چلا گیا۔ اس روز مجھے معلوم نہ تھا کہ کائنی کی جیل کا منیجر بھی اپنی بیوی کو لینے کیلیے بندرگاہ پر پہنچا ہوا ہے۔ اس کی بیوی اس جہاز سے آ رہی تھی جو مہینے میں ایک مرتبہ فرانس سے ڈاک لے کر آتا تھا۔

مجھے معلوم نہیں تھا کہ منیجر مجھ سے پہلے بندرگاہ پر پہنچ چکا ہے۔ میں اپنی دُھن میں مست کشتی چلاتا ہوا جہاز کے قریب جا پہنچا جس کے عرشے پر بہت سی عورتیں اور مرد کھڑے بندرگاہ کا نظارہ کر رہے تھے۔ دفعۃً اوپر سے اترتی ہوئی ایک عورت کا قدم سیڑھیوں پر سے لڑکھڑایا اور وہ دھڑام سے سمندر میں گر پڑی۔ تماشائیوں کے منہ سے بے اختیار چیخیں نکل گئیں۔ اتفاق دیکھیے کہ وہ عورت میری کشتی کے بالکل سامنے گری۔ میں نے سوچے سمجھے بغیر، انسانی ہمدردی سے مجبور ہوکر، اسے بچانے کے لیے سمندر میں چھلانگ دی...... میں چونکہ تیرنا جانتا تھا، اسے لیے عورت کو بچانے میں مجھے کوئی دقت نہ ہوئی۔ وہ فرطِ خوف سے بے ہوش ہوچکی تھی۔ میں اسے گھسیٹ کر اپنی کشتی تک لے آنے میں کامیاب ہوگیا۔ بندرگاہ پر موجود بہت سے لوگ یہ تماشہ دیکھ رہے تھے اور انہی میں کائنی کے جیل خانے کا منیجر بھی تھا۔ یہ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ جس عورت کو میں نے غرق ہونے سے بچایا وہ اسی بدبخت کی بیوی تھی۔

جب میں اس عورت کو لے کر ساحل پر پہنچا، تو پہلی بار مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ میرا قیدیوں کا سا لباس پانی میں شرابور ہوچکا تھا اور مجھے یقین تھا کہ وہاں کھڑے ہوئے سبھی لوگوں نے مجھے پہچان لیا ہوگا، لیکن یہ اطمینان تھا کہ میں نے ایک عورت کی جان بچائی ہے، اس لیے مجھ سے بازپُرس نہ ہوگی، لیکن میرا یہ خیال خام تھا۔ منیجر نے اپنی بیوی کو ہسپتال پہنچانے کے بعد خشمگیں نظروں سے مجھے گھورا اور کوئی لفظ کہے بغیر دو محافظوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں۔ قصہ مختصر اس جرم میں کہ میں بندرگاہ پر کھلے سمندر میں کشتی چلا رہا تھا۔ تیسرے درجے کا مجرم قرار دے کر رائل بھیج دیئے جانے کا حکم صادر ہوا جہاں مجھے پہلے ایک ماہ تک قید تنہائی کاٹنی تھی۔ اس کے بعد وہاں کے حکام جو سزا میرے لیے مناسب سمجھتے، وہ مجھے بھگتنی تھی۔ لیجیے...... اسے کہتے ہیں گئے تھے نماز بخشوانے اُلٹے روزے گلے پڑے۔ میرے ساتھ ان پہرے داروں اور محافظوں کو بھی وہاں سے تبدیل کر کے کہیں اور بھیجا گیا جنہوں

نے مجھے کشتی مہیا کی تھی۔ اس کے بعد منیجر کے حکم سے کائنی کے جیل خانے کے تمام نظام کی پڑتال کی گئی اور میری طرح بہت سے ایسے قیدیوں کو جو ''ناجائز مراعات'' حاصل کر چکے تھے، رائل بھیج دیا گیا۔

اگلے ہی روز میں نے اپنے آپ کو رائل کے مقام پر پایا جہاں ایک گہرے غار میں، جس کے منہ پر لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں، مجھے ایک ماہ کے لیے بند کر دیا گیا۔ میں نے وہ ایک مہینہ جس ذہنی اور جسمانی عذاب میں کاٹا، اس کے تصور سے آج بھی رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ انسان نے اب تک اپنے ہم جنسوں پر جتنے مظالم ڈھائے ہیں اور کڑی سزاؤں میں مبتلا کیا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ ان میں قید تنہائی کی سزا سب سے زیادہ بھیانک، بلکہ ناقابل برداشت ہے۔ قید تنہائی کا ایک ایک لمحہ میرے اوپر صدیوں کی مانند گزرتا تھا۔ یہ ایک ایسی اذیت تھی جس نے نہ صرف مجھے جسمانی طور پر، بلکہ میری روح تک کو مفلوج کر کے رکھ دیا۔ بعض دفعہ یوں محسوس ہوتا جیسے اس پوری کائنات میں، جس کی نبضیں تھم گئی ہیں اور جہاں وقت رک گیا ہے، میں یکہ و تنہا ہوں۔ سوچنے، سمجھنے کی تمام صلاحیتیں یک قلم معطل ہوچکی تھیں۔ میرے کانوں میں ان تیس دنوں تک کوئی انسانی آواز نہیں آئی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ کب سورج نکلتا اور کب ڈوبتا ہے۔ اس غار میں مجھے روشنی کا احساس ہی نہ رہا۔ ہمیشہ ایک ہی جیسا اندھیرا چھایا رہتا۔ ہاں، خون آشام مچھروں اور ہزارہا زہریلی مکھیوں کی وہ مسلسل بھنبھناہٹ ضرور میرے کانوں میں گونجتی تھی جو اس غار کی گہرائیوں میں قرنہا قرن سے پرورش پا رہے تھے اور جنہوں نے نہ معلوم میرے جیسے کتنے بدنصیب قیدیوں کا خون چوسا تھا۔ ابتدا میں ان کے کاٹنے سے مجھے بے حد تکلیف ہوئی تھی، مگر چند ہی روز میں میرا جسم ایسا سُن ہوگیا کہ درد کا احساس ہی جاتا رہا۔ دن رات میں صرف ایک مرتبہ نمک ملے ہوئے ابلے چاولوں کا تھیلا اور پانی کی بوتل سلاخوں میں سے لٹکا کر میرے پاس پہنچائی جاتی تھی۔ جیسا کہ آپ کو آئندہ معلوم ہوگا' مجھے فرار ہونے کے جرم میں بارہا قید تنہائی یا

کوڑوں کی سزا کا حکم سنایا گیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ پہلے مجھ سے دریافت کر لیا جاتا کہ آیا کوڑے کھانا پسند کرو گے یا قید تنہائی، تو میرا جواب یہی ہوتا:

''جتنے چاہے کوڑے مجھ پر برسالو...... مگر قید تنہائی مجھ سے برداشت نہیں ہوگی۔''

وہ تیس دن یا تیس صدیاں اس اندھیرے غار میں کاٹنے کے بعد جب مجھے وہاں سے نکالا گیا، تو یقین کیجیے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں آج ہی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہوں۔ میری ٹانگیں اور بازو حرکت کرنے سے قاصر اور آنکھیں کھلتی نہ تھیں۔ مجھے بتایا گیا کہ میں اب اپنے آپ کو مستقل طور پر تیسرے درجے کا قیدی سمجھوں اور مجھ سے دس گھنٹے روزانہ سخت مشقت لی جائے گی...... دوسرے روز مجھے ماؤنٹ تابو کی جانب دوسرے قیدیوں کے ساتھ مشقت کے لیے بھیجا گیا۔ ہماری نگرانی کے لیے مسلح محافظوں کی ایک جماعت تھی۔ یہاں ایک اونچے اور نہایت سنگین پہاڑی ٹکڑے کو توڑنے کا کام ہمارے سپرد کیا گیا۔ ہمیں مضبوط بوریاں مہیا کی گئیں جن میں پتھر کے یہ ٹوٹے ہوئے ٹکڑے بھر کر دو میل دور ایک دلدلی قطعے میں پھینکنا تھے۔ ہمیں بتایا گیا کہ مورن لمبر کیمپ کو کائنی سے ملانے کے لیے اس دلدلی قطعے کو پاٹا جا رہا ہے، لیکن آپ یقین کریں...... کہ 35 برس تک ڈیول آئی لینڈ میں رہنے اور سینکڑوں آدمیوں کے کام کرنے کے باوجود اس دلدلی قطعے کو صرف سو گز تک پتھروں سے پاٹا جا سکا۔ ہزاروں ٹن پہاڑی پتھر اس دلدلی قطعے میں ڈالا گیا، مگر اس کی کوئی تھاہ ہی نہیں ملتی تھی۔ یہاں مشقت کرنے والے قیدی سب کے سب ''خطرناک ترین'' تھے اور کام کے دوران میں ان کو آپس میں بات کرنے کی اجازت نہ تھی۔ اگر کوئی قیدی دوسرے سے بات کرتا ہوا پکڑا جاتا، تو اسے کوڑوں کی سزا دی جاتی تھی۔

اس مقام پر قریب ہی دو اور قیدی بھی کام کرتے تھے۔ ان کی گھنی، اُلجھی ہوئی ڈاڑھیوں اور مونچھوں کے بال ایک ہو چکے تھے جنہیں دیکھ کر خوف آتا تھا۔ ان کی آنکھوں سے وحشیانہ پن ٹپکتا تھا۔ ان دونوں سے جانوروں کی طرح مشقت لی جاتی

تھی۔ جب وہ پتھر کوٹتے، تو ان کے پیٹ دھونکنی کی طرح حرکت کرتے اور برہنہ جسم پسینے سے شرابور ہو جاتے تھے۔ مشقت کے باعث وہ نہایت ہٹے کٹے اور پھرتیلے تھے۔ تھکنا تو گویا انہوں نے سیکھا ہی نہ تھا۔ کوڑے کھاتے اور مسلسل کام میں مصروف رہتے۔ مجھے ان کے بارے میں معلوم ہوا کہ سارے ڈیول آئی لینڈ میں انہیں ''شیطان'' کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ کئی بار فرار ہوئے اور پکڑ کر لائے گئے۔ کوئی سخت سے سخت سزا اور ظلم ایسا نہ تھا جو ان پر آزمایا نہ گیا ہو۔ مگر آفرین ہے ان ''شیطانوں'' کی ہمت و استقلال پر کہ موقع ملتے ہی وہ پھر فرار کے منصوبے باندھنے لگتے۔ کوڑوں اور قید تنہائی کی سزائیں ان کے لیے بچوں کا کھیل بن گئی تھیں۔ افسرانِ بالا نے تنگ آ کر انہیں پہاڑ کے اس حصے میں پتھر توڑنے کے کام پر لگایا جسے ''موت کا کنواں'' کہا جاتا تھا اور جس کے بارے میں مشہور تھا کہ بے حیا سے بے حیا قیدی بھی تین سال سے زیادہ یہاں زندہ نہیں رہ سکتا اور خون تھوکتے تھوکتے اگلے جہان سدھار جاتا ہے۔

ایک روز ایسا اتفاق ہوا کہ ہماری نگرانی کرنے والے پہرے دار ذرا دور ہٹ کر گپ شپ میں مصروف تھے۔ یہ دونوں شیطان کام کرتے کرتے میرے قریب آئے اور دزدیدہ نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ کر ان میں سے ایک نے چپکے سے کہا: ''اگر تم بھاگنا چاہتے ہو تو ذرا ہمت کرو...... راستہ ہمیں معلوم ہے...... کیا تم ہمارے ساتھ چلو گے؟'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ممکن ہے وہ کچھ اور کہتے، مگر ایک محافظ نے بھانپ لیا کہ ''شیطانوں'' کی نیت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ بھاگے ہوئے آئے اور کوڑے مار کر انہیں پرے دھکیل دیا۔ دو ہفتے تک پھر ہمیں بات کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ ہر قیدی کو علیحدہ کوٹھڑی میں رات کے وقت پابہ زنجیر رکھا جاتا تھا اور کسی وقت بھی انہیں آپس میں بولنے کی اجازت نہ تھی، لیکن چند ہی دنوں کے اندر اندر میں نے محسوس کر لیا تھا کہ ان لوگوں نے بعض خفیہ اشارے گفتگو کے لیے مقرر کر رکھے ہیں جن کے ذریعے ایک

سرے سے دوسرے سرے تک نگاہوں ہی نگاہوں میں نامہ و پیام جاری ہے۔
''شیطانوں'' کی کوٹھڑیاں سوئے اتفاق سے میری کوٹھڑی سے زیادہ دور نہ تھیں، اس لیے انہوں نے جلد ہی مجھے سمجھا دیا کہ وہ عنقریب بھاگنا چاہتے ہیں اور یہ کہ میں ان کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔ دراصل وہ پوچھنا چاہتے تھے کہ میرے پاس کچھ روپیہ جمع ہے یا نہیں؟ کیونکہ عین ممکن ہے کہ راستے میں ہمیں محافظوں یا دوسرے مددگاروں کو رشوت دینی پڑے...... کیوں کہ ڈیول آئی لینڈ میں رشوت لینا معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا جو قیدی محافظوں اور پہرے داروں کو اپنی محنت کی کمائی میں سے رشوت دیتا، اس سے یہ موذی خوش رہتے اور اسے زیادہ پریشان نہیں کرتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ میرے پاس کچھ رقم محفوظ تھی، مگر میں ان کو بتانا نہیں چاہتا تھا۔ بھلا ان کا کیا بھروسہ...... یہ قاتل قسم کے مجرم محض اس رقم کی خاطر مجھے موقع ملتے ہی موت کے گھاٹ اُتار دیں گے۔

ایک روز دوپہر کا ذکر ہے کہ عجیب اتفاق نے ہمیں وہاں سے بھاگنے کا سنہری موقع فراہم کر دیا۔ ایک قیدی پہاڑی کے نشیبی حصے میں زور زور سے ہتھوڑے چلا رہا تھا۔ اس کے قریب ہی نگرانی کے لیے ایک محافظ موجود تھا اور دوسرے محافظ اِدھر اُدھر ٹہل رہے تھے۔ دونوں شیطان بھی مجھ سے کوئی پچاس گز کے فاصلے پر کام میں تندہی سے مصروف تھے اور کبھی کبھی گردن موڑ کر میری جانب معنی خیز نظروں سے تکنے لگتے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ آہستہ آہستہ میرے قریب ہی آ رہے ہیں۔ یکا یک ایک زور کا دھماکہ ہوا اور نشیبی حصے میں سے چیخوں کی آوازیں سنائی دیں پھر میں نے دیکھا کہ ایک گارڈ چیختا ہوا اس جانب بھاگا۔ اس کے ساتھ دوسرے گارڈ اور محافظ بھی اسی جانب دوڑ پڑے۔ غالباً چٹان کے اندر کوئی مادہ ہتھوڑے کی ضرب پڑنے سے پھٹ گیا ہے۔ ایسے حادثے یہاں اکثر ہوتے تھے جن میں کام کرنے والے قیدیوں کی آنکھ یا ہاتھ پیر ضائع ہو جانا معمولی سی بات تھی، مگر اس مرتبہ ایک گارڈ کو اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔ ایسی افراتفری پڑی کہ الامان...... اس سے پیشتر کہ میں کچھ سوچتا سمجھتا، دونوں شیطان ہاتھوں

میں ہتھوڑے لیے دوڑتے ہوئے میرے پاس آئے اور ایک نے ہانپتے ہوئے کہا:
''جلدی کرو...... اس پہاڑی کے عقب میں دوڑنا شروع کر دو...... خدا کی قسم گزشتہ دس سالوں میں فرار ہونے کا ایسا لاجواب موقع کبھی ہاتھ نہیں آیا...... اب سوچ کیا رہے ہو؟ میں کہتا ہوں اگر تم نے تاخیر کی، تو ساری زندگی پچھتاؤ گے۔ آؤ، اس مرتبہ ہم اس جہنم سے نکل ہی جائیں گے...... پہاڑی کے عقب میں گھنا جنگل ہے...... وہاں کوئی ہمارا تعاقب نہیں کرے گا۔''

پانچ منٹ بعد ہم تینوں نے اپنے آپ کو اس جنگل میں پایا جس کے ایک جانب دلدلی میدان میلوں میں پھیلا ہوا تھا...... ہم نے پھر فضائی فائروں اور خطرے کا الارم بجنے کی آوازیں سنیں۔ یقیناً محافظوں کو ہمارے فرار ہونے کا علم ہو گیا تھا اور تب مجھے ان بلڈ ہاؤنڈ کتوں کا خیال آیا جو پاتال میں سے بھی اپنے شکار کو کھینچ لانے کی بے مثال حس رکھتے تھے۔ ان خونخوار کتوں سے بچنے کے لیے ضروری تھا کہ ہم زیادہ سے زیادہ فاصلہ طے کر کے جنگل کے اندرونی اور نہایت گھنے حصے میں پہنچ جائیں۔ سورج غروب ہونے تک ہم لگاتار دوڑتے رہے۔ کئی مقامات پر ہم دلدل کے اندر دھنستے دھنستے بچے۔ ہر طرف گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ہم نے اندازہ لگایا کہ ہم دس میل دور نکل آئے ہیں۔ ہمارے جسم بے تحاشا دوڑنے کے باعث پسینے سے تر اور تلووں میں آبلے پڑ چکے تھے۔ ہمیں یقین تھا کہ صبح سے پہلے پہلے محافظ دستہ ہماری تلاش میں نکلے گا۔ رات کی اس تاریکی میں ہماری جانیں ہر طرح محفوظ تھیں۔ دریائے کا مٹ مغرب کی جانب نزدیک ہی بہہ رہا تھا، کیوں کہ سرد ہوا کے تیز جھونکے اسی جانب سے آ رہے تھے۔ پہلے شیطان نے زیرِ لب کہا: ''اگر ہم دریا کے کنارے خیریت سے پہنچ جائیں، تو وہاں ہمیں کشتی ضرور مل جائے گی۔ کاش ہمارے پاس کچھ رقم ہوتی......'' تب میں نے انہیں اپنی پھٹی ہوئی پتلون کی اندرونی جیب میں رکھے ہوئے چند نوٹ دکھائے۔ ان کی آنکھیں خوشی سے چمک اُٹھیں...... ''آہ...... میرے دوست...... قسمت ہمارا ساتھ دے

گی...... ہم اب یقیناً یہ رقم کسی کو دے کر نہ صرف کشتی حاصل کر لیں گے، بلکہ کپڑے اور خوردونوش کی اشیا بھی ہمیں مل جائیں گی...... آؤ اب سو جائیں...... کل ہمارے سامنے نئی منزل اور نئی مہم ہوگی۔ خدا ہمیں کامیاب کرے۔''

* * *

صبح کاذب کے دُھندلکے میں ہم تینوں ایک دوسرے کو سہارا دیتے ہوئے مغرب کی طرف بڑھنے لگے۔ ہمیں یقین تھا کہ کیمپ کے مسلح محافظوں کی فوج سراغ رساں کُتوں کو ساتھ لے کر ہمارے تعاقب میں ضرور آئے گی، اس لیے ہم جلد سے جلد دریا کے کنارے پہنچ جانا چاہتے تھے۔ میرے ایک ساتھی نے بتایا کہ دریا کے قریب ان لوگوں کی ایک علیحدہ بستی ہے جو ڈیول آئی لینڈ میں قید کی مدت کاٹ چکے ہیں اور اب ''آزادانہ'' زندگی بسر کرتے ہیں، لیکن ان کی یہ آزادی بھی دراصل ایک نوع کی قید ہی ہے، کیوں کہ یہ لوگ جزیرے سے باہر نہیں جاسکتے، البتہ ان سے بیگار نہیں لی جاتی اور نہ ان کے سپرد کوئی ایسا کام کیا جاتا ہے جسے یہ لوگ کرنا پسند نہ کرتے ہوں۔ ان میں اکثر لوگ عمر رسیدہ اور بوڑھے تھے۔ ڈیول آئی لینڈ کے کیمپوں اور جیلوں سے بھاگے ہوئے بہت سے مجرم دریائے کامٹ کے ساتھ ساتھ پھیلی ہوئی ان بستیوں میں پناہ لیتے تھے۔ مجرموں کو پناہ دینا ڈیول آئی لینڈ پر شاید دنیا کا سب سے بڑا جرم تھا جسے معاف کرنا فرانس کے صدر کے اختیار میں بھی نہ تھا۔ محافظوں اور پہرے داروں کو حکومت کی جانب سے کھلی اجازت تھی کہ وہ بھاگنے والے قیدی کو بے دریغ گولی مار دیں اور جو شخص اسے پناہ دینے یا اس کی مدد کرنے کا قصوروار ہو، اسے بھی اگر چاہیں، تو موت کے گھاٹ اُتار دیں۔ گویا دوسرے الفاظ میں قیدیوں کی موت اور زندگیاں محافظوں کے حوالے کر دی گئی تھیں اور ان بدبختوں سے کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ ان حالات کے باوجود بستی کے یہ ''آزاد قیدی'' مفرور مجرموں کو نہ صرف پناہ دیتے تھے، بلکہ ان کے لیے کشتیوں اور خوراک کا بندوبست بھی کرتے تھے اور اس ''خدمت'' کے عوض وہ سارا روپیہ مجرم سے وصول کر لیتے تھے جو ڈیول آئی لینڈ میں شب و روز کی محنت مشقت کے

بعد بطور اُجرت حکومت کی طرف سے ملتا تھا۔ میرے ساتھیوں کے پاس پھوٹی کوڑی نہ تھی اور وہ کلیتہً میرے محتاج تھے، کیوں کہ انہیں معلوم تھا کہ میری پتلون کی اندرونی جیب میں کئی سو فرانک موجود ہیں۔

ابھی ہم بمشکل ایک میل چلے تھے کہ سامنے جنگل میں کتوں کے بھونکنے کی ہلکی آوازیں آئیں اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے خون میری رگوں میں جمنے لگا ہے۔ میرے ساتھی چند لمحے تک کان لگائے یہ آوازیں سنتے رہے، ان کی آنکھوں میں خوف کے بجائے وحشیانہ چمک نمودار ہوگئی تھی۔ یکا یک ان میں سے ایک نے مجھ سے کہا:

''واپس بھاگو...... وہ ادھر ہی آ رہے ہیں...... وہ یقیناً ایک لمبا چکر کاٹ کر موٹر لانچوں کے ذریعے دریا تک پہنچ گئے ہیں...... کُتے ان کے ساتھ ہیں...... وہ ہمیں گھیرے میں لینے کی کوشش کریں گے...... ہمیں اب ایسی جگہ تلاش کرنی چاہیے جہاں ان کے کُتے نہ آسکیں، ورنہ وہ ہماری بوٹیاں اڑا دیں گے۔''

یہ کہتے ہی ہم تینوں دیوانہ وار اسی راستے پر واپس دوڑنے لگے جدھر سے آئے تھے۔ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آہستہ آہستہ ہمارے قریب آ رہی تھیں اور ہم بدحواسی میں اور تیزی سے دوڑنے لگے۔ ہمارے ہاتھوں میں پتھر توڑنے والے بڑے بڑے ہتھوڑے تھے اور انہی کے ذریعے ہم اپنی حفاظت کر سکتے تھے۔ ان دونوں کو چونکہ فرار ہونے کا ''وسیع تجربہ'' تھا، اس لیے جنگل کے راستوں سے بخوبی واقف تھے اور میں ان کے ساتھ سائے کی طرح لگا ہوا تھا۔ ایک مقام پر پہنچ کر ہم ستانے کے لیے ذرا دیر کے لیے رکے...... ان میں سے ایک نے کہا:

''مغرب کی طرف ہم اب نہیں جاسکتے...... مشرق کی طرف سے بھی خطرہ ہے، کیوں کہ اُدھر کیمپ ہے۔ شمال میں دلدلی میدان ہے، اس لیے اُدھر جانا ہی بے کار ہے۔ اب صرف جنوبی حصہ ہمارے لیے سودمند ہے۔ اگرچہ اس میں بھی نہایت خطرناک دلدلی قطعے ہیں جن کے اوپر گھاس پھوس اُگی ہوئی ہے، اگر احتیاط نہ کی

جائے، تو یہ دلدلی قطعے انسان کو نہایت آسانی سے نگل سکتے ہیں، تاہم ہمیں ادھر ہی جانا ہے، کیوں کہ وہاں ایک پہاڑ کے عقب میں نہایت تاریک اور گہرے غار بنے ہوئے ہیں اور محافظ وہاں اپنے کتوں کو لانے کی کبھی جرأت نہ کریں گے، کیوں کہ کئی مرتبہ اس علاقے میں بہت سے کتے دلدل کا شکار ہو چکے ہیں۔ آؤ اب چلیں۔"

جزیرے کا جنوبی حصہ جسے اس نے "سودمند" بتایا تھا، میری دانست میں سب سے زیادہ خطرناک حصہ وہی تھا۔ یہاں پر چھوٹے بڑے دلدلی قطعے اس کثرت سے پھیلے ہوئے تھے کہ ان کو عبور کرنا ناممکن سی بات تھی۔ میں سوچنے لگا کہ کیا ہم اپنے آپ کو موت کے منہ میں خود ہی نہیں لے جا رہے ہیں۔ عین اسی لمحے ایک اور عجیب خیال میرے ذہن میں آیا۔ غالباً یہ میری چھٹی حس کا کرشمہ تھا جو اب پوری طرح بیدار ہو چکی تھی...... کسی غیبی آواز نے میرے کان میں کہا: "تو ان دونوں سے فوراً الگ ہو جا...... کیوں کہ آگے موت ان کی منتظر ہے......" وہ دونوں تیزی سے آگے دوڑ رہے تھے۔ کبھی کبھی اونچی جھاڑیوں میں سے گزرتے ہوئے وہ میری نظروں سے اوجھل بھی ہو جاتے...... اور پھر پلٹ کر مجھے آواز دیتے...... ایک موقع پر جب کہ وہ مجھ سے کافی دور نکل گئے، میں رکا اور واپس بے تحاشا دوڑنے لگا۔ اپنی اس بروقت مستعدی پر میں بعد میں دیر تک حیران ہوتا رہا کہ آخر وہ کون سی قوت تھی جو مجھ میں اچانک سما گئی تھی اور جس نے میری جان بچا دی...... ڈیول آئی لینڈ میں اتنے برس گزارنے کے بعد میں نے ان دونوں کو دوبارہ کبھی نہیں دیکھا۔ وہ یقیناً کسی گہری دلدل میں دھنس کر اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے ہوں گے۔

اب مجھے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ اپنی جان کس طرح بچاؤں۔ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں ہوا کے دوش پر تیرتی ہوئی کبھی سنائی دیتیں اور کبھی بند ہو جاتیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ محافظ ہماری تلاش میں سرگرمی سے مصروف ہیں اور غالباً ایک لمبا گھیرا ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں، کیوں کہ انہیں معلوم ہو گیا ہو گا کہ تینوں قیدیوں میں سے کوئی بھی

دریا تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہوا۔ میں جس جگہ کھڑا تھا وہاں اونچی اونچی خاردار جھاڑیاں اور گنجان درخت تھے۔ اگر سراغ رساں کتے، محافظوں کے ساتھ نہ ہوتے، تو یہ جگہ چھپنے کے لیے ایسی اچھی تھی کہ قیامت تک وہ مجھے تلاش نہیں کر سکتے تھے۔ میں دیر تک اسی فکر میں غلطاں رہا کہ کیا تدبیر اختیار کروں کہ دفعتہً مجھے بائیں جانب آہٹ سی سنائی دی۔ میں فوراً پیٹ کے بل لیٹ گیا اور غور سے اس طرح دیکھنے لگا۔ غالباً کوئی جنگلی جانور تھا جو مجھ سے پہلے وہاں چھپا ہوا تھا اور اب ڈر کر بھاگ رہا تھا، لیکن چند ہی منٹ بعد میں نے وہاں ایک مسلح سپاہی کو دیکھا جو اپنی بندوق سنبھالے جھاڑیوں کی آڑ میں آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کی پُشت میری جانب تھی۔ میں نے اپنا سانس روک لیا۔ پھر میں نے دیکھا کہ ایک اور محافظ نمودار ہوا۔ ان کے ساتھ کوئی کتا نہیں تھا۔ کتے شاید کسی اور طرف لے جائے گئے ہوں گے۔ وہ مجھ سے کوئی بیس فٹ کے فاصلے پر جا رہے تھے اور خدائے لازوال کی قسم اگر ان کے پاس بندوقیں نہ ہوتیں، تو میں اپنے ہتھوڑے سے ان دونوں کا کام تمام کر دیتا۔ یکایک ایک محافظ نے سیٹی بجائی جس کے جواب میں مغرب کی جانب سے سیٹی کی آواز سنائی دی اور پھر کتوں کے دوڑنے اور بھونکنے کی آوازیں قریب آنے لگیں۔ میں نے خیال کیا تھا کہ یقیناً انہوں نے میرے ساتھیوں کو کہیں چھپا ہوا دیکھ لیا ہے اور واقعی اس کے فوراً بعد ہی پے در پے فائروں کی آوازوں سے جنگل گونج اٹھا...... آہ...... وہ بدنصیب مارے گئے...... میں دہشت سے تھرتھر کانپنے لگا، لیکن میرا یہ خیال تھوڑی دیر بعد ہی غلط ثابت ہو گیا، کیوں کہ یہ فائر انسانوں پر نہیں، جنگلی خرگوشوں پر کیے گئے تھے جن کی اس جنگل میں بڑی کثرت تھی۔ غالباً اپنے کُتوں کو کھلانے کے لیے محافظوں نے یہ خرگوش شکار کیے تھے۔ پھر میں نے بہت سے آدمیوں کے قدموں کی چاپ سنی۔ وہ شاید ایک جگہ جمع ہو رہے تھے۔ ان کے کتے خاموشی سے خرگوشوں کا گوشت ہڑپ کر رہے تھے۔ میں ایک گھنٹے تک انہی جھاڑیوں میں لیٹا رہا۔ مجھ میں اتنی جرأت نہ تھی کہ وہاں سے نکل کر کسی اور جانب چلا جاتا۔ ان

کے باتیں کرنے اور قہقہے لگانے کی آوازیں بھی صاف سنائی دیتی تھیں جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ تعداد میں وہ پندرہ بیس ہیں اور ان کے ساتھ پانچ یا چھ کتے ہیں۔ میرے لیے یہ شگون اچھا تھا کہ کُتوں کے آگے انہوں نے خرگوش کا تازہ تازہ گوشت ڈال دیا تھا اور اب وہ انسانوں کا تعاقب کرنے کی زیادہ کوشش نہیں کریں گے۔ اتنے میں ایک محافظ نے دوسرے سے کہا:

"خدا ہی بہتر جانتا ہے وہ تینوں...... (گالی دے کر) کدھر جا چھپے ہیں۔ ہم نے سبھی جگہ دیکھ لیا...... وہ ہمارے کتوں سے بچ کر کہیں نہیں جاسکتے تھے سوائے ان دلدلوں کے......" اس کے بعد ان دونوں نے ایک قہقہہ لگایا۔ "چلو خس کم جہاں پاک...... ان بدمعاشوں نے ہماری راتوں کی نیندیں حرام کر دی تھیں۔ خدا کی پناہ...... آئے دن اُلّو کے پٹھے فرار ہو جاتے تھے اور مصیبت ہمارے سر آتی تھی...... اب بھی دیکھ لینا ہم میں سے کسی کا تبادلہ ضرور ہوگا۔"

"ان میں جو تیسرا اور نیا تھا، اس کے بارے میں میری رائے ہے کہ آدمی شریف اور محنتی تھا......" ایک محافظ نے یہ میرے بارے میں گوہرافشانی فرمائی...... "وہ کم بخت خود تو مرے ہی تھے، ساتھ اس غریب کو بھی لے مرے...... سنا ہے کہ اس نے کسی فرانسیسی فوجی افسر کو گلا دبا کر مار ڈالا تھا۔"

"چھوڑو یار، جہنم میں جائیں...... مجھے تو ان ڈیڑھ سو فرانک کا افسوس ہے جو تیسرے آدمی کے پاس تھے...... کاش مرنے سے پہلے وہ یہ رقم مجھے ہی دے جاتا......" پہلے نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"بہرحال وہ بچ کر نہیں جاسکتے...... دریا پر کڑی نگرانی کی جارہی ہے، کیوں کہ وہ اسی طرف سے فرار ہو سکتے ہیں۔ بستی کے ہر شخص کو تنبیہہ کر دی گئی ہے کہ اگر کسی نے ان بھگوڑوں کو پناہ دی یا انہیں کسی قسم کی مدد پہنچائی، تو پچاس کوڑوں کی سزا دی جائے گی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ اعلان بھی کیا گیا ہے کہ جو شخص ان مجرموں کو گرفتار کرانے میں پولیس کی مدد کرے گا، اسے ایک سو فرانک بطور انعام دیئے جائیں گے۔"

میں یہ باتیں سنتا اور دل ہی دل میں لرزتا جاتا تھا۔ اگر ان موذیوں نے مجھے ڈھونڈ لیا، تو یہ میرے ساتھ کیسا وحشیانہ سلوک کریں گے۔ کیا پھر مجھے قید تنہائی کی اذیت میں مبتلا کر دیا جائے گا؟ اسی طرح کے مختلف تکلیف دہ احساسات میرے ذہن میں دیر تک ابھرتے اور محو ہوتے رہے۔ میں ایک پتھر کی مانند اپنی جگہ بے حس و حرکت پڑا رہا۔ میری ذرا سی بے احتیاطی سے پیدا ہونے والی آہٹ محافظوں اور ان کے خونخوار کتوں کو خبردار کر سکتی تھی۔ میں صدق دل سے دعائیں مانگنے لگا کہ اے خدا! میں تیرا نہایت گناہ گار اور نافرمان بندہ ہوں...... اس مصیبت میں صرف تو ہی میرا نگہبان اور مددگار ہے، تو خوب جانتا ہے کہ میں نے سارجنٹ تیکورتھ کو دانستہ ہلاک نہیں کیا۔ تجھے یہ بھی علم ہے کہ میں نے ایک عورت کی جان بچائی ہے۔ پس اس مصیبت سے مجھے نجات دلا اور اس شیطانی جزیرے سے نکال جہاں انسانیت منہ چھپائے پھر رہی ہے اور انسان درندوں سے بھی بدتر ہو گیا ہے۔

یہ دعا مانگتے ہوئے نامعلوم کیوں دل بھر آیا اور میرا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ گیا۔ رفتہ رفتہ خود فراموشی اور بے خودی کی ایک عجیب سی کیفیت مجھ پر چھا گئی جس نے مجھے گردوپیش سے قطعی غافل کر دیا۔ آنکھ کھلی، تو شام کے سائے تیزی سے گہرے ہو رہے تھے اور درختوں پر بسیرا کرنے والے پرندے مغرب کی جانب سے سینکڑوں کی تعداد میں آشیانوں کی طرف لوٹ رہے تھے۔ کُتوں اور ان کے محافظوں کی آوازیں سنائی نہ دیتی تھیں جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ جا چکے ہیں۔ اب میں آزادی سے جنگل میں گھوم سکتا تھا۔ میں نے سوچا کہ مجھے اب چند روز تک یہیں چھپے رہنا چاہیے۔ دریا پر جانا اپنے آپ کو موت کے حوالے کرنے کے مترادف ہوگا۔ چند روز بعد جب وہ ہماری طرف سے مایوس ہو جائیں گے، تو نگرانی ختم کر دیں گے، اس کے بعد میں وہاں پہنچنے کی کوشش کروں گا، نتیجہ خدا کے ہاتھ میں ہے۔ یہ سوچ کر میں نے اپنے دل میں کچھ سکون محسوس کیا۔ اب مجھے ایک ایسی جگہ تلاش کرنی تھی جہاں میں آسانی سے چھپ سکوں۔ میں

جھاڑیوں میں سے اس خوف زدہ گیدڑ کی طرح دبے پاؤں نکلا جس کا تعاقب تازی کُتے کر رہے ہوں۔ مجھے شدید بھوک لگ رہی تھی اور کھانے کے لیے وہاں کچھ نہ تھا۔ میں آہستہ آہستہ اس مقام کی طرف چلا جہاں تھوڑی دیر پیشتر محافظوں نے چند خرگوشوں کو ہلاک کر کے اپنے کتوں کے آگے ڈالا تھا۔ وہاں اب بھی ان کا بچا کھچا گوشت اور ہڈیاں بکھری ہوئی تھیں۔

میں دو روز کا بھوکا تھا، اس دوران میں کھیل بھی اڑ کر منہ میں نہ گئی تھی اور اب بھوک برداشت سے باہر ہوتی جا رہی تھی۔ میں دیوانوں کی طرح جنگل میں ادھر سے ادھر مارا مارا پھرنے لگا کہ کہیں جنگلی پھل ہی مل جائیں، مگر یہاں سوائے دلدل اور جھاڑ پھونس کے اور کچھ نہ تھا، البتہ موٹے موٹے چوہے اور ننھے ننھے حشرات الارض بے شمار تھے جو مجھے دیکھتے ہی دلدل میں یا گھاس پھونس کے اندر غائب ہو جاتے۔ میں نے سوچا کہ کتوں کا جھوٹا کچا گوشت ہی کھا لوں جو وہ پیٹ بھر کر بقیہ وہیں چھوڑ گئے تھے۔ آہ...... مجھ پر ایسا کڑا وقت بھی آنا تھا، یہ میں نے کبھی نہ سوچا تھا۔ ایک بار پھر میری آنکھیں تر ہو گئیں۔ یکا یک میں نے بھورے رنگ کے دو خرگوشوں کو دیکھا جو میرے خوف سے ایک جھاڑی کے اندر دبکے بیٹھے تھے۔ میں اگر چاہتا، تو اپنے وزنی ہتھوڑے کے ذریعے ان دونوں کا آسانی سے کام تمام کر سکتا تھا، لیکن مجھے ان پر ترس آ گیا۔ میں نے خرگوشوں سے کہا:

"مت ڈرو میرے دوستو! خواہ میں بھوک کے ہاتھوں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر ہی جاؤں، مگر تمہیں نقصان نہ پہنچاؤں گا۔"

میرے دیکھتے دیکھتے دونوں خرگوش پھدک کر جھاڑی میں سے نکلے اور ایک جانب دوڑنے لگے۔ میں بھی ان کے پیچھے ہولیا۔ سورج غروب ہو رہا تھا اور جنگل میں اندھیرا تیزی سے پھیلنے لگا۔ ایک مقام پر میں نے چند جھاڑیوں کے اوپر جگنو چمکتے دیکھے۔ جب میں قریب گیا، تو ان جھاڑیوں کے اندر بیر کی مانند سرخ سرخ رنگ کے بیضوی پھل لگے

ہوئے تھے۔ میں جلدی جلدی انہیں توڑ کر کھانے لگا۔ ان کا ذائقہ اگرچہ تلخ تھا، مگر سچ پوچھیے تو کام و دہن نے اس روز ان جنگلی بیروں کا ایسا مزہ پایا کہ پھر زندگی بھر ویسا مزہ نصیب نہیں ہوا...... میں نے خوب پیٹ بھر کر یہ بیر کھائے اور آئندہ کے لیے بہت سے بیر پتلون کی جیب میں بھی بھر لیے۔ اب میرے سامنے رات کاٹنے کا مسئلہ درپیش تھا۔ سارے دن کی بھاگ دوڑ اور فاقے نے مجھے بے حد تھکا دیا تھا۔ میں ایک گھنے اور اونچے درخت پر چڑھ گیا اور پتوں میں اپنے آپ کو چھپا لیا۔ درخت کی تین موٹی موٹی شاخوں کے اندر میں اس طرح پھنس کر بیٹھ گیا کہ اگر نیند آ بھی جائے تو میں نیچے نہ گر سکوں۔

ایک ہفتے تک میں اسی جنگل میں چھپا رہا۔ اس دوران میں مَیں نے اس علاقے کا چپہ چپہ چھان مارا اور کئی ایسے مقام دریافت کیے جہاں اگر میں چاہتا تو مہینوں بلکہ برسوں دنیا کی نظروں سے چھپ کر زندگی بسر کر سکتا تھا، لیکن میں تو یہاں سے جلد از جلد نکل جانے کا متمنی تھا۔ میرے شعور کے اندر یہ بات اس طرح جم گئی تھی کہ جب تک میں ڈیول آئی لینڈ پر موجود ہوں، مجھے آزادی کی نعمت سے ہمکنار ہونے کا موقع نہیں ملے گا۔ میں اس دنیا کو دوبارہ کبھی نہیں دیکھ پاؤں گا جہاں میں نے آزادی کا سانس لیا تھا۔ وہ دنیا جہاں میں پیدا ہوا، پلا، بڑھا اور جوان ہوا، جہاں زندگی ہنستی کھیلتی اور رواں دواں ہے۔ میں اسی دنیا میں لوٹ جانا چاہتا ہوں جہاں انسانیت کا راج ہے اور محبت و پیار کی حکمرانی ہے...... میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں آج رات دریائے کامٹ پر پہنچنے کی کوشش کروں گا خواہ میری جان ہی چلی جائے۔

سورج غروب ہونے کے بعد میں نے اپنا ہتھوڑا کندھے پر رکھا اور مغرب کی طرف چلا...... مجھے معلوم تھا کہ دریا کی طرف جانے والا راستہ خطرے سے خالی نہیں۔ اس طرف سانپوں اور دوسرے زہریلے کیڑوں مکوڑوں کی بڑی کثرت تھی۔

میرا خیال تھا کہ دریا تک پہنچنے کے لیے مجھے پانچ یا چھ میل چلنا ہوگا، کیوں کہ

محافظوں کی ایک ہی دن میں آمد اور واپسی سے یہ اندازہ کرنا کچھ دشوار نہ تھا کہ دریا زیادہ دور نہیں۔ ڈیڑھ دو گھنٹے میں میں بمشکل تین میل کا فاصلہ طے کر پایا تھا۔ اس کی بڑی وجہ راستے کی بے پناہ رکاوٹیں تھیں۔ کئی جگہ مجھے سانپ رینگتے ہوئے دکھائی دیئے، مگر میں نڈر ہو کر ان کے درمیان سے گزرتا چلا گیا اور انہوں نے بھی میرا تعاقب کرنے کی کوشش نہ کی، البتہ ایک سیاہ رنگ کے چھوٹے سانپ نے مجھے ڈسنا چاہا تھا، میں نے ہتھوڑے کے ایک ہی وار سے اس کا کام تمام کر دیا۔ مشرق کی طرف سے آہستہ آہستہ چاند آسمان پر بلند ہو رہا تھا اور اس کی زرد روشنی نے جنگل کا اندھیرا دور کر دیا۔ اب میں آسانی سے اپنا سفر جاری رکھ سکتا تھا۔ جلد ہی میں نے ہوا کے جھونکے محسوس کیے جن سے روح اور جسم میں تازگی اور بشاشت کی لہریں دوڑنے لگیں۔ جوں جوں میں دریا کے قریب ہوتا گیا، میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ پھر میں نے ''آزاد قیدیوں'' کی بستی کے آثار دیکھ لیے۔ ان کے کچے اور جھونپڑی نما مکان چاندنی میں بالکل کھلونوں کی مانند دکھائی دے رہے تھے۔ وہاں کوئی متنفس نہ تھا اور یوں معلوم ہوتا تھا جیسے یہ مکان صدیوں سے ویران اور بے آباد پڑے ہیں۔

دفعتہً ایک کتا بھیانک آواز میں بھونکا اور میرے اٹھے ہوئے قدم فوراً رُک گئے۔ یقین کیجیے کہ کُتے کی آواز سن کر ایسی دہشت مجھ پر طاری ہوئی کہ میرے کندھے پر رکھا ہوا ہتھوڑا زمین پر گر گیا...... چند منٹ تک کتا بھونکتا رہا، پھر دور کسی اور کتے نے جواب دیا۔ ایک لمحے کے لیے میں نے محسوس کیا کہ کُتے نے مجھے دیکھ لیا ہے اور وہ اب بھونک بھونک کر دوسروں کو خبردار کر رہا ہے۔ میں پیٹ کے بل زمین پر لیٹ گیا اور کان اس آواز کی طرف لگا دیئے۔ اتنے میں کسی شخص نے کُتے کو ڈانٹا۔ یہ پہلی انسانی آواز تھی جو ایک ہفتے بعد میں نے سُنی۔ اس آواز میں جو شان غرور اور انداز تحکم تھا، اس سے اندازہ کرنا مشکل نہ تھا کہ یہ کسی پہرے دار کی آواز ہے۔ وہ غالباً تنہا ہی تھا، کیوں کہ میں نے آدھ گھنٹے کے انتظار کے باوجود کسی دوسر پہرے دار کی آواز نہیں سنی۔ ایک نئے

حوصلے اور جوش کے ساتھ میں بستی کی طرف بڑھنے لگا......اس اکیلے پہرے دار سے نبٹ لینے کی مجھ میں اچھی صلاحیت تھی۔

کُتا ایک بار پھر بھونکا اور اس مرتبہ اس کی آواز بائیں جانب سے آئی تھی۔ میں پھرتی سے زمین پر لیٹ گیا۔ کتا مسلسل بھونکتا ہوا ادھر اُدھر دوڑ رہا تھا۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ اگر کتا یا پہریدار میرے قریب آیا تو میں بے دھڑک اپنا وزنی ہتھوڑا اس کے سر میں دے ماروں گا۔

چند منٹ بعد میں نے پہرے دار کے بھاری جوتوں کی مانوس آواز سنی۔ غالباً اسے بھی کتے کے لگاتار بھونکنے سے شک ہو گیا تھا کہ کوئی خاص بات ہے۔ پھر میں نے اسے دیکھ لیا۔ وہ اپنی بندوق کندھے پر رکھے ادھر اُدھر دیکھتا بھالتا اسی طرف چلا آ رہا تھا جہاں میں ایک دیوار کی اوٹ میں لیٹا تھا۔ میں نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ میرے سامنے فرار ہونے کا ایک ہی راستہ تھا کہ جدھر سے آیا ہوں اسی طرف لوٹ جاؤں، مگر میں اب ہر قیمت پر دریا پار کرنے کے ارادے سے آیا تھا۔ میں اپنی جگہ تن کر کھڑا ہو گیا اور ہتھوڑا اس انداز میں پکڑ لیا کہ پہرے دار سے آنکھیں چار ہوتے ہی اس کے سینے پر دے ماروں گا......لیکن اس کی تقدیر میں ابھی چند دن اور جینا لکھا تھا، اس لیے وہ آدھے راستے تک آیا اور پلٹ گیا۔ اس نے پھر سیٹی بجا کر کُتے کو اپنے پاس بلایا۔ کتا جو نہایت مضطرب اور بے چین تھا اور بار بار فضا میں منہ اٹھا کر بھونکتا تھا، پہرے دار کی سیٹی سُن کر دوڑتا ہوا آیا اور اس کے پیروں میں لوٹنے لگا۔ یہ سیاہ رنگ کا نہایت گرانڈیل اور وحشی کتا تھا جو اپنے حریف کی بوٹیاں آنِ واحد میں اُڑا سکتا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ پہرے دار کو قابو کرنا شاید آسان ہو، مگر اس کُتے سے مقابلہ کرنا میرے بس کی بات نہیں۔

دریا دو فرلانگ کے فاصلے پر بہہ رہا تھا۔ چاندنی میں اس کا پانی ایک سفید چمک دار لکیر کی مانند دکھائی دے رہا تھا اور مجھے دو فرلانگ کا یہ فاصلہ جان کی بازی لگا کر طے کرنا تھا۔

گیر رہتا ہے۔ اسے پہرے داروں کا بڑا اعتماد حاصل ہے۔ وہ تمہیں اپنے ساتھ کشتی میں بٹھا کر دریا میں دور تک لے جائے گا۔ تم اگر تیرنا جانتے ہو، تو اپنی زندگی ضرور بچا سکو گے۔''

میں نے ان کی ہدایات پر عمل کیا...... پتلون اتار کر نیکر پہن لی۔ ڈاڑھی مونڈ ڈالی۔ اب میرا حلیہ ہی بدل چکا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اب کوئی پہرے دار مجھے شناخت نہیں کر سکے گا۔ نہایت اطمینان سے میں نے ٹوکری اور ہتھوڑا سنبھالا اور جھونپڑی سے باہر نکل گیا۔ سورج نکلنے سے پہلے پہلے میں اس پہاڑی کے قریب پہنچ گیا جہاں میرا نجات دہندہ ماہی گیر رہتا تھا۔ راہ میں کئی پہرے دار اور دوسرے لوگ مجھے گھومتے ہوئے ملے، مگر کسی نے میری طرف توجہ نہ کی۔ وہ مجھے بھی دراصل بستی ہی کا ایک باشندہ سمجھ رہے تھے۔

ماہی گیر ایک لمبے قد اور وسیع تن وتوش کا آدمی تھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی مسکرایا۔ نہ معلوم اُسے کیسے علم ہوگیا تھا کہ میں انہی بوڑھوں کا ایک بھیجا ہوا ہوں۔ ممکن ہے ان لوگوں نے خفیہ اشاروں کا کوئی قاعدہ مقرر کر رکھا ہو۔ میرا خیال تھا کہ ٹوکری سے ماہی گیر نے مجھے شناخت کیا کہ یہ وہ شخص ہے جسے دریا تک لے جانا ہے...... اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ بلکہ اپنا جال اٹھایا اور آگے آگے چل پڑا...... اس کے پیچھے میں فرمانبردار غلاموں کی طرح جا رہا تھا۔ ٹوکری اور ہتھوڑا میں نے اسی کی جھونپڑی میں چھوڑ دیا تھا۔

دریا کے کنارے ایک چھوٹی سی کشتی بندھی تھی جس پر اس نے اپنا جال رکھا۔ پہلے مجھے سوار ہونے کا اشارہ کیا پھر خود بیٹھ گیا اور کشتی آہستہ آہستہ بہاؤ کے رخ بہنے لگی۔ میرے دل میں مسرت کا ایک طوفان اٹھ رہا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے کسی حادثے کے بغیر مجھے دریا تک پہنچانے کا سامان فراہم کر دیا۔
جب ہم دریا میں ایک میل دور نکل آئے تو ماہی گیر نے مجھ سے کہا: ''تم قسمت

کے اچھے ہو جو یہاں سے اپنی جان سلامت لے کر جا رہے ہو، ورنہ یہاں سے بہت کم لوگ زندہ سلامت اپنے وطن پہنچنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ یہ دریا کئی سو میل دور بحرِ اوقیانوس میں جا ملتا ہے۔ اگر تم اس کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ تیرتے رہے، تو کوئی نہ کوئی غیر ملکی جہاز سمندر میں سے تمہیں ضرور نکال لے گا...... جاؤ خدا تمہارا نگہبان ہو......'' اس نے چپو روک کر اپنا دایاں ہاتھ مصافحے کے لیے میری جانب بڑھایا۔ آہ...... اس کے ہاتھ کی گرم جوشی میں کبھی فراموش نہیں کر سکا۔ اس مصافحے میں خلوص اور ہمدردی کا بے پناہ جذبہ کام کر رہا تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور دریا میں چھلانگ لگا دی۔ بپھری ہوئی موجوں نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔ برف کی مانند یخ پانی نے میرا جسم سُن کر دیا، لیکن جلد ہی میں نے ہاتھ پاؤں مار کر اپنے آپ کو بے کار ہونے سے محفوظ کر لیا...... پانی کا بہاؤ بہت تیز تھا۔ اب میں تن تنہا نیلے آسمان کے نیچے دریائے کامٹ کے پُرشور پانی میں بہتا چلا جا رہا تھا۔ کسی نامعلوم منزل کی طرف......

سہ پہر تک میں دریا میں ہی بہتا چلا گیا۔ اس دریا میں شارک مچھلیاں نہیں پائی جاتیں، البتہ دوسری قسم کی ہزارہا چھوٹی مچھلیاں کثرت سے تھیں۔ وہ بعض اوقات میرا تعاقب کرتیں، لیکن جُوں ہی انہیں محسوس ہوتا کہ مجھ میں زندگی کے آثار باقی ہیں، ڈر کر واپس ہو جاتیں۔ دریا کا پاٹ آگے اتنا وسیع ہوگیا تھا کہ اس کے دونوں کناروں پر پھیلا ہوا جنگل اور اس کے اونچے اونچے درخت جھاڑیوں کی مانند دکھائی دینے لگے۔ سورج غروب ہونے سے پہلے میں نے اپنے آگے دریا میں ایک چھوٹا سا جہاز تیرتا ہوا پایا۔ اُسے دیکھتے ہی مجھے خیال آیا کہ شاید یہ فرانسیسی گیانا کا جہاز ہے اور اگر انہوں نے مجھے دیکھ لیا، تو وہ پھر مجھے ڈیول آئی لینڈ لے جائیں گے۔ اپنی ساری کوششوں پر پانی پھرتا ہوا دکھائی دینے لگا۔ میں اگرچہ اس وقت تک بھوک اور تھکن کے باعث قطعاً ناکارہ ہو چکا تھا، لیکن ہمت کر کے میں نے کنارے تک پہنچنے کی سعی کی، مگر پانی کے تیز بہاؤ نے مجھے آناً فاناً جہاز کے قریب پہنچا دیا اور یہ دیکھ کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ جہاز کے مستول پر برٹش گیانا کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔

جہاز کے ملاحوں نے جلد ہی مجھے دیکھ لیا۔انہوں نے فوراً ایک کشتی مجھے لینے کے لیے بھیجی۔خوش قسمتی سے میں ٹوٹی پھوٹی انگریزی بول سکتا تھا۔ میں نے جہاز کے انگریز کپتان کو اپنی درد بھری داستان سنائی۔ مجھے امید تھی کہ وہ ضرور میری مدد کرے گا۔ کپتان نے مجھ سے کہا: ''ہم جارج ٹاؤن جا رہے ہیں۔فرنچ گیانا اور برٹش گیانا کے مابین یہ معاہدہ ہے کہ اگر کسی بھی علاقے کا کوئی مجرم فرار ہوکر غیر حصے میں چلا جائے گا، تو اسے فوراً واپس کر دیا جائے گا، اس لیے ہم تمہاری مدد کرنے سے قاصر ہیں......البتہ اگر تم نے جارج ٹاؤن کے پولیس کپتان کو اپنی داستان سے متاثر کر لیا، تو وہ ضرور تمہاری رہائی کی کوئی راہ نکالے گا۔''

یہ سُن کر میرا دل بیٹھ گیا اور میں اپنی قسمت کو کوستا ہوا جہاز کے عرشے پر لیٹ گیا۔

انگریز ملاحوں نے مجھے پیٹ بھر کر کھانا کھلایا اور تسلیاں دینے کی کوشش کی۔ جہاز کا کپتان ایک بااخلاق اور رحم دل آدمی تھا۔اس نے میری حالت زار دیکھ کر جارج ٹاؤن کے پولیس کپتان کے نام ایک سفارشی خط لکھ کر میرے حوالے کیا اور کہا: ''اب خدا سے دعا کرو کہ وہ پولیس کپتان کے دل میں تمہارے لیے ہمدردی کے جذبات پیدا کر دے۔ یہی ایک صورت تمہارے محفوظ رہنے کی ہے۔''

جارج ٹاؤن پہنچ کر میں پولیس کپتان کے پاس گیا اور جہاز کے ناخدا کا خط اس کے حوالے کیا۔اس نے غور سے خط پڑھا اور پھر مجھ سے تمام واقعات تفصیل سے سنے۔ میں نے بھی جہاں تک ممکن ہو سکا خوب ہی ایکٹنگ کی اور رو رو کر خود پر ڈھائے گئے مظالم کا ذکر کیا۔ وہ خاصا متاثر ہوا، تاہم اس نے بھی اس معاہدے کا ذکر کیا جو ان دونوں حکومتوں کے مابین مجرموں کے تبادلے کے لیے طے پا چکا تھا۔

''ہمیں افسوس ہے مسٹر ہنری کہ آپ کو ڈیول آئی لینڈ جانا پڑے گا......اس میں شک نہیں کہ اگر ہم چاہیں، تو آپ کے یہاں موجود ہونے کی اطلاع انہیں نہ دیں، مگر فرنچ پولیس کے جاسوس یہاں موجود ہیں۔ان کی نظروں سے آپ کبھی محفوظ نہیں رہ

سکتے، تاہم میں آپ کے بارے میں غور کروں گا۔ آپ سردست یہ ایک پونڈ لیجیے اور آپ کو آزادی ہے کہ جارج ٹاؤن میں جہاں جی چاہے جائیے، لیکن اگر آپ نے یہاں سے بھی فرار ہونے کی کوشش کی، تو میں آپ کی کوئی مدد نہ کروں گا۔''

میرے لیے اتنا سہارا ہی کافی تھا۔ میں نے پولیس آفیسر سے وعدہ کیا کہ میں اس کی منشاء کے خلاف کوئی حرکت نہ کروں گا۔

پولیس کپتان نے احتیاطاً میرے ہاتھوں اور پیروں کی انگلیوں کے نشان بھی لیے اور کہا: ''انہیں شناخت کے لیے ڈیول آئی لینڈ بھیجا جائے گا۔ اگر وہاں سے تصدیق ہو گئی کہ یہ نشان تمہارے ہی ہیں، تو پھر ہم تمہیں وہاں بھیجنے پر مجبور ہوں گے۔''

''اور وہاں سے تصدیق نہ ہو تو پھر؟'' میں نے پوچھا۔

پولیس آفیسر حیرت سے میرا منہ تکنے لگا۔'' میں نے سنا ہے کہ وہاں جانے والے ہر مجرم کی اُنگلیوں کے نشانات کا ریکارڈ محفوظ رکھا جاتا ہے۔ اگر تم وہاں رہ چکے ہو، تو تمہاری انگلیوں کے نشان بھی ان کے پاس ہوں گے۔ بہرحال مجھے تم سے کوئی ذاتی عناد تو نہیں۔ یہ بات تو تمہارے حق میں بہت ہی فائدہ مند ثابت ہوگی۔ اگر ڈیول آئی لینڈ کے حکام کے پاس تمہاری انگلیوں کے نشانات محفوظ نہ ہوں، پھر تمہیں دنیا کی کوئی طاقت وہاں نہیں لے جا سکتی۔''

اس زمانے میں برٹش گیانا ترقی کی ابتدائی منازل طے کر رہا تھا۔ یہاں چاول، گنے اور ربڑ کی بڑی پیداوار تھی۔ افریقہ، چین اور ہندوستان کے بہت سے مزدور یہاں کام کرتے تھے اور پھر بھی مقامی حکام کو شکایت تھی کہ مزدور نہیں ملتے۔ میں چوں کہ ایک زرعی کالج کا گریجویٹ تھا، اس لیے مجھے جارج ٹاؤن کی ایک ربڑ کمپنی میں ملازمت مل گئی۔ اس کمپنی کا کاروبار برٹش گیانا کے علاوہ ڈچ گیانا میں بھی پھیلا ہوا تھا۔

دو ماہ کے عرصے میں میں نے جس تندہی اور ایمانداری سے اپنے فرائض ادا کیے، اس نے کمپنی کے مالکان پر اچھا اثر ڈالا اور انہوں نے مجھے سپروائزر بنا دیا۔ اس

دوران میں پولیس کپتان نے مجھے یہ خوش خبری بھی سنائی کہ میری انگلیوں کے نشانات کی تصدیق ڈیول آئی لینڈ سے نہیں ہوسکی، اس لیے میں اپنے آپ کو آزاد سمجھوں..... آپ میری بے پناہ مسرت کا اندازہ نہیں کر سکتے جو یہ خبر سن کر میں نے اپنے دل میں محسوس کی۔ اس روز میں نے صحیح معنوں میں اپنے آپ کو ذہنی طور پر آزاد پایا۔ میرا سر بارگاہ خداوندی میں جھک گیا اور تشکر کے آنسوؤں نے سارے دکھ دھو ڈالے۔

برٹش گیانا کی اس ربڑ کمپنی میں ملازمت کا جو زمانہ میں نے گزارا، وہ شاید میری طویل زندگی کا سب سے شاندار اور آرام دہ زمانہ تھا۔ میری تنخواہ معقول تھی، رہنے کے لیے نہایت خوب صورت مکان میسر تھا، کام کاج کرنے کے لیے نوکر چاکر تھے اور دنیا بھر کی نعمتیں مجھے میسر تھیں۔ کمپنی کے مالکان کا رویہ میرے ساتھ مشفقانہ بلکہ انتہائی دوستانہ تھا۔ کمپنی کی ملکیت میں ربڑ کے ہزارہا درخت تھے جن کی نگرانی کے لیے اکثر مجھے ڈچ گیانا کا سفر بھی اختیار کرنا پڑتا تھا۔ ہندوستانی، افریقی اور چینی مزدوروں کے ساتھ رہ کر میں ان کی زبانیں بھی بولنا سیکھ گیا۔

چار سال بیت گئے اور میں آہستہ آہستہ اپنی گزشتہ زندگی کے اندوہناک حادثات بھولتا گیا، لیکن ایک روز اچانک ایک ایسا حادثہ پیش آیا جس نے مجھے پھر اسی راہ پر لا کر ڈال دیا جس راہ سے میں چار سال پیشتر جان بچا کر فرار ہوا تھا۔

کمپنی کا دفتر نکیری کے مقام پر تھا جس کے ساتھ ڈچ گیانا کی سرحدیں ملتی تھیں۔ دریائے کارنٹائن کے کنارے میلوں میں پھیلے ہوئے ربڑ کے درختوں کی دیکھ بھال اور حفاظت کے لیے انہی دنوں میری نگرانی میں خاص عملہ مقرر کیا گیا تھا۔ میں شب و روز وہیں رہتا۔ انہی دنوں برٹش گیانا میں ایک شخص بوائے پیل رابرٹ کے کارناموں کی بڑی دھوم مچی ہوئی تھی۔ یہ شخص پیشہ ور قاتل تھا اور ایک درجن بے گناہ لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار چکا تھا۔ بڑی مشکل سے پولیس نے اسے گرفتار کیا، مقدمہ چلا اور

عدالت نے پھانسی کی سزا کا حکم سنایا، لیکن سزا کے نفاذ سے چند روز پیشتر یہ دیوانہ قاتل جیل سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا اور گھنے جنگلوں میں روپوش ہوگیا۔ اس کے یوں فرار ہونے پر پورے برٹش گیانا میں دہشت کی ایک لہر دوڑ گئی، کیوں کہ فوراً ہی قتل کی وارداتیں شروع ہوگئیں..... بوائے پیل کو جس شخص پر ذرا سا بھی شبہ ہوتا کہ وہ اُسے گرفتار کرا دے گا، وہ اس پر فائر کر کے اسے موت کے منہ میں پہنچا دیتا۔ نہ معلوم اس نے کہاں سے ایک پستول حاصل کر لیا تھا۔

آخر میں یہ افواہ سنی گئی کہ وہ نکیری کی طرف بھاگ گیا ہے۔ سارے مزدوروں اور قلیوں کو پہلے ہی پولیس نے خبردار کر دیا تھا۔ اب اتفاق دیکھیے کہ اس کا اور میرا سب سے پہلے آمنا سامنا ہوا۔ دوپہر کا وقت تھا، میں درختوں کا معائنہ کر رہا تھا کہ یکایک ایک جانب سے فائر ہوا اور گولی میرے سر سے چند انچ اوپر درخت کے تنے میں پیوست ہوگئی۔ جس مقام سے فائر کیا گیا، وہاں پر قد آدم پودے اُگے ہوئے تھے اور پستول کا دھواں ان کے اوپر اٹھ رہا تھا۔ میں نے جلدی سے اپنا پستول نکالا اور اس طرف اندازے سے نشانہ لے کر فائر جھونک دیا۔ ایک انسانی چیخ کی آواز فضا میں بلند ہوئی۔ اتنی دیر میں بہت سے مزدور موقع پر پہنچ گئے اور اس مقام کو گھیرے میں لے لیا۔ گولی بوائے پیل کے کندھے میں لگی تھی اور وہ وہاں اوندھے منہ بے ہوش پڑا تھا۔ پولیس آئی اور بوائے پیل کو گرفتار کر کے لے گئی۔ یہ شخص دراصل ڈچ گیانا سے بھاگا ہوا قاتل تھا اور اس نے برٹش گیانا میں بھی قتل کی وارداتیں کی تھیں، اس لیے دونوں حکومتیں اسے پھانسی کے تختے پر دیکھنے کی خواہش مند تھیں۔ مقدمہ دوبارہ چلا، تو مجھے بھی گواہی کے لیے بلایا گیا اور اب پہلی مرتبہ مجھے احساس ہوا کہ میری ''شخصیت'' کا پول بھی کھلنے والا ہے۔

مقدمے میں برٹش گیانا کے ساتھ ولندیزی گیانا کے وکلاء بھی شریک تھے۔ ہائی کورٹ میں جب پولیس نے مجھے گواہ کی حیثیت سے پیش کیا، تو پہلے ہی روز عدالت

نے مجھ سے میرا پاسپورٹ طلب کیا۔ میرے ہاتھوں کے طوطے تو پہلے ہی اڑے ہوئے، پاسپورٹ دکھانے کے حکم پر رہی سہی جان بھی نکل گئی۔ اب بتایئے سوائے اوٹ پٹانگ تاویلات کے میں کیا کرتا؟ اس پر بوائے پیل کے ساتھ ساتھ مجھے بھی ڈیول آئی لینڈ سے بھاگا ہوا مجرم فرض کرلیا گیا۔ برٹش گیانا کے حکام اس صورت حال سے سخت بدحواس تھے، کیونکہ یہ ان کی حکومت کی انتہائی بدنامی کا معاملہ تھا کہ ایک حلیف ملک کا مجرم عرصہ دراز تک برٹش گیانا میں پناہ لے رہا ہے۔ شہر کی پولیس کا کپتان عدالت میں پیش ہوا اور اس کم بخت نے میرا سارا قصہ عدالت میں بیان کر دیا۔ اسی وقت میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دی گئیں اور ڈیول آئی لینڈ کے منیجر جیل خانہ کو تار بھیجا گیا کہ اس حلیے کا ایک شخص پکڑا گیا ہے، براہ کرم اس کی شناخت کیجیے۔ میری انگلیوں کے نشانات کی ایک نقل بھی وہاں روانہ کی گئی۔ جواب آیا کہ اگرچہ اس مجرم کی انگلیوں کے نشانات کا کوئی ریکارڈ ڈیول آئی لینڈ کے کسی کیمپ میں نہیں، لیکن اس شخص کو حکومت فرانس کے خرچ پر فوراً ڈیول آئی لینڈ شناخت کے لیے بھیجا جائے۔ اگر یہ شخص ''بے گناہ'' ثابت ہوا تو اسے برٹش گیانا واپس بھیج دیا جائے گا اور حکومت ہر قسم کا ہرجانہ بھی ادا کرے گی۔

نیکیری سے مجھے پہلے سینٹ لارنٹ اور وہاں سے کائینی بھیجا گیا۔ میں اپنے دل میں سخت مایوس تھا اور یہ سوچ سوچ کر ہراساں تھا کہ دیکھیے میرے لیے وہاں کیا سزا تجویز کی جاتی ہے۔ جہاز سے اترتے ہی جوں ہی میں نے کائینی کی سرزمین پر قدم رکھا، سامنے سے ہسپتال کا ایک اردلی آتا دکھائی دیا۔ اگرچہ میں اس وقت صاف ستھرے کپڑے پہنے تھا اور ڈاڑھی مونچھ صاف تھی، لیکن ظالم نے پہلی نظر ہی میں مجھے پہچان لیا اور چلّا کر بولا:

''آہا ہنری صاحب ہیں...... آیئے...... آیئے...... بہت دن بعد زیارت ہوئی۔''

میں نے غصے اور نفرت سے منہ پھیر لیا۔ ظالم کو دل لگی کا اچھا موقع ہاتھ آیا تھا۔

مجھے منیجر کے کمرے میں لے جایا گیا جس نے غیظ آلود نظروں سے مجھے سرتاپا گھور کر دیکھا، پھر اردلی کو حکم دیا کہ مجھے ریکارڈ آفس میں لے جائے۔ وہاں دوبارہ میری انگلیوں کے نشانات کی کئی نقلیں تیار کی گئیں۔ اس کے بعد مجھے ایک اندھیری کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا۔ ایک دن اور ایک رات میں بھوکا پیاسا وہاں بند رہا۔ اگلے روز مجھے رائل بھیجا گیا اور جب میں نے سنا کہ ساٹھ دن کی قید تنہائی کی سزا بھگتنی پڑے گی، تو یوں سمجھیے کہ دنیا میری نظروں میں تاریک ہوگئی۔ میں نے ان ظالموں کی بہت منت سماجت کی کہ قید تنہائی کی بجائے مجھ پر کوڑے برسالو، مگر کسی نے ایک نہ سنی اور ایک بار پھر مجھے اسی منحوس اندھیرے غار میں دھکیل دیا گیا جہاں چار سال قبل مجھے ایک ماہ تک ذہنی اور جسمانی عذاب برداشت کرنا پڑا تھا۔ آج جب کہ میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں، اس سزا کو بھگتے ہوئے چالیس برس ہو چکے ہیں، مگر مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں اب بھی اس غار میں تنہا بے جان لاش کی مانند پڑا ہوں...... میں وہاں مادر زاد برہنہ تھا۔ میرے جسم پر انہوں نے کوئی چیتھڑا باقی نہیں رہنے دیا۔ شاید وہ اس غار میں پلے ہوئے مچھروں اور پسوؤں کو موقع دینا چاہتے تھے کہ جی بھر کر کسی مزاحمت کے بغیر میرا خون چوستے رہیں، کیوں کہ برٹش گیانا میں بے فکری کے چار سال بسر کرنے سے میری صحت بہت اچھی ہوگئی تھی۔

دو ماہ بعد جب مجھے غار سے باہر نکالا گیا، تو مجھے یہ بھی یاد نہ تھا کہ میرا نام کیا ہے اور میں کہاں ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ میرا ذہن اور قوت حافظہ بالکل جواب دے گئی تھی۔ میرے جسم پر چھوٹے بڑے سینکڑوں سرخ رنگ کے دھبے پڑے ہوئے تھے اور پسلیوں کی ہڈیاں نمایاں ہوگئی تھیں۔ داڑھی مونچھوں کے بال پھر پہلے کی طرح خوب بڑھ گئے تھے اور ان میں جوئیں بھی تھیں۔

اس کے بعد انہوں نے مجھے پہننے کے لیے صرف ایک پتلون مہیا کی، ایک ہفتے آرام کا موقع دیا اور آٹھویں روز مجھے رائل کے چھوٹے سے ہسپتال میں لے جایا گیا

جسے مذبح کہنا زیادہ صحیح ہوگا، کیوں کہ وہاں جس وحشیانہ طریقے سے مریض قیدیوں کا علاج کیا جاتا تھا، وہ طریقہ انسانیت کے لیے سراسر باعث شرم تھا۔ مجھے یہاں پیٹ کے بل ایک لمبی میز پر لٹا دیا گیا اور میرے ہاتھ پیر ریشمی ڈوری سے کس کر باندھ دیئے گئے تاکہ میں ہلکی سی جُنبش بھی نہ کرسکوں۔ دو گھنٹے تک میں اسی طرح بندھا پڑا رہا حتیٰ کہ میرا جسم سُن ہوگیا۔ میں اتنا جان چکا تھا کہ کوئی بہت ہی سنگین سزا میرے لیے تجویز کی گئی ہے اور وہ سزا یہ تھی کہ ایک مربع مہر کو آگ کے اندر سرخ کرکے میرے بائیں شانے پر داغ دیا گیا۔

اب میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ڈیول آئی لینڈ کا مہر شدہ قیدی تھا۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھیے کہ میرے لیے اب یہاں سے فرار ہوکر کہیں اور جا کر باعزت زندگی بسر کرنا ناممکن بنا دیا گیا۔ اب ہر شخص میری پشت پر سے کپڑا اٹھا کر یہ تصدیق کرسکتا تھا کہ میں ڈیول آئی لینڈ کا قیدی ہوں۔ بعدازاں مجھے بتایا گیا کہ یہاں بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کے جسموں پر دس دس اور پندرہ پندرہ مہریں لگی ہوئی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو مجرم جتنی مرتبہ فرار ہوگا اور یہاں لایا جائے گا، اسی حساب سے اس کے جسم پر مہروں کا اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔

لیکن آئندہ پچیس سال کے دوران میں سارے ڈیول آئی لینڈ پر میں واحد شخص تھا جس کے جسم پر پندرہ مہریں لگ چکی تھیں...... جی ہاں پندرہ گہرے داغ جن سے میری پشت، گردن کی ہڈی سے لے کر نچلے حصے تک اچھی طرح جل کر سیاہ ہوچکی تھی...... اب فرار ہونا اور گرفتار ہوکر ڈیول آئی لینڈ میں لایا جانا میرا خاص مشغلہ بن چکا تھا۔ میرے محافظ مجھے جس قدر اذیتیں پہنچاتے رہے، اسی قدر میرا ذوق گناہ بڑھتا گیا، حتیٰ کہ مجھے اس کیمپ میں بھیج دیا گیا جسے معجزوں کا کیمپ کہا جاتا ہے اور جس کے بارے میں مشہور تھا کہ یہاں کسی مجرم کی جان کوئی معجزہ ہی بچا سکتا ہے۔ معجزوں کا کیمپ ڈیول آئی لینڈ کا سب سے بدترین اور مہلک علاقہ تھا جہاں اندھے، لنگڑے، کوڑھی، دق اور سل کے

مریض اور اسی طرح کی دوسری چھوت سے پھیلنے والی بیماریوں میں مبتلا مجرم رکھے جاتے تھے۔ یہاں ان کا کوئی پُرسان حال نہ تھا۔ میرے ذمے یہاں جو کام لگایا گیا وہ ان معذوروں اور محتاجوں کی "خدمت" کرنے کا تھا یعنی ان کی غلاظت اور گندگی صاف کرنا اور مرہم پٹی وغیرہ کے جملہ فرائض...... رائل کے ہسپتال میں میں ڈاکٹر کے ساتھ ایک اردلی کی حیثیت سے کافی وقت گزار چکا تھا، اس لیے مجھے "ڈاکٹر" بنا کر معجزوں کے کیمپ میں تعینات کردیا گیا۔ مقصد یہ تھا کہ ان مریضوں کی دیکھ بھال کے دوران کوئی نہ کوئی بیماری مجھے آن دبوچے گی اور میرا قصہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پاک ہوجائے گا، مگر انہیں شاید علم نہ تھا کہ میری زندگی بڑی بے حیا ہے اور موت اس کا سامنا کرتے ہوئے کتراتی ہے۔

اس وسیع وعریض جزیرے میں اب میں شیطان کی طرح بدنام ہوچکا تھا۔ ہر ادنیٰ واعلیٰ مجھے خوب پہچانتا تھا۔ یہاں تک کہ برٹش گیانا، ڈچ گیانا اور ٹیرینی ڈیڈ تک ہر شخص کی زبان پر میرا ذکر تھا۔ گارڈوں اور محافظوں نے رفتہ رفتہ مجھے ستانا چھوڑ دیا۔ غالباً غیر شعوری طور پر وہ مجھ سے خوف زدہ تھے۔ ان کے خیال میں میرے اندر کوئی بدروح سما گئی تھی جو تمام آفات و مصائب کا مقابلہ کرتی تھی۔ خود میرا حلیہ بھی ایسا ہی تھا کہ معمولی دل گردے کا آدمی دیکھتا، تو یقیناً غش کھا جاتا۔ ہر قسم کی جسمانی اور ذہنی سختیاں اور عذاب جھیل جھیل کر میں اب اتنا پختہ ہوچکا تھا کہ کوڑوں اور آگ میں سرخ کی گئی آہنی مہروں کے داغ بھی بے اثر ہوگئے تھے۔ انہوں نے مہینوں تک میرے ہاتھوں اور پیروں میں بیڑیاں ڈالے رکھیں جو میرے جسم ہی کا ایک حصہ بن گئیں، مگر میرا جذبہ آزادی جو واقعی ایک جنون کی شکل اختیار کرگیا تھا، فنا نہ ہوسکا۔

اب میں آپ کو اپنے آخری فرار کا قصہ سنا کر رخصت ہوتا ہوں۔

معجزوں کے کیمپ میں ان دنوں دو ہزار کے لگ بھگ بدنصیب قیدی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر موت کے منتظر تھے۔ انہی دنوں وہاں شدید قسم کا وبائی بخار پھیلا اور روزانہ دس

پندرہ قیدی مرنے لگے۔ ان کی لاشوں کو ایک بیل گاڑی کے اوپر لاد کر سینٹ جوزف کے مقام پر پہنچایا جاتا جہاں رسمی کاروائی کے بعد انہیں ایک ہی گڑھے میں دبا دیا جاتا۔ کیمپ میں ایک ''مردہ خانہ'' بنایا گیا جہاں مرنے والوں کی لاشیں اوپر تلے پھینک دی جاتی تھیں۔ ایک روز یہاں سے نکل بھاگنے کی عجیب تدبیر میرے ذہن میں آئی......مردہ خانے سے لاشیں لے جانے کا کام مسلح گارڈوں کی نگرانی میں رات کے وقت سرانجام پاتا تھا۔ چوں کہ مُردے فرار ہونے کی قدرت نہیں رکھتے، اس لیے مردہ خانے کا دروازہ بند کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی جاتی تھی۔ میں نے ایک کوڑھی قیدی کو جس کا نام جین پال تھا، اس سازش میں شریک کرلیا۔ وہ بہت اچھا آدمی تھا اور میں اکثر اس سے گپ شپ لڑایا کرتا۔ میں نے اس سے کہا: ''رات کے وقت میں مردہ خانے میں جا کر اس بڑے تختے پر لیٹ جاؤں گا جس پر لاشیں پھینکی جاتی ہیں۔ تم ایسا کرنا کہ میرے اوپر دو آدمیوں کی لاشیں اس طرح ڈال دینا کہ میرا جسم ان کے نیچے چھپ جائے۔''

گاڑی آنے سے آدھ گھنٹہ پہلے ہم دونوں مردہ خانے میں گئے۔ وہاں تین بڑے بڑے تختوں پر پندرہ لاشیں پڑی تھیں۔ میں نے اور جین نے مل کر ایک تختے کی لاشیں اٹھائیں، پھر میں اس تختے پر اُوندھے منہ لیٹ گیا اور جین نے بقیہ چار لاشیں گھسیٹ کر میرے اوپر ڈال دیں اور مردہ خانے سے رخصت ہوگیا۔ خدا کی پناہ!......وہ آدھا گھنٹہ مجھ پر جس ناقابل برداشت عذاب کی صورت میں گزرا ہے اسے بس میرا ہی دل جانتا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میں بھی انہی لاشوں میں سے ایک لاش ہوں۔ جس کے جسم سے تعفن اور سڑاند کے بھبکے اٹھ رہے ہیں۔ آخر مردہ خانے کے باہر میں نے گاڑی کے پہیوں کی آواز سنی۔ پیروں کی آہٹ سے اندازہ ہوا کہ مسلح پہرے دار ایک ہی ہے جس کے ساتھ گاڑی بان تھا۔ پہرے دار نے نفرت آمیز لہجے میں کہا:

''آج تو ان کم بختوں نے مردہ خانے میں ذرا بھی خالی جگہ نہ چھوڑی۔ سبھی کو

آج مرنا تھا......چلو باہر سے کچھ لوگوں کو پکڑ لاؤ تاکہ یہ تختے اٹھا کر گاڑی پر رکھیں۔''

گاڑی بان دوڑتا ہوا باہر گیا اور چند قیدیوں کو بلا لایا۔ میں دل ہی دل میں خدا سے دعائیں مانگ رہا تھا کہ وہ میرا تختہ سب سے پہلے اٹھائیں۔ میں نے چپکے سے ایک آنکھ کھولی تو سب سے آگے جین پال تھا۔ اس کے پیچھے چار قیدی اور تھے۔ جین پال نے سب کو اشارہ کیا اور انہوں نے آگے بڑھ کر وہ تختہ اٹھا لیا جس پر مجھ زندہ سمیت چار لاشیں پڑی تھیں۔ یہ تختہ لے جا کر انہوں نے گاڑی پر رکھ دیا۔ پھر وہ مردہ خانے میں گئے اور دوسرا تختہ اٹھا لائے۔

''بس اب یہاں سے چل دو۔'' پہرے دار نے گاڑی بان کو حکم دیا۔

وہ رات تاریک تھی اور مردہ گاڑی سنسان جنگل کی ایک تنگ پگ ڈنڈی سے گزرتی ہوئی سینٹ جوزف کی طرف بڑھنے لگی۔ رائل کے قریب پہنچ کر میں نے ان دونوں کو خوف زدہ کرنے کے لیے حلق سے ایک ڈراؤنی آواز نکالی۔ گاڑی بان نے جو میری ہی طرح ایک قیدی تھا، فوراً گاڑی روک لی اور مسلح گارڈ سے کہا: ''آپ نے یہ آواز سُنی؟'' گارڈ نے بھی اپنا گھوڑا روکا اور گاڑی کے قریب آ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان بے وقوفوں میں سے ایک آدھ ابھی زندہ ہے۔'' اس نے گاڑی بان سے کہا۔ ''چلو جی، تم گاڑی بڑھاؤ......ان آوازوں کی پروا نہ کرو۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔ رائل چل کر دیکھیں گے کہ یہ آوازیں کون نکال رہا تھا۔''

بس یہی موقع تھا کہ میں نے پہلے سے بھی زیادہ بھرائی ہوئی آواز میں کہا: ''ٹھہرو......ذرا میری ایک بات سُن لو۔'' اس کے ساتھ ہی اچھل کر میں تختے سے نیچے کودا اور اس سے پیشتر کہ گارڈ اپنی بندوق مجھ پر چلائے، میں نے پوری قوت سے ایک گھونسہ اس کے پیٹ میں اور فوراً ہی دوسرا ٹھوڑی پر مارا۔ وہ الٹ کر پیچھے گر گیا۔ اس کے بعد تو مجھ پر جیسے جنون کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ گھونسے مار مار کر میں نے اسے بے ہوش کر دیا......گاڑی بان دور کھڑا یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے آواز دی:

"ادھر آؤ گدھے...... اسے جلدی سے اٹھا کر وہاں پرے جھاڑیوں کے پیچھے ڈال دو۔ دیکھو میں آج رات پھر یہاں سے بھاگ رہا ہوں اور اس ارادے سے کہ دوبارہ زندہ یہاں نہ آؤں گا۔ تم میرے ساتھ جانا چاہتے ہو تو بولو۔"

"میں تمہارے ساتھ چلوں گا...... یہاں کی زندگی سے موت بہتر ہے۔" وہ بولا اور پھر ہم دونوں نے گارڈ کو اٹھایا اور دور جھاڑیوں میں جا کر ڈال دیا۔ اس کی بندوق اور کارتوسوں کی پیٹی میں نے اپنے قبضے میں کی۔ اس کی وردی بھی اتار لی، شاید دوسرے گارڈوں کو دھوکہ دینے کے لیے اس کی ضرورت پڑ ہی جائے۔ گارڈ کی جیبوں میں سے تمباکو کی تھیلی، ایک چھوٹا اُسترا، کنگھا اور سو فرانک کے نوٹ برآمد ہوئے۔

"بہتر یہ ہے کہ اس بدمعاش کو کسی رسّی سے اچھی طرح باندھ دیا جائے۔" گاڑی بان نے رائے دی۔ "ورنہ ابھی یہ ہوش میں آ کر دہائی دیتا ہوا رائل آ جائے گا اور وہ ہماری تلاش میں نکل کھڑے ہوں گے۔"

"بات تو ٹھیک ہے، لیکن ہمارے پاس اس وقت کوئی ایسی چیز نہیں جس سے اس کے ہاتھ پَیر باندھے جا سکیں۔"

"میری گاڑی کے ساتھ ایک رسّی بندھی ہے۔" وہ بولا، "تم ٹھہرو میں ابھی آتا ہوں۔" وہ دوڑا دوڑا گیا اور بان سے بٹی ہوئی ایک موٹی سی رسی لے آیا...... ابھی ہم گارڈ کے ہاتھ پیر باندھ ہی رہے تھے کہ اس نے ہوش میں آ کر آنکھیں کھول دیں اور جب ہماری شکلیں دیکھیں تو گڑگڑانے لگا:

"خدا کے واسطے مجھے نہ مارو...... میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے...... تم مجھے چھوڑ دو، میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے بارے میں کوئی رپورٹ نہ دوں گا...... میں تو خود یہاں سے تنگ آ گیا ہوں۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے یتیم ہو جائیں گے...... خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو۔"

"چُپ رہو...... بدمعاش......" گاڑی بان نے اسے گھونسہ دکھایا۔ "ہمیں سب

معلوم ہے کہ تم کیا کیا شرارتیں کرتے رہے ہو...... میں ابھی اسی استرے سے تمہارا گلا کاٹتا ہوں۔"

یہ سن کر گارڈ کے چہرے پر مردنی چھا گئی، اس نے کچھ کہنا چاہا، مگر حلق سے آواز ہی نہ نکلی۔ میں نے گاڑی بان کو پرے ہٹا دیا اور گارڈ کے منہ میں کپڑے کی دھجی اچھی طرح ٹھونس دی تاکہ وہ چیخ پکار نہ کر سکے۔ اس کے بعد میں نے اس کے گھوڑے کو دوسری سمت میں لے جا کر ایک درخت سے باندھ دیا۔ گاڑی بان نے گاڑی چلائی اور ہم رائل کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں اس نے مجھے بتایا کہ رائل کے ہسپتال کا نیا ڈاکٹر بھی یہاں سے فرار ہونے کا ارادہ رکھتا ہے۔ وہ بھی دراصل کسی بڑے جرم میں ماخوذ ہو کر فرانس سے یہاں بھیجا گیا ہے، چوں کہ پیشے کے اعتبار سے وہ ڈاکٹر تھا، اس لیے یہاں اس پر زیادہ سختی نہیں کی گئی۔ گزشتہ دو برسوں میں اس نے کافی روپیہ جمع کر لیا ہے۔ اب اسے کسی ایسے ساتھی کی ضرورت ہے جو راستہ کے نشیب و فراز سے بخوبی واقف ہو اور رہنمائی کا فریضہ انجام دے سکے۔ اس نے تمہارے بارے میں بہت کچھ سنا ہے۔ ایک روز وہ کہہ رہا تھا کہ اگر یہ شخص میرے ساتھ ہو، تو ہم یہاں سے اس طرح فرار ہوں کہ پھر کوئی ہمارا سراغ نہ لگا سکے گا۔ ڈاکٹر کے رشتے دار فرانس کے علاوہ دوسرے ملکوں میں بھی ہیں اور وہ کہتا ہے کہ ایک مرتبہ ڈیول آئی لینڈ سے نکلنے کے بعد اس کے رشتے دار اسے اپنے ساتھ ایسے علاقے میں لے جائیں گے جہاں سے دنیا کی کوئی طاقت اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکے گی۔

گاڑی بان نے جب یہ انکشاف کیا، تو میرے دل میں امید کی ایک نئی کرن نمودار ہوئی اور مجھے یقین ہونے لگا کہ یہ ڈاکٹر ہی میرا نجات دہندہ ثابت ہوگا۔ جب ہم رائل کے مردہ خانے میں پہنچے، تو وہاں کوئی نہ تھا، البتہ ہسپتال کی مختصر سی عمارت کے ساتھ بنے ہوئے کیبن کے دروازے کے نیچے سے روشنی کی کرنیں دکھائی دیتی تھیں جس کا مطلب یہ تھا کہ ڈاکٹر ابھی تک جاگ رہا ہے۔

لاشیں مردہ خانے میں پھینک کر جب ہم ڈاکٹر کے کیبن میں داخل ہوئے، تو وہ ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ میرے ہاتھ میں بندوق دیکھتے ہی وہ اچھل کر کرسی سے اٹھا اور کچھ کہنے ہی والا تھا کہ میں نے منہ پر انگلی رکھ کر چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ میرے ساتھی نے مختصر الفاظ میں اسے تمام منصوبے سے آگاہ کیا، تو ڈاکٹر سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے کسی فیصلے پر پہنچ کر جلدی جلدی ضروری چیزیں ایک تھیلے میں بھریں اور رات کی تاریکی میں ہم تینوں آدمی رائل کی حدود سے باہر نکل گئے۔

❊ ❊ ❊

پانچ روز تک سمندر کی بپھری ہوئی سیاہ لہروں میں ہماری چھوٹی سی کشتی ہچکولے کھاتی اور ڈگمگاتی سفر کرتی رہی۔ چھٹے روز ہم نے ایک ویران اور بے آباد جزیرے پر قیام کیا۔ یہ ایک چھوٹا سا ٹاپو تھا جہاں سوائے جھاڑ جھنکاڑ اور بے شمار خطرناک حشرات الارض کے اور کوئی شے نہ تھی۔ وہاں ہم نے بڑے بڑے بچھو، کنکھجورے، سانپ اور گہرے زرد رنگ کی بڑی بڑی چھپکلیاں دیکھیں۔ ڈاکٹر انہیں دیکھ کر خوف زدہ ہوا۔ اس کی رائے میں یہاں ٹھہرنا خطرناک تھا' مگر پانچ روز کی مسلسل تھکن اور نیند کو پورا کرنے کے لیے ہمیں وہاں ٹھہرنا ہی پڑا۔ ایک محفوظ جگہ دیکھ کر ہم نے اپنے گرد آگ روشن کی اور اپنے آپ کو خدا کے سپرد کر کے گہری نیند میں کھو گئے۔

اگلے روز ہم نے پھر سفر شروع کیا۔ ڈچ گیانا کی ایک چھوٹی سی بندرگاہ البینا ہماری منزل مقصود تھی۔ ڈاکٹر کہتا تھا کہ اگر ہم خیریت سے البینا پہنچ جائیں، تو وہاں سے ہم روپے کے بل بوتے پر اپنی آزادی کے جعلی کاغذات آسانی سے بنوا کر پورٹ سپین تک جا سکیں گے، لیکن یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ ہم فرنچ گیانا کی آخری حد سینٹ لارنٹ کو عبور کر لیں، کیوں کہ یہاں پولیس کی بھاری تعداد نگرانی کے لیے مقرر ہے۔ سورج غروب ہونے کے فوراً بعد ہم سینٹ لارنٹ کی حدود میں داخل ہو گئے۔ میرے پاس بندوق تھی اور میں تہیہ کر چکا تھا کہ اگر کسی نے مزاحمت کی، تو میں آزادی سے اپنی بندوق

کا استعمال کروں گا۔ ہماری کشتی پانی کے بہاؤ پر تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی اور ہم تینوں کشتی کے اندر ایک دوسرے کے قریب دبکے پڑے تھے۔ یکا یک ڈاکٹر نے مجھ سے کہا:

''سنتے ہو...... ایک سٹیم لانچ سمندر میں جا رہی ہے۔ یہ سٹیم لانچ ضرور پولیس کی ہے۔''

میں نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ بلاشبہ ایک سٹیم لانچ ہمارے عقب میں چلی آ رہی تھی۔ اس پر چار مسلح سپاہی سوار تھے۔ اندھیرے میں ہمیں یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ یہ لانچ کس ملک کی ہے۔ فرنچ گیانا کی یا ڈچ گیانا کی؟ ہم تینوں اپنی کشتی میں چپ چاپ پڑے رہے۔ تھوڑی دیر بعد سٹیم لانچ کی جانب سے کسی نے پکار کر کہا:

''کیا اس کشتی میں کوئی شخص موجود ہے؟''

ہم میں سے کسی نے جواب نہ دیا۔ میں نے بھری ہوئی بندوق کے گھوڑے پر انگلی رکھ دی۔ چند ہی سیکنڈ بعد سٹیم لانچ ہماری کشتی کے بالکل قریب پہنچ گئی۔ ڈاکٹر نے گھٹی گھٹی آواز میں مجھ سے کہا: ''فائر کر دو............ وہ ہمیں نہتا سمجھ رہے ہیں۔''

یہ سنتے ہی میں نے بندوق کی نالی کشتی کے کنارے پر رکھی اور فائر کر دیا۔ سٹیم لانچ کی جانب سے ایک چیخ کی آواز آئی اور پھر اس کا انجن رُک گیا۔ غالباً پولیس کے سپاہیوں میں سے کسی ایک کو گولی لگی تھی۔ جواب میں انہوں نے بھی اپنی بندوقوں سے گولیوں کا مینہ برسا دیا، لیکن اتنی دیر میں ہماری کشتی کہیں سے کہیں نکل گئی۔ بہت دیر تک ہم اسی طرح دبکے پڑے رہے اور کشتی کو موجوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ آدھی رات کے قریب دور سے ہم نے ساحل پر روشنیاں دیکھیں۔ البینا کی بندرگاہ ہمارے سامنے تھی۔

البینا کے ساحلی جنگل میں تین روز تک ہم چھپے رہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر شہر میں گیا اور شام کو خوش خوش واپس آیا۔ اس نے بتایا کہ البینا میں ایک فوجی آفیسر سے اس کی

ملاقات ہوئی جو کبھی پیرس کے میڈیکل کالج میں اس کا ہم جماعت رہ چکا تھا۔ اس فوجی آفیسر کو اس نے ساری رام کہانی کہہ سنائی۔ اس نے مدد کا وعدہ کر لیا ہے اور کہا ہے کہ کل تک وہ ہماری رہائی کے کاغذات تیار کرا دے گا۔ البینا ہی سے ڈاکٹر نے پیرس میں اپنے رشتے داروں کو اطلاع بھجوائی۔ ایک ہفتے کے بعد وہ لوگ آ گئے اور ہمیں ایک ہوٹل میں لے گئے جہاں ہم نے اپنا حلیہ درست کیا۔ ڈاکٹر اور گاڑی بان البینا سے فرانس روانہ ہو گئے اور میں ایک بار پھر تنہا رہ گیا۔ اٹھارہ روز بعد میں ٹیری نیڈڈ پہنچا۔ وہاں کے حکام نے میرے کاغذات کا معائنہ کیا اور بتایا کہ فرنچ گیانا سے آئے ہوئے چالیس لوگ اور بھی یہاں موجود ہیں، کیوں کہ فرانسیسی حکومت نے اب ''آزاد قیدیوں'' کا قانون ختم کر دیا ہے۔ اب ایسے تمام لوگوں کو جو ڈیول آئی لینڈ پر اپنی سزا کی مدت پوری کر چکے ہیں، رہائی کے کاغذات دے دیئے جاتے ہیں۔ یہ سن کر میں نے دل ہی دل میں اطمینان کا سانس لیا، مگر ایک خدشہ یہ بھی تھا کہ میرے کاغذات جعلی ہیں۔ اگر انہیں ذرا بھی شبہ ہو گیا، تو میں پھر اپنے آپ کو ڈیول آئی لینڈ میں پاؤں گا۔

ٹری نیڈڈ کے پولیس ہیڈ کوارٹر میں ایک بار پھر میرے کاغذات کا معائنہ کیا گیا۔ اتفاق دیکھیے کہ محکمے کا افسرِ اعلیٰ مجھے پہچانتا تھا۔ اس نے مجھ سے بڑی ہمدردی سے کہا:

''ڈی بائیون! تمہاری زندگی میرے لیے ایک عجیب معمہ ہے۔ ہمت اور استقلال کا جیسا مظاہرہ تم نے کیا ہے، میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا...... میں تمہاری اور تمہارے جذبہ آزادی کی قدر کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے میرے سامنے سینٹ لارنٹ سے آئی ہوئی ایک رپورٹ پیش کی جس میں بتایا گیا تھا کہ ڈیول آئی لینڈ کا بدنام ترین مجرم ڈی بائیون ایک مرتبہ پھر فرار ہو گیا ہے اور اس نے البینا کے قریب گولی چلا کر ایک فرنچ سپاہی کو زخمی بھی کیا...... اس شخص کی انگلیوں کے نشان بھیجے جا رہے ہیں...... جونہی یہ مجرم ٹری نیڈڈ پہنچے، اسے معاہدے کے مطابق واپس ڈیول آئی لینڈ بھیج دیا جائے۔''

میں نے یہ رپورٹ پڑھی اور پولیس آفیسر کی طرف دیکھنے لگا۔ چند لمحے غور کرنے کے بعد اس نے سر ہلایا اور بولا:

''کیا خیال ہے؟ تمہیں ڈیول آئی لینڈ بھیج دیا جائے؟''

''ضرور بھیج دیجیے۔'' میرا جواب تھا...... ''لیکن مجھے شوٹ کرنے کے بعد......''

وہ یہ سن کر مسکرایا اور قریب رکھی ہوئی گھنٹی بجائی...... اردلی کمرے میں آیا، تو آفیسر نے پوچھا:

''کشتی روانگی کے لیے تیار ہے؟''

''جی ہاں۔''

''خوب...... اچھا مسٹر ڈی بائیون...... خدا آپ کا نگہبان ہو...... میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ تمہیں ڈیول آئی لینڈ نہیں جانا چاہیے۔ میں نے ایک بڑی کشتی کا انتظام کر دیا ہے۔ تمہارے ساتھ چند اور مظلوم بھی ہوں گے۔ وافر خوراک کا بھی بندوبست ہو چکا ہے۔ اب تم فوراً یہاں سے روانہ ہو جاؤ۔ تمہاری منزلِ مقصود کیوبا، ناساؤ یا امریکہ ہے۔ اگر تم ان میں سے کسی ایک ملک تک پہنچ گئے، تو پھر تمہارے لئے امان ہے...... جاؤ الوداع......''

دو ہفتے بعد جب میں نے بہاما آئی لینڈ کے خوب صورت جزیرے ناساؤ کی سرزمین پر قدم رکھا، تو میری زندگی کے اُفق پر آزادی کا نیا آفتاب طلوع ہو رہا تھا۔

اس وقت جب کہ یہ سطریں میرے قلم سے نکل رہی ہیں، ڈیول آئی لینڈ سے آئے ہوئے مجھے اٹھارہ برس گزر چکے ہیں...... میرے تمام پرانے ساتھی ایک ایک کر کے اپنے وطن فرانس جا چکے ہیں، لیکن میں اب اپنے دل میں فرانس کے لیے کوئی کشش نہیں پاتا۔ میرا وطن اب ناساؤ ہے، جس کے چپے چپے سے مجھے پیار ہے، کیوں کہ اس نے مجھے پناہ دی اور امن کی آغوش میرے لیے وا کر دی۔ یہ وہ ناساؤ ہے جہاں مجھ سے محبت کرنے والی بیوی اور بچے ہیں۔ میرا خوب صورت اور آرام دہ گھر ہے جس میں زندگی کی تمام آسائشیں میسر ہیں۔ میں اب ہنری بائیون ''قاتل'' نہیں، بلکہ ہنری ڈی بائیون مجسمہ ساز اور مصور ہوں جس کے فن کی دور دور تک دھوم مچی ہوئی ہے۔

* * *

دارا کی تباہی

اس سے پہلے کہ میں دارا کی تباہی کی ہوش رُبا داستان آپ کے گوش گزار کروں، اپنا مختصر تعارف کرا دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ میرا نام پی۔جے۔ابراہام ہے اور میں بھارت کی ریاست کیرالا کا باشندہ ہوں۔ میرا پیشہ صحافت ہے، جس زمانے کا یہ ذکر ہے، میں اس زمانے میں ”گلف ڈیلی ٹائمز“ میں سب ایڈیٹر کی حیثیت سے ملازم تھا۔ بعض وجوہات کی بنا پر، جن کا تذکرہ یہاں بے محل ہے، مالکان اخبار نے اسے بند کر دینے کا فیصلہ کیا۔ اب میں فارغ تھا۔ وطن کی یاد ستانے لگی اور میں بیوی کو لے کر ہندوستان جانے کی تیاریاں کرنے لگا۔ بہار کا موسم شباب پر تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ جلد از جلد اس خوشگوار موسم سے فائدہ اٹھاتے ہوئے رخصت ہو جاؤں۔ میں نے برٹش ایرلائن سے رجوع کیا، تو پتہ چلا کہ ان کا جہاز دارا چھ اپریل کو ہندوستان کے لیے روانہ ہوگا۔ میں نے اس میں دوسرے درجے کی دو سیٹیں بک کرا لیں۔

پانچ سال تک بحرین کی رومان پرور سرزمین میں رہنے کے بعد میں اور بیوی اپنی خوش گوار یادوں کو دلوں میں بسائے رخصت ہو رہے تھے۔ چھ اپریل کی صبح چمکیلی اور فرحت بخش تھی۔ دو روز پہلے جو زبردست طوفان باد و باراں جزیرے پر نازل ہوا تھا، اس کے اثرات یکسر مفقود تھے۔ یہ طرز زندگی رواں دواں تھی۔ علی الصبح دارا کے سفری ایجنٹوں گرے اینڈ میکنزی کی طرف سے مجھے فون پر یہ ہدایت دی گئی کہ ہم دس بجے تک ساحل سمندر پر پہنچ جائیں، چناں چہ نو بجے تک ہم سارا سامان باندھ کر اپنے خوب

صورت، آرام دہ اور چھوٹے سے فلیٹ پر الوداعی نظریں ڈالتے ہوئے باہر آ گئے۔ باغیچے میں لگے ہوئے یاسمین اور گیندے کے پھول صبح کی خنک ہوا میں جھوم رہے تھے۔ ہم نے ہاتھ ہلا کر انہیں رخصتی سلام کیا اور جلدی سے کرائے کی موٹر میں بیٹھ گئے۔

جیٹی پر پہنچے تو وہاں عجیب ہنگامہ برپا تھا۔ سینکڑوں مسافر، جو دارا پر سوار ہونے والے تھے، اپنے دوستوں، رشتے داروں اور عزیزوں سے رخصتی دعا سلام کر رہے تھے۔ قلیوں کی بھاگ دوڑ، موٹروں کے بجتے ہوئے ہارن، سامان کی ریل پیل اور ایک دوسرے کو پکارنے کی مسلسل آوازیں...... غرضیکہ بڑا ہی دل چسپ سماں تھا۔ ہمارے ملنے والے بڑی تعداد میں وہاں موجود تھے۔ اس مجمع میں مسٹر جارج کا خاندان بھی ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ مسٹر جارج میرے ہم وطن تھے۔

ان کی بیوی میری جارج اپنی بچیوں کو لے کر، جن کی عمر بالترتیب تین سال اور چھ ماہ تھیں، کیرالا جا رہی تھیں۔ مسٹر جارج خود بعد میں آنے والے تھے، کیوں کہ ان کی ملازمت کا معاہدہ ختم ہونے میں ابھی ایک سال باقی تھا۔ مسٹر جارج نے بیوی بچیوں کو میرے سپرد کیا اور میں نے ان کو حفاظت سے وطن پہنچانے کی گراں ذمہ داری خوشی خوشی اپنے نحیف و ناتواں کندھوں پر لے لی۔ مجھے اگر علم ہوتا کہ آئندہ دو روز بعد کیسا المناک حادثہ پیش آنے والا ہے اور میں ان تینوں جانوں کو موت کے منہ سے بچا نہ سکوں گا، تو میں کبھی ان کی ذمہ داری اپنے سر نہ لیتا...... مگر اب ساری زندگی کے لیے ایک داغ میرے سینے پر لگ چکا، جس کا محو ہونا ناممکن ہے۔

جیٹی پر پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد موٹر لانچیں مسافروں کو بھر بھر کر دارا کی طرف لے جانے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ لانچ بھی آئی جس میں ہمیں سوار ہونا تھا۔ ہمارے علاوہ جو مسافر اس میں سوار ہوئے ان کی شکلیں اور حلیے مجھے اب تک یاد ہیں۔ ان میں چند مسلمان عورتیں تھیں جو سرتا پا سیاہ بُرقعوں میں لپٹی ہوئی تھیں۔ بعض یورپین لباس میں تھیں اور بعض عورتوں نے ساڑھیاں باندھ رکھی تھیں۔ ٹھنڈی ہوا سے محفوظ رہنے کے

لیے کئی عورتوں نے موٹے موٹے اوورکوٹ بھی پہن رکھے تھے۔ انہی میں لُو بو فیملی بھی تھی جس کا ذکر آگے آئے گا۔ لوبو پچاس سال کا ایک اینگلو انڈین آدمی تھا جو اپنی ادھیڑ عمر بیوی اور دو نوجوان لڑکیوں کے ساتھ ہندوستان جا رہا تھا۔ یہ سب کے سب یورپین لباس پہنے ہوئے تھے۔ لوبو فیملی کو دارا میں ہمارے کیبن کے نیچے ہی جگہ ملی تھی اور مجھے خوب یاد ہے کہ جب جہاز میں آگ لگی، تو ان میں سے کوئی فرد بھی زندہ نہیں بچ سکا۔

لانچ روانہ ہوتے ہی جیٹی پر موجود بہت سے لوگوں نے رومال اور بازو زور زور سے ہلائے۔ فی امان اللہ۔ الوداع...... السلام علیکم اور خدا حافظ کے نعرے بلند ہوئے...... پھر چند کیمرے بھی حرکت میں آئے۔ دارا، ساحل سے کئی میل دور کھلے سمندر میں کھڑا تھا۔ تیز اور روشن دھوپ میں وہ ایک ہیرے کی مانند چمکتا دکھائی دیتا تھا۔ میری بیوی سامان کے پاس بیٹھی ساحل کی طرف دیکھ رہی تھی جو لحہ بہ لحہ ہم سے دور ہٹتا جا رہا تھا۔ پھر وہاں کھڑے لوگ ہمیں نقطوں کی طرح دکھائی دینے لگے۔ میں نے اپنے چمڑے کے 21 سوٹ کیسوں پر نگاہ ڈالی جس میں سینکڑوں ہی قیمتی اور یادگار چیزیں بند تھیں۔ میرے اور امینی کے کپڑے، کیمرے، تصویریں، ٹائپ رائیٹر، سلائی کی مشین، ریڈیو، چینی کے برتن، ٹی سیٹ اور ڈنر سیٹ وغیرہ، امینی کے زیور غرضیکہ ان گنت چیزیں تھیں۔ ان کے علاوہ وہ روپیہ بھی تھا جو میں نے پانچ سال کی ملازمت کے دوران میں پس انداز کیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس روپے سے میں اپنا پریس اور اخبار خود جاری کر سکتا ہوں، لیکن قدرت میرے اس خیالی پلاؤ پر مسکرا رہی تھی۔

میں انہی خوش آئند تصورات میں گُم تھا کہ ہماری موٹر لانچ دارا کے قریب پہنچ گئی۔ 1957ء کے بعد یہ دوسرا موقع تھا کہ میں دارا میں سفر کرنے والا تھا۔ اس سفر کی خوش گوار یادیں میرے حافظے کی لوح پر ابھی تک تازہ تھیں۔ دارا اگرچہ بڑا جہاز نہیں تھا، مگر خوبی یہ تھی کہ دیکھنے میں بڑا نظر آتا تھا۔ اس کا وزن صرف پانچ ہزار تیس ٹن تھا۔ جہاز کی ریلنگ کے ساتھ ساتھ بہت سے مسافر کھڑے تھے۔ بچے، عورتیں، جوان، بوڑھے سبھی

نہایت دل چسپی سے موٹر لانچوں کے آنے جانے کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ گینگ وے پر پولیس آفیسر نے ہمارے پاسپورٹ دیکھے اور مطمئن ہو کر جہاز میں داخل ہونے کی اجازت دے دی۔ برج ڈیک کے دائیں جانب دو کیبن نمبر 24 اور نمبر 25 ہمیں دیئے گئے تھے۔ کیبن نمبر 24 میرے حصے میں آیا اور نمبر 25 میں میری بیوی، مسز جارج اور ان کی دونوں بچیاں سما گئیں۔ عورتوں کو تھکن اتارنے کا موقع دے کر میں دارا کی سیر کو نکل گیا...... جہاز کی اندرونی خوب صورتی، صفائی، سامان آرائش و زیبائش میں 57ء کے بعد سے کئی گنا اضافہ ہوا تھا۔ تنگ راہداریوں اور برآمدوں تک میں دبیز قالین بچھے تھے۔ دوسرے درجے کے کیبنوں کے ساتھ ہی لائبریری تھی جس میں ہر موضوع پر بہت سی کتابیں قرینے سے رکھی تھیں۔ کرسیوں کے بجائے اس مرتبہ مجھے یہاں قیمتی آرام دہ صوفے لگے دکھائی دیے۔ لائبریری کے ساتھ ہی بار روم اور کھیلوں کا وسیع کمرہ تھا۔ جب میں اس کمرے میں داخل ہوا، تو چند لوگ صوفوں پر ٹانگیں پھیلائے آنکھیں بند کیے لیٹے ستا رہے تھے۔ اس حصے میں ایئر کنڈیشنڈ یونٹ بھی لگا ہوا تھا۔ برآمدے کے ساتھ ساتھ کھلے عرشے کی آخری حد پر تختوں کی ایک سفید دیوار کھڑی تھی جس کے دوسری جانب پہلا درجہ شروع ہو جاتا تھا...... دوسرے درجے کے مسافر وہاں نہیں جا سکتے تھے۔ اس حصے میں علیٰحدہ جگہ پر دارا کے اعلیٰ افسروں اور انجینئروں کے کیبن تھے۔ ان کیبنوں کے اوپر دارا کے کپتان کی رہائش گاہ تھی۔ قریب ہی لائف بوٹس کے دو سیٹ رسوں کے ذریعے لٹک رہے تھے۔ اول اور دوم درجے کے مسافروں کی تعداد 78 سے زائد نہ تھی، البتہ آخری درجے کے عرشے پر بڑی رونق تھی۔ مجھے معلوم ہوا کہ ان مسافروں کی تعداد 948 ہے۔ ان کا سامان نہایت بے ربطی اور بے ترتیبی سے ہر طرف بکھرا ہوا تھا۔ جس کو جہاں بھی جگہ ملی، وہیں براجمان تھا۔ ان میں زیادہ تر ادنیٰ درجے کے مزدور اور ملازمت پیشہ لوگ تھے جو بحرین کی تیل کمپنیوں اور فیکٹریوں میں کام کرتے تھے اور اب رخصت پر اپنے وطن جا رہے تھے۔ ان میں مختلف مذاہب کے

لوگ شامل تھے۔ مسلمان، ہندو، سکھ، اینگلو انڈین اور بعض عرب بھی تھے۔ طرح طرح کی بولیوں سے عرشے پر ایک عجیب ہنگامہ برپا تھا۔ ان میں پاکستان اور ہندوستان کے لوگوں کی تعداد سب سے زیادہ تھی جو اردو اور پنجابی میں ایک دوسرے سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ اس وقت ان لوگوں کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ ایک ہی بڑے خاندان کے افراد ہیں جنہیں ایک دوسرے سے بے پناہ ہمدردی اور الفت ہے۔ ہر شخص جان پہچان کے بغیر ہی دوسرے کی خیریت پوچھتا پھرتا تھا اور لوگ اپنے اپنے دیس کی باتوں اور رشتے داروں کے ملنے کی خوشی میں پھولے نہ سماتے تھے۔ اپنے سفر کی آخری منزل تک وہ اس عرشے پر سونے، کھانا پکانے اور میل ملاقات اور کھیل کود کا پروگرام بنا رہے تھے۔ مسلمان برقع پوش عورتیں اپنے اپنے ٹرنکوں اور صندوقوں کے پیچھے بیٹھی ہوئی تھیں، البتہ ان کے بچے عرشے پر دوڑتے پھر رہے تھے۔

سیڑھیوں اور برآمدوں میں اترتے اور چڑھتے وقت میں نے بہت سے نقشے اور تصویریں وہاں لگی ہوئی دیکھیں جن میں بتایا گیا تھا کہ خطرے کے وقت مسافر حفاظتی کشتیوں میں کس طرح سوار ہوں، جہاز سے کس طرح نکلیں، کن کن راستوں پر جائیں، لائف جیکٹ پہننے کا طریقہ کیا ہے۔ یہ ہدایات تصویروں کے نیچے چار مختلف زبانوں میں لکھی ہوئی تھیں۔ میں نے ان پر بے پروائی سے سرسری نظر ڈالی اور آگے بڑھ گیا، لیکن سیڑھیاں اترتے ہوئے میری نگاہ گہرے سرخ رنگ سے لکھے ہوئے ان موٹے الفاظ پر پڑی اور میں ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ یہ دراصل پوری عبارت تھی جس کا یہ فقرہ خاص طور پر نمایاں کرنے کے لیے سرخ رنگ سے لکھا ہوا تھا:

"سمندر میں چلتے جہاز کو اگر آگ لگ جائے، تو یہ حادثہ خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔"

ایک لمحے کے لیے میں نے اپنی طبیعت میں کچھ اضطراب سا محسوس کیا، مگر فوراً ہی سر کو جھٹکا دے کر آگے بڑھ گیا۔ اُونہہ..... ایسی نامعقول ہدایتوں پر دھیان دینے کی ضرورت ہی کیا ہے..... تھوڑی دیر کے معائنے کے بعد مجھے اندازہ ہو گیا کہ دارا کے

ساتھ حفاظتی سامان مکمل مقدار میں ہے۔ اگر خطرے کے وقت اسے استعمال کر لیا جائے، تو تمام مسافروں اور عملے کے افراد کو بخوبی بچایا جا سکتا ہے۔ 16 لائف بوٹس تھیں جن میں سے ہر لائف بوٹ میں 68 افراد سما سکتے تھے۔ ان کے علاوہ چھوٹی چھوٹی اور بھی بہت سی کشتیاں جہاز کے ساتھ بندھی ہوئی تھیں۔ یورپین سٹاف سے لے کر ادنیٰ خلاصیوں تک 132 افراد دارا کے عملے میں شامل تھے۔ خلاصیوں میں زیادہ تر ہندوستانی باشندے ملازم تھے جو ساحلی علاقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے قد پستہ، جسم مضبوط اور گٹھے ہوئے تھے۔ ان میں بلا کی مستعدی اور پھرتی تھی۔ وہ جہاز میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک اپنی نیلی وردیاں پہنے مختلف انتظامات کے لیے بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔

شام کو دارا نے لنگر اٹھایا اور مشرق کی جانب روانہ ہوا۔ اب ہم دوبئی کی بندرگاہ پر رکنے والے تھے۔ سورج غروب ہوتے ہی فضا میں خنکی بڑھ گئی اور تیز ہوا کے آثار نمودار ہونے لگے۔ اول اور دوسرے درجے کے عرشے ویران پڑے تھے۔ ان درجوں کے تمام مسافر ٹھنڈی ہوا سے بچنے کے لیے اپنے اپنے کیبنوں میں پناہ لے چکے تھے۔ کیبن نمبر 26 میں ایک ہندوستانی نوجوان اپنی سولہ سالہ نہایت حسین بیوی کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ وہ بھی کیرالا کا رہنے والا تھا اور بحرین پٹرولیم کمپنی میں کسی اچھے عہدے پر فائز تھا اور اب رخصت پر اپنے وطن جا رہا تھا۔ اس کی بیوی کی گود میں ایک ماہ کی بچی تھی۔ اس نوجوان کا نام وینکی تھا جو بہت باتونی آدمی ثابت ہوا۔ وہ امریکی لہجے میں نہایت تیزی سے انگریزی بولتا تھا۔ مجھ سے کہنے لگا: آؤ بار روم میں چل کر کچھ پئیں۔ وہاں وہ دیر تک میرا مغز چاٹتا رہا۔ اسے اپنی بیوی سے بڑی محبت تھی۔ کہتا تھا کہ میں محض اسی کی خاطر ہندوستان جا رہا ہوں، کیوں کہ وہ اپنے رشتے داروں سے ملنے کے لیے بڑی مضطرب ہے۔ کاش وینکی کو معلوم ہوتا کہ ہندوستان پہنچنا تو درکنار، اس بھیانک سفر میں وہ اپنی بیوی اور معصوم بچی کو ہی گنوا بیٹھے گا۔ جب بھی اس نوجوان کا خیال آتا ہے، تو دل خون کے آنسو روتا ہے۔

17 اپریل جمعے کے روز دوپہر کے وقت دارا دوبئی کی بندرگاہ کے قریب کھلے سمندر میں لنگر انداز ہوا اور ایک بار پھر موٹر لانچوں کی آمدورفت زور وشور سے شروع ہوئی۔ نئے مسافر آنے لگے۔ مسز جارج نے بتایا کہ اس کے چند رشتے دار دوبئی سے دارا پر سوار ہونے والے ہیں۔ خود میری بیوی کا ایک بھائی بھی یہیں سے جہاز پر سفر کرنے والا تھا۔ پس ہم ان کے انتظار میں لوہے کے کٹہرے کے پاس کھڑے ہو کر گینگ وے پر چہل پہل دیکھنے لگے۔ مجھے یاد ہے کہ وہیں قریب ہی لوبو فیملی کے افراد ایک بینچ پر بیٹھے سمندر کا نظارہ کر رہے تھے۔ غالباً انہیں کسی ملاقاتی کا انتظار نہیں تھا۔ سہ پہر کے قریب وہ لوگ آ گئے۔ ان کی آمد سے ہمیں صحیح معنوں میں خوشی ہوئی، کیونکہ جتنے زیادہ افراد ایک دوسرے سے آشنا ہوں، سفر اتنا ہی آرام سے کٹ جاتا ہے۔ شام سے پہلے جہاز نے لنگر اٹھا دیا۔ ہم نے دیکھا کہ ہوا کا طوفان آ رہا ہے اور اس کے ساتھ آسمان پر سیاہ گھٹا تلی کھڑی ہے۔ جہاز چلتے ہی موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ اس وقت تیسرے درجے کے عرشے پر لیٹے ہوئے مسافروں میں ہل چل مچ گئی۔ ہر شخص بارش سے بچنے کے لیے پناہ کی تلاش میں تھا۔ لوگوں نے سامان وہیں کھلی جگہ پر چھوڑ دیا، اور خود عرشے کے نیچے چلے گئے۔ رفتہ رفتہ سمندر میں اونچی اونچی لہریں اٹھنے لگیں اور دارا ان کے نرغے میں آ کر ہچکولے کھانے لگا۔ جہاز میں ایک زلزلے کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ بارش کے تھپیڑے پوری قوت سے بند کھڑکیوں اور دروازیوں کی آہنی پلیٹوں سے ٹکراتے رہے، بعدازاں بڑے بڑے اولے بھی برسنے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے مشین گن سے مسلسل گولیاں برس رہی ہیں۔ بند کیبن کے اندر بھی ہمیں طوفان کا مہیب شور اور بادلوں کی گرج صاف سنائی دے رہی تھی۔ موٹے شیشوں کے باہر جہاں تک نگاہ کام کرتی، گھپ اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ کبھی کبھی بجلی چمکتی، تو سمندر کی مہیب لہریں جہاز سے ٹکراتی ہوئی دکھائی دیتیں۔ جلد ہی ہم سب کو چکر آنے لگے اور جی متلانے لگا۔ دیر تک دارا طوفان میں گھرا رہا۔ اس کے بعد بارش تھم گئی اور آہستہ آہستہ سمندری

طوفان کا جوش وخروش بھی دھیما پڑ گیا۔ دفعتاً جہاز نے ایک زبردست جھٹکا کھایا اور کیبن کی دیواریں لرزنے لگیں، اردگرد رکھے ہوئے سوٹ کیس اور دوسرا سامان تہہ و بالا ہو گیا۔ ابھی ہم اس جھٹکے سے سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ ایک اور جھٹکا محسوس ہوا۔ یہ پہلے سے بھی شدید تھا۔ کیبن کا بند دروازہ ایک دھماکے سے کھل گیا اور عشرے پر سے بے شمار آدمیوں اور عورتوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں سنائی دیں۔ میں فوراً بھاگتا ہوا عرشے کی طرف گیا تو وہاں بہت سے لوگ کٹہرے کے ساتھ کھڑے تھے، اسی مجمعے میں دارا کے عملے کے چند لوگ بھی بدحواس سے ادھر ادھر دوڑتے دکھائی دیئے۔ برج کے دو افسر جھکے ہوئے ہاتھوں کے اشارے سے ایک دوسرے کو سمندر میں کوئی چیز دکھا رہے تھے۔ میں نے ایک بڑے اسٹیمر کو جہاز کے قریب ہی تیرتے ہوئے دیکھا۔ اس کے اگلے حصے میں جلی سفید حروف سے نام لکھا تھا...... ''زیوس'' ...... بعد میں یہ پتہ چلا کہ یہ اسٹیمر دارا سے ٹکرا گیا تھا۔ اس کی بتیاں روشن تھیں۔ معلوم نہیں ہو سکا کہ دارا سے اسٹیمر کے ٹکرانے کی اصل وجہ کیا تھی، تاہم اس وقت ہم نے خدا کا شکر ادا کیا، کیوں کہ اس ٹکر سے دارا کو کوئی شدید نقصان نہیں پہنچا تھا۔ عین اسی لمحے بارش دوبارہ شروع ہو گئی۔ اس مرتبہ ژالہ باری کا طوفان اپنے عروج پر تھا...... سمندر میں ایک بار پھر جوار بھاٹا کی سی کیفیت نمودار ہوئی اور جہاز موجوں پر ہچکولے کھاتا اور ڈگمگاتا ہوا مدھم رفتار سے آگے بڑھ رہا تھا۔ میں حیران تھا کہ یہ بے وقت کے طوفان کیوں نازل ہو رہے ہیں۔

اس حادثے کے تھوڑی دیر بعد جہاز میں ڈنر تقسیم ہوا۔ درجہ دوم کے اکثر مسافروں نے اپنے اپنے کیبنوں ہی میں کھانا منگوایا، البتہ بعض مسافر، جو یورپین کھانے کے شائق تھے، طعام گاہ میں چلے گئے۔ چوں کہ ہمارے پاس دو کیبن تھے، اس لیے میری تجویز پر یہ طے ہوا کہ سب مرد ایک کیبن میں اور سب عورتیں دوسرے کیبن میں قیام کریں۔ میرے کیبن میں صرف تین آدمیوں کی جگہ تھی، مگر ہم پانچ آدمی اس میں جمع تھے۔ میں، میری بیوی کا بھائی، مسز جارج کا بھائی اور اس کے دو دوست۔ ان لوگوں نے

وقت کاٹنے کے لیے تاش کھیلنا شروع کر دیا۔ یہ سب کے سب نوجوان اور زندہ دل لوگ تھے۔ کھیل کے دوران میں خوب ہنسی مذاق اور چہل ہوتی رہی۔ بازیوں پر بازیاں لگتی رہیں۔ میں نے اس وقفے سے فائدہ اٹھا کر جھپکی لے لی۔ نہ جانے کتنی دیر بعد آنکھ کھلی، دیکھا تو یہ لوگ تاش میں منہمک تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ رات بھر کھیل جاری رکھنے کا تہیہ کیے ہوئے ہیں۔ آخر میری نیند بھی اچاٹ ہوگئی۔ آدھی رات گزرنے کے بعد کھلاڑیوں میں تھکاوٹ کے آثار پیدا ہوئے۔ سب نے بمشکل مڑتڑ کر اپنے اپنے سونے کی جگہ بنائی۔ میں نے اپنی جگہ شاکو کو پیش کر دی اور کہا کہ میں کافی سو چکا ہوں، اب کرسی پر بیٹھ کر بقیہ وقت کاٹ لوں گا۔ یہ کہہ کر میں نے کیبن میں جلتی ہوئی بتی بجھا دی۔

تھوڑی دیر بعد برابر کیبن سے وینگی نے مجھے پکارا: ''یار ابھی سے سو گئے؟'' میں نے دل میں کہا یہ خوب رہی۔ اب یہ شخص باتیں کر کے ساری رات ''بور'' کرے گا، چناں چہ میں نے مصنوعی غصے سے کہا: ''دیکھیے صاحب، اب میں سونا چاہتا ہوں۔ خدا کے لیے کل کی طرح مجھے صبح پانچ بجے نہ اٹھا دینا۔'' یہ سن کر وہ ہنسا۔ اس کے بعد میں نے اس کی آواز نہیں سنی۔ میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ دو بج رہے تھے۔ قریب پڑی ہوئی ایک اور کرسی گھسیٹ کر میں نے پاؤں اس پر پھیلا دیئے اور آنکھیں میچ لیں۔

٭ ٭ ٭

معاً جہاز نے زبردست جھٹکا کھایا اور وہ کرسی' جس پر سہارے کے لیے میں نے پاؤں پھیلا رکھے تھے' اُلٹ گئی...... میں غالباً سو گیا تھا۔ آنکھ کھلی' تو میرے کانوں میں سیٹیاں سی بج رہی تھیں۔ کیبن میں گھپ اندھیرا تھا۔ میں نے فوراً اپنی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ چمکتی ہوئی سوئیوں نے بتایا کہ ٹھیک ساڑھے چار بج رہے ہیں۔ میں نے سوچا یہ جھٹکا کیسا تھا؟ کیا جہاز پھر کسی اور اسٹیمر سے ٹکرا گیا ہے...... شاید یہ میرا وہم تھا' مگر نہیں' کرسی اُلٹی پڑی تھی۔ دفعتاً میں نے باہر' اول درجے کی جانب انسانی آوازوں کا مدھم شور

سنا۔ میں کان لگائے سنتا رہا۔ اس وقت غنودگی کی ایسی کیفیت طاری تھی کہ ذہن صحیح کام نہیں کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد یہ آوازیں اور بلند ہوگئیں۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے بہت سے لوگ رو رہے ہیں۔ میں فوراً دریافت احوال کے لیے کرسی سے اٹھا اور کیبن کا دروازہ کھولنے ہی والا تھا کہ ایک لرزہ خیز دھماکہ سنائی دیا۔ کیبن کا فرش اور دیواریں اس زور سے ہلیں کہ اس میں رکھی ہوئی ہر ایک چیز زیر و زبر ہوگئی اور سبھی لوگ خوف زدہ ہو کر بیدار ہوگئے۔ پھر کسی نے چلّا کر کہا: ''یہ شور کیسا ہے؟'' میں نے جواب دیئے بغیر جھپٹ کر دروازہ کھولا اور باہر جھانکا۔ یخ بستہ ہوا کا ایک تیز جھونکا میرے جسم سے ٹکرایا اور میں کانپنے لگا۔ یکا یک میں نے محسوس کیا کہ جہاز چل نہیں رہا ہے۔ اس کے انجن خاموش ہیں...... میں شب خوابی کے لباس میں سردی کی پروا کیے بغیر تاریک راہداری میں دوڑا۔ دوسرے درجے کی حد سے باہر اب میں مردوں اور عورتوں کے چیخنے چلّانے کی ملی جلی آوازیں بخوبی سن رہا تھا۔ پھر میں نے سنا کسی نے بلند آواز میں کہا:

''آگ لگ گئی ہے...... آگ......''

فوراً ہی درجہ اول کی جانب سے آگ کے اونچے اونچے شعلے اور سیاہ دھویں کے مرغولے اٹھتے ہوئے دکھائی دیئے۔ دروازوں کے کھلنے' بند ہونے اور مسافروں کے بدحواسی میں دوڑنے کی آوازیں میرا خون سرد کیے دے رہی تھیں۔ چند منٹ تک میں پتھر کے بت کی مانند آگ کے شعلوں اور دھویں کو تکتا رہا۔ پھر مجھے اپنی بیوی کا خیال آیا...... اور میں بدحواس ہو کر واپس بھاگا' مگر اتنی ہی دیر میں دارا کے سارے مسافروں میں آگ لگ جانے کی خبر پھیل چکی تھی اور ہر طرف سے لوگ پاگلوں کی طرح بھاگے چلے آ رہے تھے۔ ہر طرف غل غپاڑہ اور افراتفری کا سا عالم تھا۔ اندھیرے میں لوگ ایک دوسرے سے اُلجھتے' ٹکراتے اور گرتے پڑتے سارے جہاز میں اوپر سے نیچے تک بھاگے پھر رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ ایک بوڑھا شخص معصوم بچے کو کندھوں پر بٹھائے میرے قریب سے گزرا۔ بچہ آنکھیں بند کیے سو رہا تھا۔ یکا یک بوڑھے کا پیر لڑکھڑایا اور

وہ دھڑام سے نیچے گر گیا۔ بچے کے رونے کی آواز اور بوڑھے کی ہائے ہائے میں کبھی نہیں بھول سکوں گا۔ اس وقت نفسانفسی کا ایسا عالم تھا کہ کسی نے بھی اسے اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ ایک لمحے کے لیے میں اسے سنبھالنے کے لیے پیچھے ہٹا ہی تھا کہ بہت سے آدمیوں کا ایک ریلا آیا اور میں دھکے کھا کر کہیں کا کہیں جا نکلا۔ ہر شخص ایک دوسرے سے گھبرا گھبرا کر پوچھ رہا تھا کہ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔ کیا جہاز ڈوب رہا ہے؟ اس میں آگ لگ گئی ہے؟ میرے کانوں میں مختلف نسوانی اور مردانہ آوازیں گونج رہی تھیں۔ ایک نوعمر انگریز لڑکی رو رو کر اپنے باپ کو پکار رہی تھی۔ خود میرا یہ حال تھا کہ اپنی بیوی کو دیوانہ وار حلق پھاڑ پھاڑ کر پکارتا ہوا اِدھر سے اُدھر بھاگا پھر رہا تھا۔ بدحواسی میں مجھے اپنے کیبن تک جانے کا راستہ ہی نہیں مل رہا تھا۔ عملے کے لوگ مسافروں سے قطعی بے نیاز آگ بجھانے میں مصروف تھے' لیکن تیز ہوا کے سامنے ان کی کوئی پیش نہ جا رہی تھی۔ آگ کے شعلے ہر لحظہ بلند ہوتے جا رہے تھے اور ان کی تپش اب ہر جگہ محسوس کی جا رہی تھی۔ آگ جہاز کے درمیانی حصے میں لگی تھی۔ اور رات کے اس اندھیرے میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سمندر کے سینے پر بہت بڑا چراغ روشن کر دیا گیا ہے۔ آگ جس تیزی سے بڑھتی جا رہی تھی' مسافروں میں اسی سرعت سے بے چینی اور خوف پھیل رہا تھا۔ اول' دوم اور سوم درجے کا امتیاز مٹ چکا تھا۔ درجہ اول کے مسافر' جن میں اکثر لوگ یورپین تھے' بھاگ بھاگ کر تیسرے درجے کے عرشے پر پناہ لے رہے تھے۔ اس اثناء میں ملیالم زبان میں ایک شخص زور زور سے چیختا ہوا سنائی دیا۔ وہ مسلسل کہہ رہا تھا:

"میں مر جاؤں گا...... مجھے بچاؤ...... مجھے بچاؤ...... پانی...... پانی......"

یہ میرا ہم وطن کوئی شخص تھا۔ آواز دوسرے درجے کے عرشے پر سے آ رہی تھی۔ میں نے جھانک کر دیکھا' تو آگ کی روشنی میں اس کا جسم خون سے لت پت تھا۔ وہ منہ کے بل فرش پر پڑا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بدحواسی میں بھاگتے ہوئے وہ کسی

اونچی جگہ سے یک لخت نیچے گر کر زخمی ہو گیا۔ اس بدنصیب کی حالت پر توجہ دینے کی فرصت کسی کو نہ تھی۔ کون تھا جو اسے وہاں سے اٹھاتا اور پانی کا ایک گھونٹ ہی پلا دیتا۔ ہر شخص کو اپنی جان بچانے کی فکر تھی۔ اس وقت مجھے پھر امنی کا خیال آیا اور میں دیوانہ وار اسے پکارتا ہوا عورتوں اور بچوں کے مجمع میں گھس گیا۔ یکا یک کسی عورت نے بڑھ کر میرا بازو پکڑ لیا۔ وہ مسز جارج تھیں۔ اس کے پیچھے ہی امنی کھڑی دکھائی دی۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا اور ان دونوں کو ساتھ لے کر لائف بوٹس کی طرف دوڑا جن پر چڑھنے کے لیے لوگ ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑتے تھے۔ جو قوی تھے' وہ کمزوروں کو دھکے دے دے کر پیچھے ہٹا رہے تھے اور خود کشتی میں بیٹھنا چاہتے تھے۔ یہ ایسا تکلیف دہ منظر تھا کہ کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ بعض لوگوں نے اپنے کندھوں پر بچوں کو اٹھایا ہوا تھا اور عورتوں کو پہلے کشتی میں سوار کرانے کی جان توڑ سعی کر رہے تھے' مگر بے چاری عورتیں' جو کبھی ایسی مصیبت سے دوچار نہ ہوئی تھیں' بار بار پھسل کے نیچے آن پڑتیں یا ان کے کپڑے رسوں میں الجھ جاتے۔ اس کوشش میں کئی آدمی سمندر میں گر گئے اور غالباً انہیں بچانے کی طرف بھی حسب معمول کسی نے توجہ نہ دی۔

جہاز کے سب سے وسیع عرشے پر ایک قیامت برپا تھی۔ ہندوستانی اور پاکستانی عورتیں' مرد' بچے اور جوان سبھی یہاں جمع تھے۔ برقع پوش عورتیں بچوں کو سینے سے لپٹائے ہوئے رو رہی تھیں اور گڑگڑا کر خدا سے یہ آفت ٹل جانے کی دعا مانگ رہی تھیں۔ بچے بلک بلک کر رو رہے تھے اور مرد حواس باختہ گم سم کھڑے آگ کے شعلوں کو دیکھ رہے تھے۔ ان سب کے چہروں پر موت کی زردی پھیل رہی تھی...... کئی عمر رسیدہ سکھوں کی پگڑیاں غائب تھیں اور ان کے سر کے لمبے لمبے بال تیز ہوا میں لہرا رہے تھے۔ وہ پنجابی زبان میں جہاز کے عملے کو مغلظات سنا رہے تھے۔ بڑی بڑی نوکیلی مونچھوں والے عرب بھی تھے' جن کے چہرے سرخ ہو رہے تھے اور وہ کھا جانے والی نظروں سے جہاز کے یورپین افسروں اور خلاصیوں کو گھور رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ لوگوں نے یورپین

انجینئر سے جب التجا کی لائف بوٹس سمندر میں اتار دی جائیں' تو آفیسر نے ان کی طرف قطعاً توجہ نہ دی بلکہ دھکے دیتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ پھر اسی حرکت پر بس نہ کرتے ہوئے اس موذی نے ان سب افراد کو جو کسی نہ کسی طرح کشتیوں تک پہنچ جانے میں کامیاب ہوگئے تھے' گالیاں دے دے کر نیچے اُترنے کا حکم دیا۔ جب میں نے اس پر احتجاج کیا' تو وہ جھلا کر کہنے لگا: ''جب تک یہ لوگ نیچے نہیں اتریں گے' کشتیاں سمندر میں ہرگز نہیں اتاری جائیں گی۔'' اس اثناء میں چند لوگوں نے کشتیاں پانی کی سطح تک اتارنے کے لیے الٹی سیدھی تدبیریں اختیار کیں اور غلطی سے چند رسے کاٹ دیئے' لیکن اس کا بڑا مہلک نتیجہ برآمد ہوا۔ رسے کٹتے ہی ایک دھماکے کے ساتھ آدمیوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی دو کشتیاں سمندر میں گر گئیں۔ ان میں کئی عورتیں اور بچے بھی تھے جن کی فلک شگاف چیخیں ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی ہیں۔ ہم سب دوڑتے ہوئے آہنی کٹہرے کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ بے چارے لوگ سمندر میں غوطے کھا کھا کر غرق ہو رہے تھے۔ اس سے پیشتر کہ انہیں بچانے کا کوئی انتظام کیا جاتا' سمندری مچھلیاں کثیر تعداد میں پانی کی سطح پر اُبھر آئیں۔ ان میں بڑی بڑی شارک مچھلیاں بھی تھیں جو اپنے بھیانک جبڑے کھولے تیزی سے انسانوں کو شکار کر رہی تھیں۔ یہ منظر ایسا مہیب اور دہشت انگیز تھا کہ کٹہرے کے پاس کھڑی ہوئی ایک عورت غش کھا کر گر پڑی۔ اس کا آدھا جسم سمندر کے رخ کٹہرے پر لٹک رہا تھا۔ فوراً ہی اس کا شوہر آگے بڑھ کر اسے تھام نہ لیتا' تو وہ عورت بھی مچھلیوں کا شکار بن جاتی۔ یہ کیفیت دیکھ دیکھ کر میرا دل بیٹھا جا رہا تھا اور میں نہیں جانتا تھا کہ اپنی بیوی' مسز جارج اور ان کی دو معصوم بچیوں کو بچانے کے لیے کیا تدبیر اختیار کروں۔

آگ اب اول درجے کے کیبنوں کو جلا کر تیزی سے جہاز کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی۔ لکڑی کے تختے اور دوسرا سامان آگ کے اندر چٹاخ چٹاخ کی آوازیں پیدا کرتا ہا دھڑا دھڑ جل رہا تھا۔ تمام خلاصی اور انجینئر اس آگ پر قابو پانے کی جہد مسلسل

میں اس طرح مصروف تھے جیسے وہ جہاز کو ہر قیمت پر بچانا چاہتے ہیں' لیکن انہیں جلد ہی معلوم ہوگیا کہ اس آگ پر قابو پانا ناممکن ہے۔ آگ کی تپش نے سرد ہوا کا اثر کسی حد تک زائل کر دیا تھا' لیکن اب سینکڑوں مسافروں کو موت اپنے چاروں طرف آگ اور پانی کی شکل میں رقص کرتی دکھائی دے رہی تھی۔

آگ لگ جانے کے بعد اسے بجھانے کی کوشش میں ناکام ہو کر عملے کے لوگ مسافروں کی طرف متوجہ ہوئے۔ جہاز کے ادنیٰ ملازم چوں کہ ہندوستانی تھے اس لیے وہ فطرتاً اپنے ہم وطنوں کو بچانے کی زیادہ فکر کر رہے تھے۔ دارا کے ہر یورپین آفیسر نے لائف جیکٹ پہن رکھی تھی۔ اتنے میں دو انگریز افسر بھاگتے ہوئے اس عرشے کی طرف آئے جہاں ہم جیسے بے یار و مددگار لوگ دبکے کھڑے تھے۔ یہ سب وہ لوگ تھے جو دوسروں کی طرح زبردستی دھکم پیل کر کے کشتیوں میں سوار ہونے سے عاجز تھے۔ انہوں نے آتے ہی عرشے کے ایک جانب رکھا ہوا لمبا اور کسی قدر چوڑا تختہ دوسرے آدمیوں اور خلاصیوں کی مدد سے کھینچ کر کٹہرے تک پہنچایا۔ پھر اس میں پھرتی سے رسے باندھنے لگے۔ چند منٹ میں انہوں نے یہ تختہ سمندر میں پھینک دیا۔ پھر ایک انگریز آفیسر چلا کر بولا:

''سب سے پہلے عورتیں جائیں گی۔''

یہ سنتے ہی مسافروں میں ہل چل مچ گئی۔ بہت سی عورتیں ان انگریز افسروں کی طرف دوڑیں اور انہیں گھیر لیا۔ اب ہر عورت خوشامد کر رہی ہے کہ اسے سب سے پہلے جہاز سے اُتارا جائے۔ افسر نے سب کو دلاسا دیا اور کہا کہ صبر سے کام لیجیے' ہم سبھی کو بچانے کے ذمہ دار ہیں۔ اس تختے تک پہنچنے کے لیے یہ رسا پکڑ کر نیچے پھسلنا ہوگا' اس لیے گھبرائیے مت اور احتیاط سے کام لیجیے۔

ایک خلاصی پہلے ہی اس تختے تک پہنچ چکا تھا جو پانی کی لہروں پر ایک کھلونے کی طرح اُچھل رہا تھا۔ خلاصی تختے کے درمیان بیٹھا رسا مضبوطی سے تھامے ہوئے تھا۔

سب سے پہلے ایک مسلمان عورت کو نیچے اتارا گیا۔ اس بے چاری نے ساڑھی باندھ رکھی تھی۔ انگریز افسر نے حکم دیا کہ ساڑھی اتار دو ورنہ یہ الجھ جائے گی اور تم سمندر میں گر جاؤ گی۔ اس عورت کے رشتے داروں نے اگرچہ اس بات کو پسند نہیں کیا' مگر وہاں اب ناراض ہونے کا موقع نہ تھا۔ حواس باختہ خاتون نے فوراً ساڑھی اُتار دی اور اب وہ صرف سکرٹ اور بلاؤز پہنے ہوئے تھی۔ افسر نے اس کا بازو پکڑ کر کٹہرے پر چڑھنے کے لیے سہارا دیا۔ عورت نے کمال جرأت اور استقلال سے کام لے کر موٹا رسا اپنے ہاتھوں میں پکڑا' پیروں کے انگوٹھے اس میں پھنسائے اور آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگی۔ سب لوگ سانس روکے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ تختے کے قریب پہنچ کر خلاصی نے اسے پکڑ لیا اور ایک جگہ بٹھا دیا۔

اس عورت کے یوں حفاظت سے تختے تک پہنچ جانے کا منظر دیکھ کر بہت سی عورتوں کے حوصلے بلند ہوگئے اور یکے بعد دیگرے وہ نیچے اترنے لگیں۔ میں نے دیکھا کہ تختہ نما کشتی رفتہ رفتہ عورتوں سے پُر ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے امنی کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا اور انگریز افسر کے پاس لے گیا۔

"جناب' یہ میری بیوی ہے...... اسے بھی نیچے اُتار دیجیے۔"

بغیر کوئی لفظ کہے افسر نے امنی کا بازو پکڑا اور اسے کٹہرے پر لے گیا۔ میں نے چلّا کر کہا: "امنی رسا مضبوطی سے پکڑنا"...... اس نے سر کے اشارے سے ہاں کہی......

اس وقت میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ امنی نے دونوں ہاتھوں سے رسا پکڑا اور آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگی' لیکن اس کی نظریں اس عالم میں بھی مجھے تلاش کر رہی تھیں۔ میں نے کہا: "خدا حافظ امنی......" اس نے پھر سر ہلایا اور میں بے اختیار رو پڑا۔

دفعتاً اس کے ہاتھ سے رسا نکل گیا اور وہ سیدھی پانی میں جا گری۔ کٹہرے میں کھڑی ہوئی عورتیں چیخ اُٹھیں۔ میرا جی چاہا کہ میں بھی سمندر میں چھلانگ لگا دوں لیکن فوراً ہی قریب کھڑے ہوئے ونگی نے مجھے پکڑ لیا اور کہا: دیکھو تمہاری بیوی کو خلاصی نے پانی

میں سے نکال لیا ہے۔ اس کی جان بچ گئی ہے۔ تختے کے ہر طرف عورتیں ایک دوسرے کے ساتھ چمٹی ہوئی لیٹی تھیں۔ انہوں نے کنارے پر لگے ہوئے پتلے رسے کو دونوں ہاتھوں سے تھام رکھا تھا۔ پانی کی کوئی اونچی لہر آتی' تو ان عورتوں کے حلق سے گھٹی گھٹی سی چیخیں نکلنے لگتیں۔ میں نے عبرت سے دیکھا کہ اکثر عورتیں برہنہ ہو رہی ہیں' لیکن موت کی دہشت نے انہیں اتنا ہراساں کر دیا ہے کہ انہیں برہنہ ہونے کا بھی کوئی خیال نہیں تھا۔ امنی کے بعد ایک بوڑھی عورت کو نیچے اُتارا گیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں' البتہ ہاتھ پیر تھر تھر کانپ رہے تھے۔ وہ بار بار اپنے رشتے داروں سے کہہ رہی تھی:

"مجھے یہیں مر جانے دو...... میں سمندر میں ڈوبنا نہیں چاہتی...... مجھے یہیں مر جانے دو۔"

تب انہوں نے اسے سمجھایا کہ دیکھو اتنی عورتیں نیچے اُتری ہیں' کوئی بھی نہیں ڈوبی۔

اتنے میں افسر چلّایا:

"اسے نیچے اتارو' وقت ضائع نہ کرو۔"

یہ کہہ کر انہوں نے زبردستی بڑھیا کو کٹہرے پر کھڑا کر کے رسا اس کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ بڑھیا نے آنکھیں بند کیں۔ وہ مسلمان تھی' اس لیے اونچی آواز میں کلمہ پڑھتی ہوئی نیچے پھسلنے لگی اور تھوڑی دیر بعد خیریت سے تختے تک پہنچ گئی۔ جب انہوں نے دیکھا کہ تختے پر مزید جگہ نہیں رہی' تو دونوں افسر رسا پکڑ کر نہایت پھرتی سے نیچے اُتر گئے اور تختے کا چارج لے لیا۔ اس کے بعد کٹہرے پر کھڑے ہوئے ایک خلاصی نے چاقو سے رسا کاٹ دیا اور یہ تختہ سمندر کی لہروں پر بہتا ہوا لمحہ بہ لمحہ جہنم کا نمونہ بنے ہوئے جہاز سے دور ہٹنے لگا۔

❀ ❀ ❀

مسز جارج اور ان کی دو معصوم بچیوں کو بچانے کا مسئلہ بھی میرے سامنے تھا۔ وہ بچیوں کو کسی قیمت پر بھی چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ جہاز کا درمیانی حصہ بالکل جل چکا تھا اور آگ دوسرے عرشے کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اگرچہ بہت سے لوگ کشتیوں میں بیٹھ بیٹھ کر دارا سے دور ہو چکے تھے' مگر اس کے باوجود جہاز پر ابھی مسافروں کی بڑی تعداد موجود تھی۔ جہاز کے خلاصی یورپین افسر اور انجینئر پاگلوں کی طرح اِدھر سے اُدھر دوڑے پھر رہے تھے۔ ان لوگوں کو اپنے تن بدن کا ہوش نہ تھا۔ معلوم ہوا کہ کئی لوگ' جن میں عورتیں اور بچے بھی ہیں' آگ کے اندر گِھر چکے ہیں' غالباً انہی کو بچانے کی جدوجہد جاری تھی۔ آگ کے شعلے اب آسمان سے باتیں کر رہے تھے اور ہر لحہ دھماکوں کی آوازوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ یکا یک کسی نے چلاّ کر کہا: ''ایسا سامان جسے آگ فوراً پکڑ سکتی ہے' فوراً سمندر میں پھینک دو'' .... یہ سنتے ہی سبھی لوگ عرشے پر پڑے ہوئے سامان کی طرف دوڑے۔ لکڑی کے صندوق' پلاسٹک کے تھیلے' ربڑ کے تکیے اور اس طرح کی سینکڑوں چیزیں فوراً سمندر میں پھینکی جانے لگیں۔ میں نے سبز ساڑھی باندھے ہوئے ایک عورت کو دیکھا جس نے اپنا سارا سامان آناً فاناً پانی کی نذر کر دیا۔ وہ ہر مرتبہ کوئی نہ کوئی سوٹ کیس اور صندوق اٹھاتی اور کٹہرے تک جا کر اسے سمندر میں دھکیل دیتی۔ چوں کہ ان سب پر جہاز والوں نے نمبر ڈال رکھے تھے' اس لیے لوگوں کو اطمینان تھا کہ اگر پانی میں سے ان کا سامان بعد میں نکال بھی لیا گیا' تو واپس مل سکے گا۔ دیکھتے ہی دیکھتے مسافروں نے اپنا سارا سامان سمندر کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد انہوں نے دیوانہ وار آگ سے لڑنا شروع کر دیا۔ بہت سے ہندوستانی اور پاکستانی مسافروں کے سامان میں ٹین کی بنی ہوئی بڑی بڑی بالٹیاں اور کنستر بھی تھے۔ لوگوں نے جھٹ پٹ ان میں رسّے باندھے اور سمندر کا پانی بھر بھر کر اوپر کھینچنے لگے۔ پھر وہ دوڑتے ہوئے جاتے اور آگ پر پانی پھینک آتے۔ میں خود سرگرمی سے اس کام میں مصروف تھا اور اس کا فائدہ یہ ہوا کہ میں دیر تک اپنی بیوی اور مسز جارج کی طرف سے بے فکر رہا۔

آگ میں گِھرے ہوئے لوگ دوسرے درجے کے اندر موجود تھے۔ ان کے چاروں طرف آگ ہی آگ تھی۔ تمام سیڑھیاں دھڑا دھڑ جل رہی تھیں۔ کیبن' راہداری اور برآمدے سب آگ کی لپیٹ میں تھے۔ نہ جانے یہ لوگ وہاں کیسے پھنسے رہ گئے۔ میں نے ایک نوجوان لڑکی کو دیکھا جو اپنے چھوٹے بھائی کو گود میں اٹھائے ایک جلے ہوئے زینے پر چڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے اپنے جسم کے گرد ایک کمبل لپیٹ لیا تھا۔ آگ کے بھڑکتے ہوئے سرخ سرخ شعلوں میں وہ نہایت جرأت سے دوڑتی ہوئی زینے تک آئی' لیکن اس دوران میں اس کے کمبل نے آگ پکڑ لی' مگر وہ رُکی نہیں' بلکہ اور جوش سے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ یکا یک اس کا پیر لڑکھڑایا۔ آہ...... بدقسمت لڑکی نے اونچی ایڑی کے سینڈل پہن رکھے تھے۔ وہ منہ کے بل دہکتی ہوئی آگ میں گر گئی اور پھر کسی نے اسے زندہ نہیں دیکھا۔ لوگ اب پانی کی بالٹیاں لا لا کر اسی طرف پھینک رہے تھے۔ شاید وہ لڑکی کو بچانا چاہتے تھے۔ تھوڑی سی جدوجہد کے بعد آگ سرد ہو گئی اور جب جہاز کے خلاصی وہاں گئے' تو انہوں نے پندرہ لاشیں دیکھیں۔ وہ سب کے سب جل کر کوئلہ ہو گئے تھے اور بالکل پہچانے نہ جا سکتے تھے کہ ان میں کون عورت ہے اور کون مرد...... اس بہادر لڑکی کی لاش بھی جل کر سیاہ ہو چکی تھی' مگر اس نے آخری دم تک اپنے ننھے بھائی کو سینے سے چمٹائے رکھا۔ یہ منظر ایسا ہولناک تھا کہ کئی آدمی دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ جہاز کے خلاصیوں کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ خلاصیوں کے جسم پسینے میں نہائے ہوئے تھے اور کئی ایسے بھی تھے جن کے ہاتھ پیروں پر زخموں اور خراشوں کے نشان موجود تھے۔ یعنی بعض آگ میں جھلس گئے تھے۔ معلوم ہوا کہ عملے کے کئی افراد بھی اس آگ کی نذر ہو گئے ہیں...... وہ درجہ اول میں آگ بجھا رہے تھے کہ خود ہی جل گئے۔

مشرق میں آہستہ آہستہ صبح کاذب کا دُھندلکا صبح صادق کی سپیدی میں تبدیل ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں سورج بھی یہ تماشا دیکھنے نکل آئے گا۔ جب ذرا روشنی پھیلی' تو ہم نے

دیکھا کہ دارا کی بہت سی کشتیاں مسافروں سے اوپر تلے بھری ہوئی پانی کی سطح پر تیر رہی ہیں۔ ہوا کے جھونکے اور پانی کی لہریں ان کی رہنما تھیں۔ جدھر ان کا زور ہوتا' کشتیوں کو ادھر ہی ہانک کر لے جاتیں۔ ان کشتیوں میں جہاز کے عملے کا کوئی آدمی نہ تھا۔ لوگ جانوروں کی طرح ان میں بھرے ہوئے تھے۔ بعض مرتبہ پانی کی کوئی زبردست لہر کشتی سے ٹکراتی' تو چیخوں کی مسلسل آوازیں سنائی دیتیں۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے کشتی اُلٹ رہی ہے' مگر پھر بال بال بچ جاتی۔ قدرت کا یہ مذاق بھی خوب تھا۔

اچانک ایک لرزہ خیز دھماکے کے ساتھ دوسرے عرشے کا جلتا ہوا حصہ سمندر میں گر گیا۔ آگ کے سرخ شعلے ایک دم نیلے ہوگئے اور ان میں ایسی چمک پیدا ہوگئی جیسے آسمانی بجلی چمکتی ہے۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں اندھا ہوگیا ہوں۔ آنکھیں کھلی تھیں' مگر کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ بے پناہ چیخوں اور رونے کی آوازوں کا ایک شور تھا جو مجھے اپنے اردگرد سنائی دے رہا تھا۔ میں نے آواز دی:

"مسز جارج' آپ کہاں ہیں؟ مسز جارج؟"

کوئی جواب نہ آیا۔ میں اندھوں کی طرح ٹٹولتا ہوا آگے بڑھا' تو آگ کی تپش میرے جسم کو جھلسانے لگی۔ یکا یک کسی نے مجھے تھام لیا اور گھسیٹتا ہوا کسی جانب لے جانے لگا۔ میں نے پوچھا: "تم کون ہو؟" جواب ملا: "روجرس ہوں...... مسز جارج کا بھائی۔" یہ سن کر میری جان میں جان آئی۔ تھوڑی دیر بعد مجھے کچھ کچھ نظر آنے لگا۔ ہم جس عرشے پر کھڑے تھے' اس کا فرش ہمارے قدموں تلے لرز رہا تھا۔ اتنے میں دور سے کسی انگریز آفیسر نے انگریزی میں چلّا کر دوسرے سے کہا:

"جہاز کی ٹنکی پھٹ گئی ہے...... جہاز میں پانی بھر رہا ہے...... فوراً کود جاؤ۔"

عین اسی وقت ہوا نے طوفان کی شکل اختیار کر لی۔ جہاز تیزی سے ایک جانب بڑھ رہا تھا۔ آسمان پر دھوئیں کا گہرا سیاہ بادل پھیل گیا تھا اور مشرق میں سورج آہستہ آہستہ اُبھر رہا تھا۔ سورج کو دیکھ کر ہمارے حوصلے بلند ہوئے۔ وہ زندگی کا سرچشمہ ہے۔

ہمیں احساس ہوا کہ ہم اب زندہ بچ جائیں گے' لیکن کیسے؟ یہ کوئی نہ جانتا تھا۔ عرشے پر اس وقت بھی بہت سی عورتیں' مرد اور بوڑھے موجود تھے' یہ عورتیں اس لیے باقی رہ گئی تھیں کہ ان کی گود میں معصوم بچے تھے۔ بچوں کے بلک بلک کر رونے سے دل پھٹا جاتا تھا۔ ہر شخص کے چہرے پر موت کی زردی پھیل رہی تھی اور یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ان کے جسموں سے خون کا آخری قطرہ بھی نچوڑ لیا گیا ہے۔ بعض لوگ اب بھی آگ بجھانے کی سعی ناکام میں مصروف تھے۔ انہوں نے اس عرشے کو سمندر کے پانی سے اچھی طرح تر کر دیا تھا جس پر ان بدنصیبوں نے پناہ لے رکھی تھی۔ شاید اس خیال سے کہ آگ اس عرشے کو فوراً ہی نہ جلا دے۔

میں نے عرشے پر اِدھر سے لے کر اُدھر تک چکر لگایا۔ سبھی کی حالت قابل رحم تھی۔ ان میں سے اکثر لوگوں کے بدن آگ سے جھلسے ہوئے تھے اور کسی کے بدن پر صحیح سالم کپڑے نہ تھے۔ ایک جگہ میں نے کمبل میں لپٹی ہوئی ایک کمسن لڑکی کو دیکھا جس کا سارا بدن آگ میں جل گیا تھا۔ اس کا باپ قریب ہی بیٹھا پریشان نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ لڑکی جان کُنی کی کیفیت سے گزر رہی تھی۔ شدت تکلیف سے اس کی آنکھیں باہر نکلی پڑی تھیں۔ اس لڑکی سے چند قدم کے فاصلے پر ایک اور شخص بھی بری طرح جلا پڑا تھا۔ اس کے بدن پر جا بجا بڑے بڑے گھاؤ تھے جن سے لہو رِس رہا تھا۔ بعض لوگوں نے جلے ہوئے حصوں پر نیلے رنگ کے باریک کپڑے کی دھجیاں لپیٹ رکھی تھیں۔ میں نے غور سے ان دھجیوں کو دیکھا' تو پتہ چلا کہ یہ اس ساڑھی کی دھجیاں ہیں جو میری بیوی نے پہن رکھی تھی۔ مجھے خوشی ہوئی کہ یہ ساڑھی کسی کام تو آئی۔

دفعتہً کسی نے چلّا کر کہا: "وہ سامنے دیکھو' ایک جہاز سمندر میں جا رہا ہے۔"

اس آواز نے مردہ تنوں میں زندگی کی روح پھونک دی۔ ہر شخص بے تاب ہو کر اٹھا اور کٹہرے تک آ کر سمندر کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔ بلاشبہ افق پر جہاں آسمان اور سمندر ایک دوسرے سے گلے ملتے ہیں' ایک چھوٹا سا دھبہ حرکت کر رہا تھا۔ میرا دل

تیزی سے دھڑکنے لگا۔ کاش یہ جہاز وقت پر یہاں تک پہنچ جائے۔ اس سے پیشتر کہ آگ دارا کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے لے...... میں نے خدا سے دعا مانگی کہ ہوا اسی رخ چلتی رہے تاکہ آنے والے جہاز کی راہ میں رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ وہ ایک ایک لمحہ ہم پر صدیوں کی مانند گزر رہا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ دھبہ بڑا ہوتا گیا۔ اب ہم نے دیکھ لیا۔ وہ ایک بہت بڑا جنگی جہاز تھا۔ جلتے ہوئے دارا سے کئی فرلانگ دور وہ رُک گیا۔ پھر ہم نے دیکھا کہ کشتیاں پانی میں اتاری جا رہی ہیں۔ آدھ گھنٹے بعد پہلی کشتی دارا کے قریب پہنچ گئی۔ ایک بار پھر مسافروں کے اندر اضطراب اور سب سے پہلے جانے کی خواہش نے سر اٹھایا۔ کٹہرے کے ساتھ لٹکے ہوئے رسوں کو پکڑنے کے لیے ہر شخص دھکم پیل کر رہا تھا' حتیٰ کہ عورتیں بھی مردوں کے اندر گھسی جا رہی تھیں۔ اس اثناء میں کئی افراد رسوں سے لٹک لٹک کر نیچے اترنے لگے اور بدحواسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پانی میں گر کر غرق ہو گئے۔ ان افراد کا حشر دیکھنے کے باوجود رسا پکڑنے کی چھینا جھپٹی جاری رہی اور اس وقت تک یہی عالم رہا جب تک جنگی جہاز کی کئی اور کشتیاں اور موٹر لانچیں دارا تک نہ پہنچ گئیں۔ اس جنگی جہاز کا نام تھا' "برٹش انرجی" اور یہ محض آسمان پر پھیلا ہوا دھواں دیکھ کر ادھر آیا تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ میں کس طرح ایک کشتی تک پہنچا۔ اس وقت مجھ پر غشی طاری تھی' کیوں کہ آگ اب اس قدر نزدیک آ چکی تھی کہ اس کی تپش سے میری کھال جھلسنے لگی تھی۔ صرف اتنا یاد ہے کہ دو انگریز افسروں نے جو آخری دم تک دارا میں رہے' مجھے اٹھا کر سمندر میں پھینک دیا تھا...... پھر برٹش انرجی کے ملاحوں نے مجھے پانی سے نکالا اور کشتی پر سوار کر لیا۔

ہوش آیا تو میں نے اپنے آپ کو برٹش انرجی کے وسیع و عریض عرشے پر پڑے پایا۔ میرے کپڑے پانی میں تر تھے' البتہ کسی نیک دل آدمی نے میرے اوپر ایک موٹا کمبل ڈال دیا تھا۔ اس کے باوجود سردی سے میرا بدن سن ہو چکا تھا۔ میں نے سمندر کی طرف دیکھا جہاں کئی فرلانگ دور دارا تیزی سے جل رہا تھا۔ برٹش انرجی پر بھی ایک

ہنگامہ برپا تھا۔ اس کا عرشہ دارا سے نکلے ہوئے سینکڑوں بے آسرا مسافروں کی پناہ گاہ بنا ہوا تھا۔ عورتیں' بچے' بوڑھے' جوان اور ادھیڑ عمر مرد سبھی اپنے اپنے عزیزوں اور رشتے داروں کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ عورتیں روتی ہوئی ادھر سے ادھر دوڑ رہی تھیں۔ کئی عورتیں تو دیوانگی کے عالم میں اپنے ان شوہروں اور بچوں کو پکارتی پھرتی تھیں جو سمندر کی تہہ میں پہنچ چکے تھے' یا جل چکے تھے یا مچھلیوں کی خوراک بن چکے تھے۔ میں نے کئی معصوم اور کمسن بچے دیکھے جو حسرت بھری نگاہوں سے ایک ایک کا منہ تکتے' ان کے سہمے ہوئے چہرے اور کانپتے ہوئے بدن کبھی فراموش نہیں ہو سکتے۔ ایسے میں مجھے اپنی بیوی یاد آئی۔ آہ ...... کیا وہ صحیح سلامت یہاں آ گئی ہے یا پانی میں غرق ہو گئی؟ میں نقاہت کے باوجود فوراً اٹھا اور مسافرں کے درمیان امینی کو تلاش کرتا ہوا گھومنے لگا' لیکن وہاں میری جان پہچان کا کوئی شخص نہ تھا۔ لوبو فیملی کے کسی رکن کا پتہ نہ تھا۔ مسز جارج' ان کی بچیاں' ان کا بھائی راجرس اور امینی کا بھائی سبھی غائب تھے۔ میں اب پاگلوں کی طرح ادھر سے ادھر جھانک رہا تھا۔ گاہے گاہے آواز بھی دیتا جاتا' مگر وہاں تو ہر شخص پر یہی کیفیت طاری تھی۔ میری دل جوئی کون کرتا! وہاں تو بہت سے لوگ مجھ سے بھی زیادہ مظلوم تھے۔ ان لوگوں کو اس عالم میں پڑے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ سب زخمی ہیں اور ابھی ابھی میدان جنگ سے لائے گئے ہیں۔ برٹش انرجی کے عملے کا ہر آدمی پوری تن دہی اور سرگرمی سے ان "بدنصیب مہمانوں" کی خدمت گزاری میں مصروف تھا۔ جہاز پر جتنے بھی ڈاکٹر تھے' سب زخمیوں کی مرہم پٹی کر رہے تھے۔ باورچی بچے کھچے کھانے اور خشک غذا لوگوں میں تقسیم کر رہے تھے' انہوں نے سب کو ابلے ہوئے چاول اور گرم گرم چائے پلائی اور ان سب کو جہاز کے اندرونی کیبنوں میں پہنچا دیا۔

شام کے وقت میں بیٹھا اپنی بیوی کی یاد میں چپکے چپکے آنسو بہا رہا تھا کہ ایک ڈاکٹر میرے قریب سے گزرا۔ وہ سمجھ گیا کہ میرا کوئی عزیز حادثے میں ضائع ہو گیا ہے۔ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مشفقانہ انداز میں مجھے دلاسا دیا۔ میں نے اسے سارا

قصہ سنایا۔ پھر وہ کہنے لگا: ”شاید تم نے جہاز کے ہسپتال میں نہیں دیکھا۔ وہاں بہت سی عورتیں موجود ہیں۔ ممکن ہے ان ہی میں تمہاری گم شدہ بیوی بھی ہو۔“ امید کی ایک کرن میرے دل میں روشن ہوئی۔ میں نے ڈاکٹر کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کی رہنمائی میں جہاز کے ہسپتال میں پہنچا۔ وہاں عورتوں اور بچوں کے کراہنے اور رونے کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ ابھی میں دروازے میں کھڑا پریشان نظروں سے ادھر اُدھر دیکھ ہی رہا تھا کہ قریب سے ایک عورت دوڑتی ہوئی آئی اور مجھ سے لپٹ گئی..... ”امینی.....“ میں چیخا۔

”ہاں..... میں بالکل ٹھیک ہوں..... خدا کا شکر ہے کہ تم آ گئے..... میں تو اب صبر کر چکی تھی۔“

اسی روز 35 ہزار ٹن وزنی جنگی جہاز ”برٹش انرجی“ ان پناہ گزینوں کو لے کر بحرین کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ ہولناک سفر ختم ہوا۔ اس دوران میں برٹش انرجی کے افسروں اور عملے کے ارکان نے جس بہادری، ایثار، جرأت اور اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ کیا، وہ ہمیشہ یاد رہے گا۔

❀ ❀ ❀

لائیٹر

ہیلی کاپٹر بہت دیر سے ہمیں تلاش کر رہا تھا۔ اس کے اُڑنے کی آواز مسلسل ہمارے کانوں میں آ رہی تھی، لیکن کوشش کے باوجود جہاز ہمیں دکھائی نہیں دیا۔ نامعلوم وہ کس طرف پرواز کر رہا تھا۔ سورج آہستہ آہستہ پہاڑی کے عقب میں غروب ہو رہا تھا اور روشنی لحہ بہ لحہ مدھم پڑتی جا رہی تھی، تاہم ابھی اتنا اُجالا تھا کہ ہم گھنے درختوں کی شاخوں کے درمیان میں سے آسمان کو دیکھ سکتے تھے۔ ہم دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہے تھے کہ تاریکی نمودار ہونے سے پہلے ہی ہیلی کاپٹر کا عملہ اگر ہمیں دیکھ لے تو ہماری جانیں بچ سکتی ہیں۔ ورنہ..... یکایک میرے ساتھ ایڈ نے کہا: ”ذرا سُنتا..... ہیلی کاپٹر اِدھر ہی آ رہا ہے۔“

ہم نے اپنے کان اس آواز کی طرف لگا دیئے۔ ہیلی کاپٹر کی گھوں گھوں ہماری طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی، لیکن آہ..... سورج غروب ہو چکا تھا اور پہاڑی پر اتنا اندھیرا چھا گیا تھا کہ ہمیں تھوڑے فاصلے کا منظر بھی اچھی طرح نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایڈ نے جلدی سے سوکھی شاخیں جمع کیں، فالتو فلم میں سے ایک ٹکڑا پھاڑ کر ان شاخوں کے اوپر رکھا اور پھر ماچس کی آخری تیلی نکال کر اسے حسرت بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔

”میرے دوست، یہ آخری تیلی ہے۔ اگر آگ جل گئی تو ہیلی کاپٹر کو ہمارا سراغ مل جائے گا.....“

یہ کہہ کر اس نے کانپتے ہاتھوں سے تیلی رگڑ کر کاغذ سے لگا دی۔ آگ کا ننھا سا شعلہ ایک ثانیے کے لیے چمکا' کاغذ دھیرے دھیرے جل رہا تھا اور ہمیں امید تھی کہ سوکھی شاخیں آگ پکڑ لیں گی' لیکن دوسرے ہی لمحے سرد ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور آگ کا شعلہ بجھ گیا۔ ہماری آنکھوں کے آگے گھپ اندھیرا چھا گیا اور پھر ہم نے اپنے سروں کے عین اوپر ہیلی کاپٹر کی آواز سنی۔ فضا میں سردی لحہ بہ لحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ کپڑے نم آلود تھے اور بھوک کے مارے اتنی نقاہت ہم دونوں پر طاری تھی کہ حلق سے آواز بھی نہ نکلتی تھی۔ ہمیں یقین ہو گیا کہ اس ویران اور تاریک پہاڑی ہی پر ہم مر جائیں گے اور ہمیں بچانے کے لیے کوئی نہیں آئے گا۔ ہم پھٹی پھٹی نگاہوں سے ایک دوسرے کو تک رہے تھے۔

یکا یک ہم نے ہیلی کاپٹر کی آواز سنی' شاید وہ واپس آ رہا تھا۔ امید کی ایک ہلکی سی کرن ایک بار پھر نمودار ہوئی۔ عین اس وقت مجھے یاد آیا کہ میری جیب میں ایک سگریٹ لائیٹر بھی موجود ہے۔ یہ لائیٹر مجھے 36 گھنٹے پیشتر الپائن کی طرف آتے ہوئے ایک پگڈنڈی پر پڑا ہوا ملا تھا۔ لائیٹر نکال کر میں نے اسے جلانے کی کوشش کی اور بے تابی سے بار بار اس کا کھٹکا دبایا مگر اس میں سے کوئی ہلکا سا شعلہ تک نہ نکلا۔ ایڈ نے میرے ہاتھ سے لائیٹر چھین کر خود اسے جلانا چاہا مگر وہ بھی ناکام رہا۔ ہیلی کاپٹر اب پھر ہمارے سروں کے اوپر سے گزر رہا تھا' لیکن ہم اسے اپنی موجودگی سے کسی طرح باخبر نہ کر سکتے تھے۔ آہ......انسان کی مجبوری اور بے بسی۔

اب ہمیں ایک اور تاریک سرد رات ماؤنٹ سیمور کی چوٹی پر گزارنی تھی۔ ماؤنٹ سیمور برطانوی کولمبیا کا مشہور پہاڑ ہے۔ اس کی بلندی چار ہزار سات سو اٹھاون فٹ ہے اور اسی پہاڑ کے دامن میں برطانوی کولمبیا کا خوب صورت ترین شہر وینکوور آباد ہے۔ ماؤنٹ سیمور کی ڈھلوانوں پر سال کے بیشتر حصے میں برف جمی رہتی ہے۔

پہاڑ کی جنوبی ڈھلوان پر ایک جنگل ہے جس پر چڑھنا زیادہ آسان ہے۔ یہاں سے ایک پگڈنڈی پہاڑ کے اوپر تین ہزار فٹ کی بلندی تک جاتی ہے۔ سیاح اور برف پر پھسلنے والے شائقین اسی راستے سے پہاڑ پر آیا کرتے تھے۔ سیمور کی چوٹی تک پہنچنے کا بھی یہی ایک اچھا راستہ ہے۔ اس کے علاوہ تینوں سمتیں نہایت دشوار گزار اور خطرناک ہیں۔ اسی بناء پر اُدھر وہی لوگ جاتے تھے جنہیں کوہ پیمائی کی خاص مشق ہوتی تھی۔

1957ء کا ذکر ہے۔ ان دنوں میں' اور میرا ایک دوست ایڈ بلیک وینکوور میں تھے۔ ایڈ بلیک کسی اخبار کا فوٹو گرافر تھا۔ اس نے مجھ سے ذکر کیا کہ وہ کرسمس کارڈ کے لیے ایک فوٹو اُتارنا چاہتا ہے اور یہ فوٹو ماؤنٹ سیمور کی سب سے اونچی چوٹی سے اتارا جائے گا۔ اس نے مجھے بھی ساتھ چلنے کی دعوت دی اور کہا کہ یہ زیادہ مشکل کام نہیں ہے' بس چار پانچ گھنٹے لگیں گے۔ اچھی تفریح رہے گی۔

مجھے کوہ پیما ہونے کا تو دعویٰ نہیں' لیکن اتنا گیا گزرا بھی نہیں ہوں کہ ساڑھے چار ہزار فٹ اونچا پہاڑ سر نہ کر سکوں۔ میں نے اس کے ساتھ جانے کی ہامی بھر لی۔ مختصر سا ضروری سامان اور کھانے پینے کی معمولی سی چیزیں لے کر ہم اس مہم پر روانہ ہو گئے۔ اکتوبر کی 12 تاریخ تھی اور ہفتے کا دن تھا۔ ماؤنٹ سیمور کی تین چوٹیاں ہیں۔ ان میں سے پہلی چوٹی چار ہزار 150 فٹ کی بلندی پر ہے۔ اس چوٹی پر ہم بڑی آسانی سے اور بغیر کسی دقت کے پہنچ گئے۔ اس مقام پر ہم تھوڑی دیر کے لیے رُکے۔ مشرق کی طرف ڈھلوانوں پر سفید سفید برف دھوپ میں چمک رہی تھی۔ مطلع بالکل صاف تھا اور منزل مقصود قریب۔ اگرچہ ہم دونوں تھک چکے تھے لیکن آگے بڑھنے کا حوصلہ ابھی تازہ تھا۔ ہم نے دو دو سینڈوچ کھائے' تھرماس میں سے قہوہ نکال کر پیا اور کمر کس کر آگے بڑھے۔ دوسری چوٹی چار ہزار پانچ سو فٹ بلند تھی۔ اب ہم اس مخصوص راستے کو چھوڑ کر' جو عام لوگوں کے لیے تھا' سیدھے چوٹی کی طرف روانہ ہوئے' کیوں کہ ہم نے دیکھ

لیا تھا کہ مغرب کی طرف سے کالی کالی گھٹائیں آہستہ آہستہ پہاڑ کی طرف آ رہی ہیں اور اس سے پیشتر کہ گھٹا آسمان کو ڈھانپ لے اور بارش شروع ہو' ہم وہ مناظر اپنے کیمرے میں محفوظ کر لینا چاہتے تھے جن کے لیے ہم نے یہاں تک آنے کا پروگرام بنایا تھا۔ اسی راستے میں ایک مقام پر میں نے سگریٹ لائیٹر پڑا ہوا پایا اور میں نے سوچا تھا کہ اس کے بارے میں ایک چھوٹا سا اشتہار اخبار میں دے دوں گا تاکہ جس کا لائیٹر ہو اسے مل جائے۔

ایڈ بلیک ابھی چند تصویریں ہی اتارنے پایا تھا کہ آسمان پر بجلی کڑکنے لگی اور سرد ہوا طوفان کی شکل اختیار کر گئی۔ ہوا کے تھپیڑے پوری قوت سے آتے اور کوڑوں کی مانند ہمارے جسموں سے ٹکراتے ہوئے نکل جاتے۔ اس کے بعد بارش شروع ہو گئی اور چند ہی منٹ بعد ہمارا یہ حال تھا کہ کپڑے بارش میں بھیگ چکے تھے اور ہم سردی کے باعث تھر تھر کانپ رہے تھے۔ خدا کی پناہ' فضا میں کس قدر ٹھنڈ تھی۔ ہماری رگوں میں خون جمنے لگا تھا۔ اردگرد کا منظر سیاہ بادلوں کی وجہ سے ہماری نگاہوں کے سامنے سے غائب ہو چکا تھا اور ماؤنٹ سیمور کی سب سے اونچی چوٹی' جہاں ہمیں چڑھنا تھا' اب نظروں سے بالکل اوجھل ہو گئی تھی۔

''یہاں سے بھاگنا ہی پڑے گا۔'' ایڈ بلیک نے کپکپاتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آؤ' ادھر سے نیچے اُترتے ہیں تاکہ بارش کے تھپیڑوں سے تو نجات ملے۔''

مغرب کے رُخ پر ہم تیزی سے نیچے اترنے لگے۔ یہاں چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کے نیچے ہم پناہ لیتے رہے۔ ایڈ بلیک کو معلوم تھا کہ تھوڑی دور نیچے اتر کر وہی پگڈنڈی ہمیں مل جائے گی جس سے گزر کر ہم پہاڑ کی چوٹی پر پہنچے تھے۔ ابھی ہم بمشکل دو تین سو فٹ نیچے اترے ہوں گے کہ ایک عجیب مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔ بارش کے باعث پہاڑی ڈھلوانیں بہت ہی پھسلواں ہو گئی تھیں اور میرے پیروں میں جو جوتے تھے اُن

کے تلوں میں کیلیں لگی ہوئی تھیں۔ یہ میری حماقت تھی کہ ایسے جوتے پہن کر کوہ پیمائی کے لیے نکل کھڑا ہوا تھا۔ بار بار میرا پیر پتھروں پر رپٹتا اور ایک دفعہ تو میں سینکڑوں فٹ گہری کھائی گرتے گرتے بال بال بچا۔ بارش ہر آن تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی اور جب بادل گرجتا تو پہاڑ پر یوں محسوس ہوتا جیسے ہزار ہا توپیں بیک وقت چلا دی گئی ہیں۔ اس قدر شور برپا ہوتا کہ کانوں کے پردے پھٹے جاتے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے دائیں ٹخنے میں شدت کا درد ہونے لگا ہے۔ میں نے اپنے ساتھی سے کہا کہ ذرا آہستہ آہستہ نیچے اترو۔ ادھر بلیک کا بھی بُرا حال تھا۔ اس کے کپڑے بارش کے پانی سے تر تھے اور سردی سے ہونٹ نیلے پڑ گئے تھے۔ وہ کہنے لگا:

''وہ رہا سامنے جنگل۔ بس اب جلدی جلدی اتر چلو۔ پگڈنڈی کہیں قریب ہی ہو گی۔''

جنگل میں پہنچ کر ہم نے قدرے سکون محسوس کیا کیوں کہ گھنے درختوں نے ہمیں بارش کے پانی اور یخ بستہ طوفانی ہواؤں کے تھپیڑوں سے بچا لیا تھا۔ جنگل میں بے پناہ سکوت طاری تھا۔ پرندے شاید اپنے اپنے گھونسلوں میں چھپے بیٹھے تھے۔ ہماری کیفیت اس وقت بارش میں بھیگے ہوئے چوہوں سے کم نہ تھی۔ آسمان پر بادل پھر گھر گھر کر آ رہے تھے اور سورج نکلنے کا تو کوئی امکان نہیں تھا' اس تاریک پہاڑی جنگل میں راستہ تلاش کرنا آسان نہ تھا۔

ذرا ستا لینے کے بعد ہم پھر راستے کی تلاش میں بھٹکنے لگے۔ پھسلواں ڈھلانوں پر اترنا بچوں کا کھیل نہ تھا اور پھر اس طوفان باد و باراں میں تو موت سے کھیلنے کے مترادف تھا۔ گھڑی میں وقت دیکھا تو پتہ چلا کہ دوپہر سر پر آ گئی ہے۔ ہمیں گھر سے نکلے ہوئے چھ گھنٹے گزر چکے تھے۔ ہم جنوب کی طرف روانہ ہوئے۔ ادھر بھی جنگل نیچے کافی گہرائی میں پھیلتا چلا گیا تھا۔ بہت نیچے ہم نے دیکھا کہ جنگل میں ایک کیبن سا بنا ہوا ہے۔

ایڈبلیک کہنے لگا: یہ ضرور برف پر پھسلنے والے شائقین کا کیمپ ہوگا۔ بس ادھر ہی چلنا چاہیے۔ ہزار دقتوں اور صعوبتوں کے بعد جب ہم اس کیبن کے قریب پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ تو ایک بڑے سے درخت کا کٹا ہوا تنا ہے۔

اور اب پہلی مرتبہ ہمیں یہ احساس ہوا کہ ہم اس پہاڑی کی بھول بھلیوں میں گم ہوگئے ہیں۔ ہم پر دہشت طاری ہونے لگی۔ مجھے کئی ایسے واقعات یاد آنے لگے جو ماؤنٹ سیمور سے تعلق رکھتے تھے۔ ابھی پچھلے سال ہی ایک سیاح ان پہاڑی ڈھلوانوں میں مرا ہوا پایا گیا تھا۔ اس سے پہلے کئی پراسرار واقعات اور حادثات یہاں رونما ہو چکے تھے۔ ایک مرتبہ ایک کوہ پیما جاں کنی کی حالت میں پایا گیا۔ اسے ایک ہفتے کی مسلسل کوششوں کے بعد تلاش کیا گیا تھا۔ پھر مجھے ان قوی ہیکل پہاڑی بکروں کا خیال آیا جو ان چٹانوں کے اندر رہتے ہیں اور اگر ان سے سامنا ہو جائے تو ایک ہی ٹکر میں اپنے حریف کو تحت الثریٰ میں پہنچا دیتے ہیں۔

یہ خیالات ہمارے ذہن میں تیزی سے گردش کر رہے تھے۔ اگرچہ ہم نے ایک دوسرے سے کچھ نہیں کہا، مگر ہماری نگاہیں اور چہرے ان خیالات کی ترجمانی کر رہے تھے۔ قصہ مختصر تیسرے پہر کے قریب ہم نے وہ جنگل عبور کر لیا۔ بارش لگاتار ہو رہی تھی۔ کبھی ہلکی ہو جاتی اور کبھی تیز...... اور ہم یہ سوچ رہے تھے کہ اگر ایک رات بھی ہم اس ویران اور خطرناک مقام پر رُکے رہے تو صبح کسی سیاح کو ہماری لاشیں ملیں گی۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ لاشیں بھی نہ ملیں۔ ہمیں کسی کی ہماری تلاش میں آنے کی توقع نہیں تھی، کیوں کہ ہم چلتے وقت کسی کو بھی اپنا پروگرام بتا کر نہیں آئے تھے۔

یکایک میرے ساتھی نے انگلی سے ایک جانب اشارہ کیا۔ میں نے دیکھا کہ کئی سو فٹ نیچے دو چٹانوں کے درمیان ایک آبشار گر رہی ہے اور اس آبشار کے قریب ایک پُل بنا ہوا ہے۔ پل دیکھ کر ہمارے حوصلے بڑھے اور ہم بارش میں بھیگتے ہوئے اس

طرف چل دیئے۔ پُل کا مطلب یہ تھا کہ وہاں کوئی نہ کوئی شخص حفاظت کے لیے تیار رہتا ہے۔ پُل تک پہنچنے کے لیے ہمیں ایک اور اونچی چٹان کو عبور کرنا پڑا، اور جب بے شمار مشکلات کے بعد ہم اس آبشار کے دہانے تک پہنچے تو ہمیں ایک بار پھر ناقابل بیان حیرت اور مایوسی نے آ گھیرا۔

ہم پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس عجیب وغریب پُل کو دیکھ رہے تھے۔ بلاشبہ وہ ایک پُل تھا جو ان دونوں چٹانوں کے درمیان بہنے والے ایک چوڑے سے برساتی نالے کے اوپر بنا ہوا تھا۔ لیکن یہ پُل کسی انسان کا بنایا ہوا نہیں تھا، بلکہ قدرت کے نادیدہ ہاتھ نے اسے تعمیر کیا تھا۔ اس درخت کے موٹے تنے کی لمبائی کسی طرح بھی چالیس فٹ سے کم نہ تھی جو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کس حادثے کی بناء پر اس طرح اس نالے کے اوپر آن پڑا تھا کہ پُل کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ اس پر سے گزرنا، تاہم انتہائی خطرناک اور جان جوکھوں کا کام تھا اور ایسی حرکت وہی شخص کر سکتا تھا جو یا تو خبط الحواس ہو یا خودکشی کا ارادہ کر چکا ہو۔ مگر قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ ہم دو صحیح الدماغ انسانوں کو یہ پُل عبور کرنا پڑا۔ واپس جا کر اس پہاڑی پر دوبارہ چڑھنا ہماری طاقت سے باہر تھا۔ میرا یہ حال تھا کہ جب اس پُل کی طرف دیکھتا، بدن میں تھرتھری سی چھوٹنے لگتی تھی۔ پُل کے نیچے نالے کا سفید سفید پانی جھاگ اڑاتا پُرشور آواز کے ساتھ نہایت تیزی سے بہہ رہا تھا اور کوئی سو فٹ آگے یہ پانی ایک آبشار کی صورت اختیار کرتا ہوا ستر فٹ کی گہرائی میں گر رہا تھا۔

درخت کے اس تنے کا قطر سات یا آٹھ فٹ سے کم نہ ہوگا اور جس انداز میں یہ پہاڑی نالے کے اُوپر پڑا تھا، اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ قدرتی پُل بہت مدت سے یہاں بنا ہوا ہے، کیوں کہ امتدادِ زمانہ کے باعث اس کا رنگ سیاہ پڑ گیا تھا اور اس میں کہیں کہیں ٹوٹی ہوئی شاخوں کے نشانات نمایاں تھے۔ بارش کی وجہ سے درخت کا یہ تنا

گیلا تھا اور جب میں نے اسے ہاتھ لگایا تو میرا ہاتھ پھسلنے لگا اور یوں معلوم ہوا جیسے کسی نے اس پر چربی مل دی ہو۔ اگر پُل عبور کرنے کے دوران میں ہم میں سے کوئی پھسل جاتا تو اس کا زندہ بچ جانا ناممکن بات تھی' کیوں کہ نیچے پانی چٹانوں اور پتھروں سے ٹکراتا ہوا ستر فٹ کی ایک گہری کھائی میں گر رہا تھا۔

تاریکی اور بارش ہر لحہ بڑھتی جا رہی تھی اور ہم یہ سوچ رہے تھے کہ اگر پُل عبور نہ کیا تو رات کو کہیں بھی پناہ نہ مل سکے گی۔ خدا کا نام لے کر میں آگے بڑھا اور درخت کے تنے کو دونوں ہاتھوں سے مضبوط پکڑ کر اس پر بیٹھ گیا اور ایک ایک انچ کر کے آگے سرکنے لگا۔ میرے پیچھے میرا دوست ایڈ بلیک تھا۔ چند فٹ تک تو ہم دونوں آسانی سے اس تنے سے سرکتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ چالیس فٹ کا یہ تنا ہمیں اب صدیوں کی مسافت معلوم ہونے لگا۔ کبھی کبھی ہمارے وزن کے زور سے تنا ہلنے لگتا تو ہم دونوں اس سے چمٹ جاتے۔ نیچے پانی زور و شور سے اُچھل رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہمیں اپنی آغوش میں لینے کے لیے مضطرب ہے۔ ایک ایک انچ سرکتے ہوئے ہم پون گھنٹے میں صرف بیس فٹ کا فاصلہ طے کر پائے۔ یہ اتنی زبردست مشقت تھی کہ چند منٹ پہلے ہم پر سردی کا جو شدید احساس طاری تھا' وہ زائل ہو گیا' ہمارے جسم گرم ہو چکے تھے اور ہاتھوں کی ہتھیلیاں پسینے سے تر۔ پُل کے درمیان تک پہنچتے پہنچتے میری ہمت نے جواب دے دیا۔ میں جب بھی آگے بڑھنے کا اشارہ کرتا' درخت کا تنا آہستہ آہستہ ہچکولے کھانے لگتا اور ایک مرتبہ تو وہ اتنا زور سے ہلا کہ میرے حلق سے چیخ نکل گئی۔ اگر میں پوری قوت سے اپنا جسم اس کے ساتھ چمٹا نہ لیتا تو نالے میں میرا گر جانا یقینی تھا۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا میرا دوست ایڈ بلیک میرے عین پیچھے تھا اور غالباً اسی کے وزن سے درخت کا تنا ہلتا تھا۔ میں نے پکار کر کہا کہ وہ کوشش کر کے ذرا پیچھے ہٹے تاکہ توازن درست رہے اور میں آگے بڑھ جاؤں ورنہ ہماری جانیں دنیا کی کوئی طاقت نہیں بچا سکے گی۔

ایڈ بلیک نے کہا کہ وہ پیچھے کسی طرح نہیں ہٹ سکتا' کیوں کہ اس کی دونوں ہتھیلیاں بُری طرح چھِل گئی تھیں اور ان سے خون ٹپک رہا تھا۔ طوعاً و کرہاً میں نے ایک بار پھر اپنی پوری قوت جمع کر کے زور لگایا اور آگے سرکا۔ پُل لرزنے لگا مگر میں نے دل میں کہا: موت اسی طرح لکھی ہے تو مجھے کوئی نہیں بچا سکتا اور اگر وقت ابھی پورا نہیں ہوا تو پھر ڈرنے کا فائدہ؟ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس خیال نے مجھے کس قدر تقویت پہنچائی۔ وہی پُل جو تھوڑی دیر پہلے مجھے پُل صراط دکھائی دیتا تھا' اب اسے عبور کرنا بچوں کا ایک کھیل معلوم ہونے لگا اور میں پوری بے باکی کے ساتھ اور نتائج کی پروا کیے بغیر آگے بڑھتا رہا اور چند ہی منٹ میں میں دوسرے کنارے پر کھڑا ایڈ بلیک کی ہمت بندھا رہا تھا۔ ایڈ بلیک نے اس اثناء میں ایک بڑی ہی اچھی تدبیر سوچ لی تھی۔ مجھے جہاں اس کی حاضر دماغی پر رشک آیا وہاں اپنی بے وقوفی پر شرم بھی آئی کہ یہ معمولی سی بات میرے ذہن میں کیوں نہ آئی' اس نے اپنی کمر سے بندھا ہوا مضبوط رسّہ کھولا اور اسے لکڑی کے تنے سے ذرا ڈھیلا لپیٹ کر گرہ لگا دی......اس نے رسّے کا ایک سرا اپنی کمر سے بندھا رہنے دیا۔ اب وہ تنے پر سے پھسل بھی جائے تو جان جانے کا ڈر نہیں تھا۔ تنے سے بندھا ہوا رسّہ اسے بچا لینے کے لیے کافی تھا۔ رسے کا پھندا اس نے ڈھیلا اس لیے رکھا تا کہ جب وہ پُل پر رینگے تو پھندا بھی ساتھ ساتھ گھسٹتا چلا جائے۔ اس تدبیر پر عمل کرتے ہوئے چند ہی منٹ میں وہ بھی میرے پاس پہنچ گیا' لیکن اس حفاظتی تدبیر کے باوجود اس کا بُرا حال تھا۔ سردی اور خوف سے بے چارہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ بعد میں میں نے دیکھا کہ اس کی کمر پر سامان بھی میری نسبت کہیں زیادہ لدا ہوا تھا۔

بادلوں کی گھن گرج اور بجلی کی کڑک چمک بدستور جاری تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ طوفان نہ تھمنے کا تہیہ کر کے آیا ہے۔ ہم دونوں اب پناہ گاہ کی تلاش میں اس پہاڑی نالے کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگے۔ اندازاً ہم زمین سے $1\frac{1}{2}$ ہزار فٹ کی بلندی پر

تھے۔ چاروں طرف گہری تاریکی پھیلی ہوئی تھی اور ہم بجلی کی چمک کے رحم و کرم پر راستہ ڈھونڈتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ آخر ایک مختصر سی تنگ گھاٹی نے پناہ دی۔ یہاں ہمیں بارش اور ہوا کے ٹھنڈے تھپیڑوں سے نجات ملی۔ ہم نے اپنے واٹر پروف تھیلوں میں سے کپڑے نکالے اور گیلے کپڑے تبدیل کیے۔ تھرماسوں میں قہوہ ابھی تک گرم تھا بسکٹ' سینڈوچز اور گرم گرم قہوہ جب ہمارے معدوں میں پہنچا تو اوسان بحال ہوئے اور وہی حادثے جن سے گزر کر ہم یہاں تک پہنچے تھے' نہایت حقیر اور مضحکہ خیز معلوم ہونے لگے۔ کھانے پینے سے فارغ ہو کر ہم یہ سوچنے لگے کہ اپنے آپ کو گرم کس طرح کریں۔ جسم برف کی طرح سرد' ہاتھوں اور پیروں کی انگلیاں تو جیسے مفلوج ہو کر رہ گئی تھیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب سکڑ کر بیٹھ گئے۔ نامعلوم کتنی دیر اسی طرح بیٹھے رہے۔ سنا تھا کہ نیند سُولی پر بھی آ جاتی ہے۔ اس قول کی تصدیق اس بھیانک رات میں ہوئی۔ ہم سردی' بارش اور تاریکی سے بے نیاز ہو کر اونگھنے لگے۔ دفعتہً ایڈ بلیک کے منہ سے دلدوز چیخ نکلی اور وہ اچھل کر دور جا کھڑا ہوا۔ میں ایک لمحے کے لیے مبہوت ہو کر اندھیرے میں اس کی طرف تکنے لگا۔ اور اس سے پیشتر کہ میں اس سے پوچھوں' برف کی مانند کوئی سرد شے میرے جسم سے سرسراتی ہوئی گزر گئی۔ اب میرے اچھلنے کی باری تھی۔ خون منجمد کر دینے والا سرد پانی خدا جانے کدھر سے ایک سیلاب کی مانند اس گھاٹی میں داخل ہو رہا تھا۔ ہم نے جلد جلد جتنی چیزیں سمیٹ سکتے تھے' سمیٹیں اور وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ بعد میں پتہ چلا کہ ایڈ بلیک کا قیمتی کیمرہ اور میرے دستانے پانی کے ساتھ ہی بہہ گئے۔ پانی ایک بپھرے ہوئے اژدہے کی مانند منہ کھولے ہمیں نگلنے کے لیے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ اور ہم اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتے' لڑکھڑاتے' ایک دوسرے کو پکڑتے' سنبھالتے اندھا دھند دوڑ رہے تھے۔

"تم کدھر بھاگے جا رہے ہو؟ کسی کھڈ میں نہ جا گرنا۔" میں نے ایڈ بلیک سے کہا۔

"فکر نہ کرو...... میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔" وہ چلایا۔

وہ گھاٹی جسے ہم مختصر اور تنگ سمجھ رہے تھے' آگے چل کر کشادہ اور گہری ہوتی چلی جا رہی تھی۔ یہ بات میں نے بہت آگے جا کر محسوس کی۔ ہمارے پیچھے پانی کا شور صاف سنائی دے رہا تھا۔ ایڈ بلیک رکا اور کہنے لگا:

"جلدی کرو کسی بلند جگہ پر چڑھ جاؤ' ورنہ ہم دونوں اس گھاٹی میں غرق ہو جائیں گے۔" بجلی چمکی تو ہم نے اپنے آپ کو ایک ایسے نشیبی راستے میں گھرا ہوا پایا جس کے تینوں طرف تقریباً تیس تیس فٹ اونچی عمودی چٹانیں تھیں۔

"آہ...... آگے تو راستہ بند ہے۔" ایڈ بلیک چیخا۔ "اب یہاں ٹھہرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔"

"پاگل ہوئے ہو؟" میں نے کہا' "دیکھتے نہیں یہ ساری جگہ نشیبی ہے۔ پانی یہیں گرے گا۔ پہلے میں اس چٹان پر چڑھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ تم یہیں رُکو' رسّہ اپنی کمر سے باندھ لو۔"

میں نہیں جانتا کہ اندھیری اور طوفانی رات میں اس پھسلواں عمودی چٹان پر میں کس طرح چڑھ گیا۔ آج بھی یاد کرتا ہوں تو اپنے اس کارنامے پر انتہائی حیرت ہوتی ہے۔ ایک مدت کے بعد جب میں اپنے دو تین کوہ پیما دوستوں کے ہمراہ اس مقام پر گیا اور انہیں وہ چٹانیں دکھائیں تو وہ تعجب کرنے لگے کہ تم ان پر کس طرح چڑھ گئے تھے۔

میں ابھی چٹان پر پندرہ فٹ کی بلندی تک ہی پہنچا تھا کہ نیچے سے ایڈ بلیک کے چیخنے کی آواز آئی۔ پانی اس کے گھٹنوں گھٹنوں تک آ چکا تھا اور اُدھر میرا یہ حال تھا کہ بارش میں اتنی دیر تک بھیگنے سے چٹان کے نوکیلے پتھر ہاتھوں میں آ کر پھسل جاتے

تھے۔ دو دو تین تین انچ کی ٹکر پر پاؤں رکھ رکھ کر اوپر چڑھتا تھا۔ اندھیرے کا ایک فائدہ یہ ضرور ہوا کہ میں نیچے نہیں دیکھ سکتا تھا' ورنہ ضرور ہی خوف کھا کر نیچے گر پڑتا۔

یکا یک میرا ہاتھ چٹان کے قریب ایک نرم سی چیز سے ٹکرایا۔ میں نے اسے ٹٹول کر دیکھا تو وہ کسی درخت کی جڑ تھی جو چٹان کے اندر تک چلی گئی تھی۔ درخت کی اس جڑ کا یوں ملنا قدرت کا ایک بہت بڑا سہارا تھا۔ میں دو تین فٹ اور اوپر چڑھا تو درخت کی کئی جڑیں میرے ہاتھ میں آئیں۔ انہیں میں نے سختی سے پکڑ لیا اور اپنے ساتھی کو آواز دی کہ وہ چٹان پر چڑھنا شروع کر دے۔ بجلی ایک بار پھر زور سے چمکی تو میں نے گردن موڑ کر نیچے دیکھا۔ کھائی اب ایک تالاب کی شکل اختیار کر چکی تھی جس میں بارش کا پانی مسلسل جمع ہو رہا تھا اور میرا دوست کمر تک پانی میں ڈوب چکا تھا۔

آخر میرے ہمت دلانے پر اس نے چٹان پر چڑھنا شروع کیا۔ جسمانی اعتبار سے وہ مجھ سے کہیں زیادہ طاقت ور اور بھاری تھا۔ اس کا وزن پڑتے ہی مجھے ایک جھٹکا سا لگا اور قریب تھا کہ میرے ہاتھوں سے درخت کی جڑیں نکل جاتیں کہ ایڈ بلیک کو کہیں پاؤں اٹکانے کی جگہ مل گئی اور میری کمر پر پڑا ہوا بوجھ ہلکا ہو گیا۔

قصہ مختصر کوئی ڈیڑھ گھنٹے کی مشقت اور کمر توڑ جدو جہد کے بعد ہم دونوں اس چٹان کے آخری سرے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے اور جب ہم اوپر پہنچے تو سردی کے باوجود یہ حال تھا کہ ہمارے چہرے پسینے سے تر تھے اور جسم میں خون کی حدت محسوس ہو رہی تھی۔

تھکن اور نیند کے مارے ہم دونوں کا بُرا حال تھا۔ جان کنی کے لمحات بھی اس سے زیادہ اذیت ناک نہ ہوتے ہوں گے۔ پو پھٹنے تک ہم وہیں اسی چھوٹے سے درخت کے نیچے بیٹھے رہے جس نے ہماری جان بچائی تھی۔ بارش تھم گئی' بادل چھٹ گئے اور آسمان پر ننھے ننھے تارے حیرت سے ہمیں تکنے لگے۔ آخر وہ بھی ایک ایک کر کے

رخصت ہوئے۔ فضا میں خنکی بے حد تھی' لیکن ہم اس احساس سے قطعاً عاری تھے۔ شاید ہمارے جسم ہی بے حس ہو چکے تھے۔ نامعلوم ہم کتنی دیر اس چٹان پر پڑے سوئے رہے۔ آنکھ کھلی تو سورج پوری آب و تاب سے آسمان پر چمک رہا تھا۔ خوش قسمتی سے ایڈ بلیک کی گھڑی چل رہی تھی۔ وقت دیکھا تو نو بجے تھے۔ اب ہمیں بھوک ستانے لگی۔ پیاس بجھانے کے لیے وہیں درخت کے قریب ایک گڑھے میں بارش کا جمع شدہ پانی تھرماس کے ڈھکنے میں لے کر پیا اور راستے کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔

ماؤنٹ سیمور کی سب سے اونچی چوٹی نظر آتی تھی' لیکن اس سے چھوٹی دو چوٹیاں نظروں سے اوجھل تھیں۔ ہم بار بار حیرت سے ہر طرف دیکھتے کہ ہم کس جگہ آ گئے ہیں۔ وہ چوٹیاں کہاں غائب ہو گئیں یا ہم راستہ بھول کر بہت دور نکل آئے ہیں..... آخر یہ کیا اسرار ہے؟ ایڈ بلیک تو بہت ہی نادم اور پریشان تھا۔ بے چارہ بار بار کہتا کہ میں نے اپنے ساتھ تمہیں بھی مصیبت میں مبتلا کیا۔ گھر پر ہم کسی کو اپنے یہاں آنے کی خبر دے آتے تو کم از کم یہ امید تو ہوتی کہ کوئی ہمیں تلاش کرنے نکلے گا۔ مگر اب ایسا کریں کہ آگ جلائیں۔ ممکن ہے دھواں اٹھتا دیکھ کر کوئی ہماری مدد کو پہنچے۔

"لیکن اس موسم میں کسی کا یہاں آنا ناممکن ہے۔ ہیلی کاپٹر بھی یہاں کوئی نہیں لائے گا۔" ایڈ بلیک نے کہا' اور اگر آ بھی جائے تو ہمارا سراغ نہیں پا سکتا۔"

اب سوال یہ تھا کہ آگ روشن کس طرح کی جائے؟

دفعتہً مجھے یاد آیا کہ میرے تھیلے میں ماچس بکس ہے۔ ٹٹولا تو مل گیا۔ بکس کیا ملا جیسے جواہرات کا خزانہ مل گیا۔ ماچس کی چند تیلیوں کا یہ حقیر سا بکس ملنے سے دل کو ایسی تقویت پہنچی کہ سارا خوف دور ہو گیا۔ لیکن یہ بکس پانی میں بھیگنے کے باعث نم آلود ہو گیا تھا' چناں چہ اسے دھوپ میں رکھ کر ہم اس کے سوکھنے کا بے چینی سے انتظار کرنے لگے۔ بار بار اسے ہاتھ لگا کر دیکھتے اور پھر دھوپ میں رکھ دیتے۔ کوئی دو گھنٹے کے

تکلیف دہ انتظار کے بعد ماچس بکس سوکھ گیا اور ہم نے درختوں کے پتے اور شاخیں جمع کر کے انہیں سکھایا اور پھر آگ لگا دی۔ آگ کی گرمی نے ہمارے جسموں کو بھی تقویت پہنچائی اور سردی کا احساس زائل ہونے لگا۔ آگ میں سے دھواں نکالنے کے لیے ہمیں کبھی کبھی اس پر گیلے پتے ڈالنے پڑتے۔ سہ پہر تک ہم اسی طرح آگ جلاتے رہے اور دھواں بل کھاتا ہوا آسمان کی طرف اڑتا رہا' مگر کوئی ہماری مدد کو نہ آیا' حتیٰ کہ سورج پھر پہاڑی کے عقب میں غروب ہونے کی تیاریاں کرنے لگا...... بھوک کے مارے ہمارا بُرا حال تھا۔ قدم اٹھانا چاہتے تھے' مگر نہیں اٹھا سکتے تھے۔ سورج غروب ہوتے ہی فضا میں خنکی ایک دم بڑھ گئی۔ ہمارے پاس زائد کپڑے بھی نہیں تھے کہ گیلے کپڑوں سے چھٹکارا پا سکتے۔ ہم سردی سے تھر تھر کانپنے لگے۔

وہ رات ہم نے آگ جلا جلا کر گزاری۔ اگلے روز ہم وہاں سے چل پڑے' اس ارادے سے کہ شاید کھویا ہوا راستہ مل جائے۔ اس وقت اگر کوئی ہماری حالت دیکھتا تو اسے ہم پر ترس آتا۔ چہروں پر دو روز کی داڑھیاں' آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں' بال پریشان' کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے اور گیلے۔ جوتے کیچڑ میں لت پت۔ آہستہ آہستہ گرتے پڑتے' ستاتے اور دعائیں مانگتے ہم کئی میل دور نکل آئے' لیکن جدھر نگاہ جاتی تھی ایک ہولناک ویرانی اور سناٹا دکھائی دیتا تھا۔ خدا جانے یہ سلسلۂ کوہ کتنے میلوں میں پھیلا ہوا تھا۔ وہ پہاڑی بکرے بھی ہمیں کہیں نظر نہ آئے جن کے وحشیانہ پن کی سینکڑوں داستانیں ہم نے پیشہ ور شکاریوں سے سنی تھیں...... سورج سر پر آیا' پھر مغرب کی طرف جھکا اور آہستہ آہستہ اپنا چہرہ چھپانے لگا۔ تاریکی کے سائے ایک بار پھر ہمارے چاروں طرف پھیلنے لگے۔ زندگی سے بالکل مایوس ہو کر ہم ایک جگہ رُک گئے۔ ایڈ بلیک کہتا تھا کہ شاید ماؤنٹ سیمور کے جنوب میں ہیں اور سطح زمین سے کوئی تین ہزار فٹ بلند' کیوں کہ اس طرف چٹانوں پر برف جمی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔

نقاہت اتنی زیادہ تھی کہ ہم ایک دوسرے سے بمشکل بات کر سکتے تھے۔ بس مُردوں کی طرح پڑے تھے اور یہی وہ لمحہ تھا جب ہم نے آسمان پر ہیلی کاپٹر کی آواز سنی' لیکن ماچس کی آخری تیلی نے بھی دھوکا دیا اور سگریٹ لائیٹر نے کام کرنے سے انکار کر دیا۔ ہیلی کاپٹر جانے کے بعد ہم نے سوچا کیا ہماری گمشدگی کی اطلاع ہمارے گھر والوں نے پولیس کو دے دی ہے؟ یہ خیال آتے ہی امید کی ایک نئی کرن ہمارے دلوں میں روشن ہوئی۔ ہمیں اپنی بیویوں اور بچوں کا خیال آیا۔ ان کی افسردہ اور مایوس شکلیں نظروں کے سامنے گھومنے لگیں۔ وہ لوگ اس وقت کس قدر پریشان اور مضطرب ہوں گے۔ اس کا تصور ہی ہمارے لیے اذیت ناک تھا۔

ہمارا خیال تھا کہ ہیلی کاپٹر پھر آئے گا' لیکن ساری رات گزر گئی اور ہیلی کاپٹر نظر نہ آیا۔ ہم یہ سمجھنے لگے کہ ہیلی کاپٹر شاید کسی اور وجہ سے ادھر آیا ہوگا۔ کیا ہماری طرح کوئی اور بدنصیب بھی راستہ بھول گیا ہے؟ میں نے ایڈ بلیک سے کہا کہ یہاں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جانے سے تو یہ بہتر ہے کہ ہم راستہ تلاش کریں۔ ممکن ہے خدا ہماری مدد کی کوئی صورت پیدا کر دے۔

ہم دونوں اپنے دلوں میں ایک تازہ ولولہ لے کر اٹھے اور آگے بڑھے۔ اس وقت صبح کے آٹھ بجے تھے۔ مطلع صاف تھا' سورج کی سنہری کرنیں ماؤنٹ سیمور کی پیشانی پر بوسہ دے رہی تھیں۔ ہماری نظروں کے نیچے دو ہزار فٹ کی گہرائی میں کہیں وہ راستہ تھا جس کا نشان ہم اپنی حماقت سے کھو چکے تھے۔ اب سوال یہ تھا کہ ہم کس سمت میں جائیں۔ ہم نے خود کوئی فیصلہ کرنے سے بہتر یہ سمجھا کہ قدرت سے راہنمائی لی جائے۔ چناں چہ میں نے تھوڑی سی خشک مٹی اٹھائی اور ہوا میں اُچھال دی۔ اس کا رخ مشرق کی طرف تھا اور ہم خدا کا نام لے کر مشرق کی طرف اترنے لگے۔ چوبیس گھنٹے کے فاقے نے ہماری کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔ پھر سردی اور تھکن کا احساس کسی طرح دور نہ

ہوتا تھا۔ چلنے کو تو ہم چل پڑے لیکن فوراً ہی معلوم ہو گیا کہ چڑھائی کی نسبت اُترائی کا مرحلہ بہت ہی مشکل ہے۔ ذرا قدم ڈگمگایا اور جان گئی......اور پھر راستوں سے ناواقف آدمی کے لیے تو چپے چپے پر موت کھڑی ہوتی ہے۔ لیکن ہم تو یہ طے کر ہی چکے تھے کہ اگر موت اسی طرح لکھی ہے تو اسے کوئی نہیں ٹال سکتا اور اگر زندگی کے چند روز باقی ہیں تو پھر ہم گھر پہنچ جانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

ابھی ہم بمشکل دو سو فٹ ہی گئے تھے کہ ایک اونچی چٹان کے پیچھے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ ہم دونوں چونک کر ادھر تکنے لگے۔ اور معاً یہ خیال آیا کہ ضرور کوئی جماعت ہماری تلاش میں ادھر آئی ہے۔ چناں چہ میں نے نہایت نقاہت اور ضعف کے باوجود پوری قوت سے پکار کر کہا: "کون ہے؟" پہاڑیوں میں گونجتی ہوئی یہ آواز دور تک پھیلتی چلی گئی۔ چند لمحے تک ہم انتظار میں رہے کہ جواب آئے' مگر قدموں کی وہی بھاری آواز پھر سنائی دی۔ جیسے کوئی شخص چٹانوں پر دوڑ رہا ہو۔ ہمارے دل خوف سے دھک دھک کرنے لگے۔ "یہ کیا اسرار ہے؟" میں نے ایڈ بلیک سے کہا' اس چٹان کے پیچھے کوئی ذی روح ضرور موجود ہے۔ وہ کون ہے؟ آؤ ذرا دیکھیں۔"

"ٹھہرو......ادھر نہ جانا......مجھے یقین ہے کہ یہ ضرور کوئی پہاڑی بکرا ہے۔"

ابھی یہ الفاظ اس کی زبان سے نکلے ہی تھے کہ ہمارے عین سامنے کوئی بیس پچیس گز کے فاصلے پر ایک موٹا تازہ پہاڑی بکرا چٹان کے پیچھے سے نہایت وحشیانہ انداز میں کودتا اُچھلتا برآمد ہوا اور ہمیں دیکھتے ہی ٹھٹھک کر رک گیا۔ خدا کی پناہ! بکرا کیا تھا' پورا خچر معلوم ہوتا تھا۔ اس کا جسم بھدّا اور بال ہلکے بھورے تھے۔ گردن چھوٹی اور ٹانگیں لمبی لمبی تھیں۔ اس کی پیشانی کے کناروں پر اُگے ہوئے دونو کیلے سینگوں نے بکرے کی شکل نہایت ہی مکروہ اور کرخت بنا دی تھی۔ اپنے نتھنوں سے خرخر کی آواز نکال کر وہ آہستہ

آہستہ حملہ آور انداز میں ہماری جانب بڑھا۔ ہم ڈر کر پیچھے ہٹے۔ مجھے یاد آیا کہ میرا شکاری چاقو تھیلے میں موجود ہے۔ موت کو اتنا قریب دیکھ کر میری ساری نقاہت اور کمزوری یک لخت غائب ہو گئی۔ تھیلے میں سے لمبا چاقو نکال کر میں نے دائیں ہاتھ میں لیا اور ایڈ بلیک کو ایک طرف ہٹ جانے کا اشارہ کر کے بکرے کی طرف دیکھنے لگا۔ بکرا اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے مجھے گھور رہا تھا۔ پھر اس نے حریف کو مقابلے پر آمادہ پا کر زور سے اپنا ایک پاؤں چٹان پر پٹخا اور گردن جھکا کر پوری رفتار سے چھلانگیں مارتا ہوا میری طرف آیا۔ اس کا ارادہ مجھے ٹکر مارنے کا تھا۔ میں فوراً گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا اور پوری قوت سے چاقو بکرے کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ بکرے کے حلق سے ایک بھیانک چیخ نکلی' اور وہ پورے وزن کے ساتھ مجھ پر ڈھیر ہو گیا۔

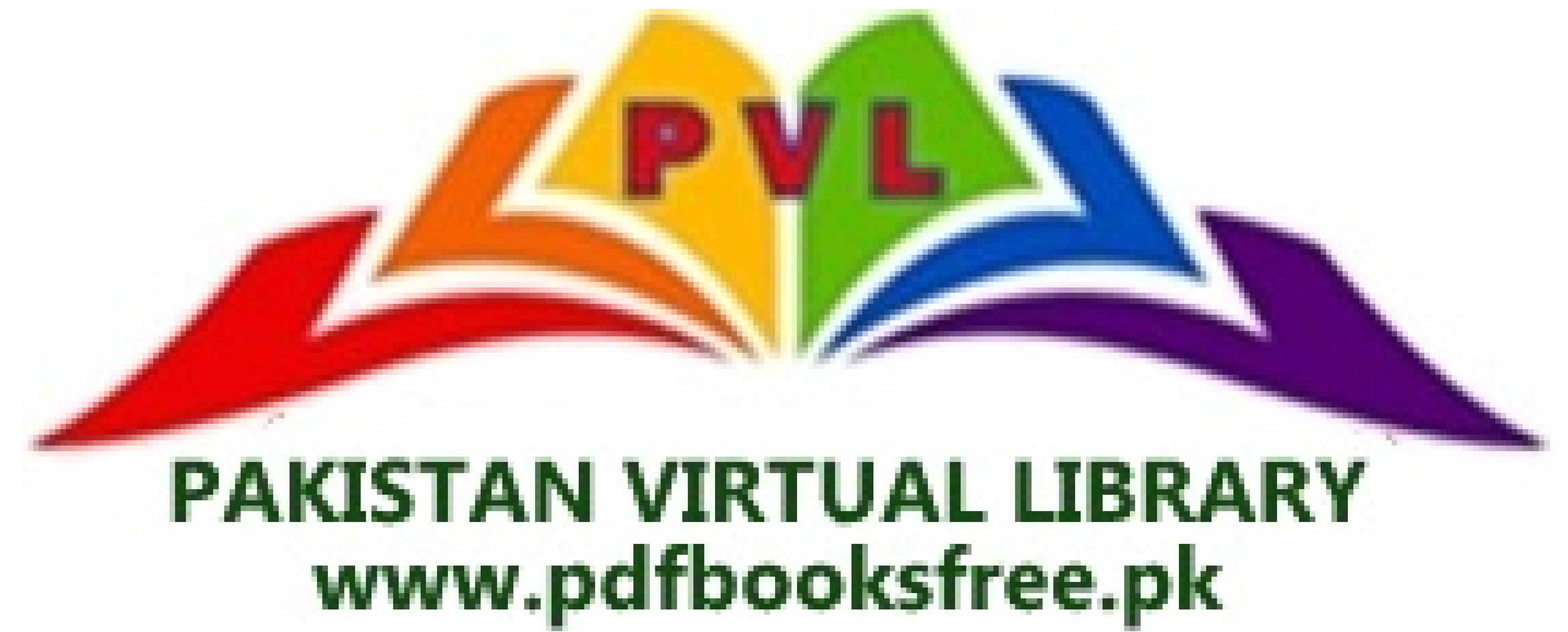
آنکھ کھلی تو میں نے اپنے آپ کو ایک آرام دہ بستر پر گرم کمبل میں لپٹا ہوا پایا۔ میرے قریب ہی ایڈ بلیک بھی بستر پر پڑا سو رہا تھا۔ ایک لحظے کے لیے میرا دماغ چکرایا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھانے لگا۔ میں سوچتا رہا کہ مجھے یہاں کون لایا؟ میں کہاں تھا؟ مجھے کیا ہو گیا تھا؟......پھر میں نے دیکھا کہ دو تین آدمی میرے پلنگ کے گرد کھڑے ہیں۔ ایک نے میری پیشانی پر ہاتھ رکھا اور دوسرے سے کچھ کہا۔ دو گھنٹے بعد جب مجھے اچھی طرح ہوش آیا تو پتہ چلا کہ ہم وینکوور کے ہسپتال میں پڑے ہیں۔ شکاریوں کی ایک ٹولی نے جو بکرے کا تعاقب کر رہی تھی' ہمیں ایک چٹان کے قریب بے ہوش پڑا ہوا پایا۔ پہاڑی بکرا مر چکا تھا اور ایڈ بلیک مجھے بکرے کے نیچے سے نکالنے کی کوشش میں خود بھی غش کھا گیا۔ اس حادثے کے پندرہ منٹ بعد ہی شکاری وہاں پہنچ گئے۔ اور ہمیں اپنے ساتھ لے گئے اور پھر انہوں نے سٹیشن ویگن کا انتظام کر کے ہمیں ہسپتال بھجوا دیا۔ اسی اثناء میں میرا ایک دوست مجھے دیکھنے کے لیے ہسپتال آیا تو وہ سگریٹ لائٹر میں نے اسے دکھایا جو مجھے پگڈنڈی کے قریب ملا تھا۔

”آہ!......یہ تو بہت ہی قیمتی لائیٹر ہے۔ تمہیں کہاں ملا......؟“

”ہوسکتا ہے کہ یہ قیمتی ہو۔ مگر اس نے وقت پر ہماری کوئی مدد نہ کی۔“ میں نے کہا......میرے دوست نے یوں ہی عادتاً لائیٹر جلانے کی کوشش کی تو پہلی ہی مرتبہ رگڑ کھانے پر اس میں سے ننھا سا شعلہ بھڑکا اور دیر تک جلتا رہا۔ میں نے حیرت سے ایڈ بلیک کی طرف دیکھا۔ وہ ہنس رہا تھا۔ پھر بولا:

”فکر نہ کرو میرے دوست......آئندہ کسی موقع پر یہ لائیٹر ضرور کام آئے گا۔“

* * *



سائبیریا میں

”انگریز جاسوس“ روسی فوجی افسر کرخت لہجے میں چلاّیا اور دوسرے سپاہیوں نے اپنی اپنی ٹامی گنیں میری جانب تان لیں۔ میرا کلیجہ اُچھل کر حلق میں آ گیا اور میں نے کوئی مزاحمت کیے بغیر ہاتھ اوپر اٹھا دیئے۔ روسی افسر نے اپنی رائفل سے جھاڑیوں کی طرف اشارہ کیا۔ ایک سپاہی نے آگے بڑھ کر مجھے زور سے دھکا دے کر ادھر جانے کا حکم دیا اور دوسرے نے میرے ہاتھ سے سوٹ کیس چھین لیا۔ انہوں نے مجھے ایک درخت کے ساتھ کھڑا کر دیا اور رائفل کی نال میرے سر سے لگا کر اپنے افسر کے حکم کا انتظار کرنے لگے۔

”اس کی اچھی طرح تلاشی لو۔“ حکم ملا۔ سپاہیوں نے فوراً مجھے برہنہ کر دیا اور میرے کپڑوں کی اچھی طرح چھان بین کی۔ خدا کا شکر ہے کہ میرے پاس سوائے ایک شکاری چاقو کے اور کچھ نہ تھا جو ایک سپاہی نے اپنے افسر اعلیٰ کو دے دیا۔ اس کے بعد انہوں نے مجھے دوبارہ کپڑے پہننے کی اجازت دے دی' تاہم ان کی رائفلیں اب بھی میری جانب اٹھی ہوئی تھیں۔

”سچ بتاؤ تم غیر قانونی طور پر جرمنی میں کیوں آئے؟“

”میں اپنی منگیتر سے ملنے آیا ہوں۔“

"تم نے روس کا ویزا کیوں نہیں لیا؟"

"مجھے اس کا موقع نہیں ملا' کیوں کہ میں مغربی جرمنی میں بلا پرمٹ آیا تھا۔"

"تم جھوٹ بولتے ہو۔" افسر نے غصے سے سرخ ہو کر کہا۔ "تم انگریز جاسوس ہو۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔"

میں خاموش رہا' کیوں کہ جانتا تھا کہ اگر ان سر پھرے فوجیوں سے بحث کی' تو یہ مجھے کُتے کی موت مار ڈالیں گے۔ واقعہ یہ تھا کہ میں نے دوسری جنگ عظیم کے دوران میں برطانوی سپاہی کی حیثیت سے شرکت کی تھی اور ترقی کرتے کرتے میجر کے عہدے تک پہنچا تھا۔ میں بارہا امریکی جاسوسوں کے ساتھ مل کر نازی جرمنی گیا تھا اور اپنی حکومت کے لیے جاسوسی کے خطرناک ترین فرائض سرانجام دیئے تھے اور ایک مرتبہ بھی پکڑا نہیں گیا۔ جنگ ختم ہونے کے بعد میں جرمنی سے واپس انگلستان گیا اور موٹر کار بنانے والی ایک کمپنی میں ملازمت حاصل کر لی۔ جنگ کے دوران' جب کہ میں جرمنی میں قیام پذیر تھا' مجھے ایک لڑکی سے محبت ہوگئی اور میں نے اس سے شادی کرنے کا عہد کیا تھا اور میں اس عہد کو نبھانے کے لیے ناجائز طور پر دوبارہ مشرقی جرمنی میں داخل ہوا جو روس کے قبضے میں آ چکا تھا' لیکن اس مرتبہ قسمت نے دھوکا دیا اور نہ جانے ان لوگوں کو کیسے شک ہو گیا کہ میں جاسوس ہوں' حالاں کہ میرے پاس کوئی ایسی شے نہ تھی۔ جرمن بالکل اہل زبان کی طرح بولتا تھا اور مجھے اس پر فخر تھا کہ میں جرمن زبان پر عبور حاصل کر چکا ہوں۔ انہوں نے میرا برطانوی پاسپورٹ بھی چھین لیا جس پر میرا نام اور پتہ درج تھا۔

روسی سپاہی مجھے قریب ہی ایک چوکی پر لے گئے جہاں مجھے اعلیٰ افسروں کی ایک جماعت کے سامنے پیش کیا گیا۔ ان کم بختوں نے رات گیارہ بجے تک مختلف قسم کے سوالات کر کر کے میرا ناطقہ بند کر دیا' لیکن میں نے جو بیان پہلے دیا تھا' وہی دہراتا رہا

اور اس سے سرمو انحراف نہ کیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان افسروں اور سپاہیوں میں سے کوئی بھی انگریزی اور جرمن زبان سے پوری طرح واقف نہ تھا۔ وہ صرف چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ بولنے پر قادر تھے۔ تنگ آ کر انہوں نے مجھے ایک کوٹھڑی کے اندر بند کر دیا جہاں صرف ایک چارپائی پڑی تھی۔ صبح نو بجے مجھے ایک سپاہی نے آ کر جگایا اور اپنے ساتھ چوکی کے بڑے کمرے میں لے گیا جہاں ایک روسی میجر اور ایک کیپٹن میرا بیان لینے آئے تھے۔ ان کے ساتھ ایک عورت بھی تھی جسے ترجمانی کے فرائض ادا کرنے تھے۔

میجر نے مجھے خونخوار نظروں سے دیکھا اور میز کی دراز میں سے میرا پاسپورٹ نکال کر اس پر لگی ہوئی تصویر سے مجھے شناخت کیا۔ پھر اس نے ترجمان خاتون کی معرفت مجھ سے پوچھا:

"تم اپنی حکومت کی اجازت کے بغیر ہمارے علاقے میں ناجائز طور پر کیوں داخل ہوئے؟"

"جناب' یہ میرا پاسپورٹ اس بات کی ضمانت ہے کہ میری حکومت نے مجھے یہاں آنے کی اجازت دی ہے۔" میں نے مودبانہ انداز میں جواب دیا۔ "اس پاسپورٹ کے ذریعے میں دنیا کے ہر ملک میں اپنی مرضی سے جا سکتا ہوں۔"

میرے اس احمقانہ جواب پر وہ مسکرایا اور بولا:

"تم ہمیں بے وقوف بنانے کی کوشش مت کرو۔ ہم جانتے ہیں کہ تم اپنی حکومت کے ایک ایجنٹ ہو۔ یہ پاسپورٹ' جس کے ساتھ تمہاری وزارت خارجہ کا مخصوص اجازت نامہ بھی منسلک ہے' عام شہریوں کو کبھی جاری نہیں کیا جاتا۔ بتاؤ تمہارے پاس اس کا کیا جواب ہے؟"

میں لاجواب ہو کر چپ رہا۔ میجر نے اب ایک نقشہ نکال کر میرے سامنے پھیلا

دیا۔ یہ نقشہ انہوں نے میرے سوٹ کیس میں سے برآمد کیا تھا۔ یہ یورپ کا ایک ایسا نقشہ تھا جو دنیا بھر میں سٹیشنری کی ہر دکان پر مل جاتا تھا۔اس میں کوئی خاص بات نہ تھی۔میجر نے مجھ سے پوچھا:

''تم نے یہ نقشہ اپنے سوٹ کیس میں کس لیے چھپایا؟''

''جناب' میں نے اسے ہرگز نہیں چھپایا اور اس میں چھپانے والی بات ہی کون سی ہے۔میں ایک سیاح کی حیثیت سے یہاں آیا ہوں اور جرمنی چوں کہ یورپ میں ہے' اس لیے میں نے اپنی سہولت کے لیے یہ نقشہ اپنے پاس رکھ لیا تھا۔''

''بکواس بند کرو۔'' میجر طیش میں آ کر دھاڑا۔''ہم اتنے نادان نہیں کہ تمہاری اس چالبازی کو سمجھ نہ سکیں۔ارے بے وقوف' کوئی جاسوس غیر ملک میں سرکاری نقشہ لے کر نہیں آیا کرتا' سبھی جاسوس ایسے معمولی نقشے لیے پھرتے ہیں تاکہ کوئی شک نہ کرے۔تم اپنے آپ کو برطانوی شہری کہتے ہو اور آٹو موبائل ایسوسی ایشن میں کام کرتے ہو جیسا کہ تمہارے کاغذات ظاہر کرتے ہیں' لیکن یہ سب کچھ فراڈ ہے۔تم برطانیہ کی سیکرٹ سروس سے تعلق رکھتے ہو۔ابھی تم سب کچھ بکو گے۔بہرحال پہلے یہ بتاؤ کہ مغربی جرمنی میں برطانیہ کے جو فوجی اڈے قائم ہیں' ان کی پوزیشن کیا ہے؟

میں نے سوچا کہ خاموش رہنا ٹھیک نہیں' مزید جھوٹ بول کر انہیں بے وقوف بنانا بہتر ہے۔پس میں نے کہا:

''برطانیہ کا سب سے بڑا فوجی اڈہ ہینوور میں ہے جہاں دس ٹینک ڈویژن موجود ہیں۔''

''ناممکن......قطعی ناممکن......تم جھوٹ بول رہے ہو۔'' میجر کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔''بہرحال بولے جاؤ۔''

اب میں نے اُسے ہینوور کے اڈے کے بارے میں تفصیل سے ساری معلومات

بتائیں جو سراسر جھوٹ تھیں۔خاتون ترجمان نے میرے الفاظ کا روسی زبان میں ترجمہ کیا۔میجر غور سے سنتا رہا۔کئی بار اس نے گردن ہلائی۔پھر بولا:

''بہت خوب......اب تم مجھے اپنی ملٹری سروس کے بارے میں کچھ بتاؤ۔میں ایک ذمے دار روسی افسر کی حیثیت سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تمہاری بیان کردہ اطلاعات درست پائی گئیں' تو تمہیں فوراً رہا کر دیا جائے گا۔ہاں اب شروع ہو جاؤ۔''

میں نے اس پر مزید اعتماد بٹھانے کے لیے کہا:

''جناب' یقین کیجیے کہ میں نے اب تک جو معلومات آپ کو دی ہیں' انہی کی بنیاد پر مجھے انگلینڈ پہنچتے ہی شوٹ کر دیا جائے گا' اس لیے میری جان بخشی کر دیں' تو اچھا ہے۔''

''گھبراؤ مت۔'' میجر نے نرم لہجے میں کہا' ''ہم تمہارا بیان خفیہ رکھیں گے اور تمہاری حکومت تک اس کے بارے میں کوئی خبر پہنچنے نہ پائے گی' اس لیے تم پورے اطمینان سے ساری بات بتا دو تم برطانوی فوج میں کیا کام کرتے ہو؟''

''میرا کام دہشت پسند گروہ کے ساتھ مل کر تخریبی کارروائیاں کرنا ہے' مثلاً: جرمن فوجی ٹرینوں کو بم سے اڑانا......ہوائی جہاز تباہ کرنا......اور آہنی سیف وغیرہ توڑنا......''

میجر نے میز پر گھونسا مارا۔''آہ......مجھے پہلے ہی شبہ تھا کہ تم اس گروہ کے رکن ہو جس نے فرانس میں ملٹری سیف توڑ کر خفیہ دستاویزیں نکال لی تھیں۔تمہارا کیس معمولی نوعیت کا نہیں۔تمہیں اب اعلیٰ حکام کے سامنے بیان دینا ہوگا۔''

اس نے قلم اٹھایا اور کاغذ پر تیزی سے کچھ لکھنے لگا۔اس کے بعد اس نے مجھے ایک گارڈ کے حوالے کیا جو مجھے اسی کوٹھڑی میں لے گیا اور اندر بند کر کے باہر سے تالا ڈال دیا گیا۔دوسرے روز سوائے ایک اردلی کے جو میرے لیے کھانا لایا' میں نے کسی اور شخص کو نہیں دیکھا۔میں سوچ رہا تھا کہ نہ جانے اب مجھ سے کیا سلوک کیا جائے گا اور وہ کون سے اعلیٰ حکام ہوں گے جو میرا بیان لیں گے۔

جب رات بھیگ گئی اور میں سونے کے لیے اسی کھری چار پائی پر دراز ہونے والا تھا کہ کوٹھڑی کا دروازہ کھلا اور ایک روسی لیفٹیننٹ اندر آیا اور مجھے باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ رات کے اس سناٹے میں اس سرحدی چوکی کے باہر ایک جیپ کھڑی تھی جس میں ڈرائیور کے علاوہ دو مسلح سپاہی بھی تھے۔ لیفٹیننٹ نے مجھے جیپ میں بٹھایا اور خود بھی میرے قریب بیٹھ گیا اور ہم ایک نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔

میں نے فوجی افسر سے پوچھا کہ مجھے کہاں لے جایا جا رہا ہے' تو اس نے کرخت لہجے میں کہا: ''چپ بیٹھے رہو' بولنے کی اجازت نہیں۔'' میں سہم کر خاموش ہو گیا۔ دو گھنٹے تک جیپ ایک سنسان اور تنگ سڑک پر دوڑتی رہی جس کے دونوں جانب تاریک جنگل تھا۔ ٹھیک دو بجے ہم ایک مقام پر پہنچے جہاں ایک بڑی سی عمارت کے صدر دروازے پر جیپ روک دی گئی۔ معلوم ہوا کہ یہ مقام ''ریڈاوکس'' کا جیل خانہ ہے۔

جیلر نے خونخوار نگاہوں سے میرا استقبال کیا اور مجھے اپنے ساتھ عمارت کے اندر لے گیا جہاں بہت سی کوٹھڑیاں دو رویہ بنی ہوئی تھیں۔ کوٹھڑی نمبر 78 کے آگے وہ رُکا۔ اس نے آہنی دروازہ کھولا اور اس سے پیشتر کہ وہ مجھے دھکا دے' میں خود ہی کوٹھڑی میں چلا گیا۔ اندھیرا اتنا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ جیلر جب دروازہ بند کر کے جا چکا' تو میں نے ٹٹول کر دیکھا' وہاں کوئی چار پائی نہ تھی۔ فرش پر صرف ایک چٹائی بچھی تھی' ایک کونے میں چھوٹی سی ٹیبل پڑی تھی اور دوسرے گوشے میں حوائج ضروری سے فارغ ہونے کے لیے لوہے کا ایک گندہ کموڈ پڑا تھا۔ گندہ میں نے اس لیے کہا کہ جب میں اس کے قریب گیا' تو اس میں سے بدبو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ دروازے کے علاوہ اس کوٹھڑی میں دو فٹ اونچی اور دو فٹ چوڑی ایک کھڑکی تھی جس میں لوہے کی موٹی سلاخیں لگی تھیں۔ میں نے چٹائی کو کموڈ سے دور گھسیٹ کر اس پر اپنا اوور کوٹ بچھا دیا اور ٹانگیں سکیڑ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ اس جیل خانے کے اندر میرے علاوہ اور بھی بہت سے بدنصیب

قیدی جمع تھے جن کی کوٹھڑیوں سے مختلف آوازیں میرے کانوں میں پہنچ رہی تھیں۔ جرمن' روسی' فرانچ اور انگریزی کی ملی جلی آوازیں اس طرح بلند ہو رہی تھیں کہ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔

جب آنکھ کھلی' دن کا اُجالا پھیل چکا تھا۔ اگرچہ میری نیند پوری نہیں ہوئی تھی اور میں کچھ دیر اور سونا چاہتا تھا کہ کسی نے میری کوٹھڑی کے دروازے میں منہ ڈال کر جرمن زبان میں زور سے کہا:

''چھ بج گئے ہیں' سات بجے تک ناشتے کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

''میں نے حکم کی تعمیل کی۔ معلوم ہوا کہ قیدیوں کو بیدار کرنے اور ناشتے کا اہتمام ایک سارجنٹ کے سپرد ہے جو نہایت لمبا تڑنگا اور قوی ہیکل آدمی تھا۔ چند منٹ بعد جب وہ گشت مکمل کر کے دوبارہ میری کوٹھڑی کے آگے سے گزرا' تو میں نے اُس سے رُکنے کو کہا:

''کیا چاہتے ہو؟ اس نے بے صبری سے پوچھا:

''میں نہانا اور شیو بنانا چاہتا ہوں۔''

''اونہہ.....'' اس نے نہایت بیزاری سے کہا۔ ''میں تمہاری یہ خواہش افسرانِ بالا تک پہنچا دوں گا۔ اس کے بعد وہاں سے جو ہدایات ملیں گی' ان پر تمہیں عمل کرنا ہوگا۔'' مزید بات کیے بغیر وہ جا چکا تھا۔

ٹھیک سات بجے ''ناشتہ'' میرے پاس پہنچا دیا گیا۔ ایک بھدے سے چینی کے پیالے میں گرم گرم قہوہ اور پلیٹ میں اُبلے ہوئے نمکین چاول دروازے میں سے ایک سپاہی نے مجھے تھما دیے۔ ناشتے کے بعد میں پھر چٹائی پر لیٹ گیا اور اونگھنے لگا۔ ٹھیک دو بجے میرا دروازہ کسی نے کھٹکھٹایا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ وہی سارجنٹ باہر کھڑا تالا کھول رہا ہے۔ اس نے مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ مجھے عمارت کے ایک وسیع و عریض کمرے

میں لے گیا جہاں تین نوجوان جرمن لڑکیاں پانی کے ٹب میں قیدیوں کے کپڑے دھو رہی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ یہ کمرہ بیک وقت غسل خانے اور باورچی خانے کا کام دے رہا ہے۔ سارجنٹ نے ایک الماری سے ریزر اور آئینہ نکال کر میرے حوالے کیا اور لڑکیوں سے کہا:

"اس شخص کے لیے غسل کا انتظام کر دیا جائے۔"

یہ کہہ کر اس نے دروازہ بند کیا اور چلا گیا۔ لڑکیاں چند لمحے تک مجھے حیرت سے دیکھتی رہیں۔ پھر ان میں سے ایک نے جرمن زبان میں کہا: "کیا تم بھی سیاسی قیدی ہو؟ تم نے کیا جرم کیا ہے؟"

میں نے خیال کیا کہ لڑکیاں مجھے جرمن سمجھ رہی ہیں' اس لیے میں نے کہا:

"میں برطانیہ کا باشندہ ہوں اور یہ لوگ مجھے جاسوسی کے الزام میں پکڑ کر لائے ہیں۔"

لڑکیوں کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور وہ اتنی خوف زدہ ہوئیں کہ میری سر توڑ کوشش کے باوجود کسی نے ایک حرف زبان سے نہ نکالا۔ میں دراصل ان سے اس جیل خانے کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا' لیکن بُرا ہو اس حماقت کا کہ میں نے پہلے ہی اپنے انگریز ہونے کا اعلان کر دیا۔ اب وہ منہ کیسے کھولتیں؟ انہوں نے میرے لیے ایک اور ٹب بھرا اور صابن دے کر اپنے اپنے کام میں مصروف ہو گئیں۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی ہیں اور کافی خوفزدہ ہیں۔ میں نے جب اپنے کپڑے اتارے اور بالکل برہنہ ہو گیا' تب بھی وہ اسی کمرے میں موجود رہیں۔ شاید انہیں باہر جانے کا حکم نہ تھا۔

میں نے جلدی جلدی شیو بنائی اور غسل سے فارغ ہو کر کپڑے پہن رہا تھا کہ وہی کم بخت سارجنٹ ہاتھ میں رائفل لیے نمودار ہوا اور مجھے کوٹھڑی میں لے جا کر بند کر

دیا۔ میرا خیال تھا کہ جلد ہی مجھے پوچھ گچھ کے لیے بلایا جائے گا' لیکن آٹھ روز گزر گئے۔ اب قید تنہائی مجھ پر نا قابل برداشت عذاب کی مانند مسلط تھی۔ پینے کے لیے وہی قہوہ اور کھانے کے لیے اُبلے ہوئے نمکین چاول کے سوا مجھے کچھ نہ دیا گیا۔ بارہا میں نے سارجنٹ سے شکایت کی کہ ان چاولوں سے جی اُکتا گیا ہے' لیکن وہ نفرت سے منہ پھیر کر اپنا ڈنڈا گھماتا ہوا دوسری جانب نکل جاتا۔

نویں روز دوپہر کے وقت مجھے کوٹھڑی سے نکال کر ایک چھوٹے سے کمرے میں لے جایا گیا جہاں ترجمان لڑکی اور ایک فوجی افسر میرا منتظر تھا۔ گفتگو کا آغاز ہوا:

"تم ہمارے علاقے میں کس لیے آئے ہو؟"

"میں پہلے بتا چکا ہوں کہ اپنی منگیتر سے شادی کرنے آیا ہوں۔"

"شادی کے بعد تمہارا کیا پروگرام تھا؟"

"یہی کہ میں مشرقی یا مغربی برلن میں آباد ہونے کی درخواست کرتا۔"

"خوب...... گویا تم اب بھی سچ بولنا نہیں چاہتے۔ ہم ابھی تک تمہارے ساتھ نرمی سے پیش آ رہے ہیں۔ تم جتنی جلد حقیقت اُگل دو گے' اتنا ہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔ ہمارے پاس تمہارے منہ کو کھلوانے کے لیے بے شمار طریقے ہیں۔ کیا تم ہمیں یہ طریقے آزمانے پر مجبور کر رہے ہو؟"

"میں نے جو کچھ بتایا ہے' وہ قطعی درست ہے۔ اگر آپ نہیں مانتے' تو اس کا میرے پاس کوئی علاج نہیں۔"

چند منٹ تک کمرے میں گہری خاموشی رہی۔ پھر میجر نے ٹیلی فون اٹھایا اور روسی زبان میں کچھ کہا۔ فوراً ہی ایک اردلی آیا اور مجھے کمرے سے باہر لے گیا۔

مزید دس روز تک میں اپنی کوٹھڑی میں بند رہا۔ اس دوران میں میری خوراک نصف کر دی گئی' قہوہ بند کر دیا گیا اور 24 گھنٹوں میں پینے کے لیے پانی کا صرف ایک

پیالہ دیا جاتا۔ گیارہویں روز جب میں اپنے اندر انتہائی جسمانی نقاہت محسوس کر رہا تھا' مجھے پھر اسی افسر کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس نے وہی سوال کیے جن کے رٹے رٹائے جواب میرے پاس موجود تھے۔ غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے کھڑے ہو کر فیصلہ کن انداز میں کہا:

''بہت اچھا' تم یوں نہ مانو گے۔ میرے دوست! ہم تمہیں جان سے نہیں ماریں گے' لیکن اس کے باوجود تم اقبال جرم کرنے پر رضامند ہو جاؤ گے۔ تم نے سنا ہو گا کہ جاپانی اور چینی لوگ اپنے قیدیوں پر تشدد کرنے میں کتنے مشہور ہیں' مگر اب تم جاپانیوں اور چینیوں کو بھی بھول جاؤ گے۔ تمہارا واسطہ دنیا کی اس قوم سے ہے جس کے سامنے دنیا کا کوئی کام ناممکن نہیں۔''

17 اگست 1950ء کی صبح کو مجھے ہتھکڑی اور بیڑی پہنا کر ریڈاوکس سے نکال کر ایک پرائیویٹ کار میں بٹھایا گیا اور برلن کے مشرقی حصے میں بھیجا گیا جہاں لچن برگ کا جیل خانہ میرا منتظر تھا۔ اس جیل خانے کے بارے میں مَیں نے پہلے ہی سے لرزہ خیز کہانیاں سُن رکھی تھیں۔ یہاں جاسوسوں کو ہلاک کرنے کے سوا ہر وہ ممکن اذیت دی جاتی ہے جس کا تصور انسانی ذہن میں آ سکتا ہے۔ لچن برگ کے منتظم نے سب سے پہلے میرے کپڑے اُتروا کر تلاشی لی اور مطمئن ہو کر مجھے 21 نمبر کی کوٹھڑی میں بھیج دیا۔ ریڈاوکس کے جیل خانے کی نسبت یہ کوٹھڑی زیادہ کشادہ تھی اور یہاں چارپائی پر ایک نرم گدیلا بھی بچھا تھا۔ دروازے میں ایک چھوٹا سا بلب بھی لگا تھا جو ہر وقت جلتا رہتا تھا۔ کوٹھڑی میں داخل ہوتے ہی میں بستر پر گرا اور بے خبر سو گیا' لیکن پانچ منٹ بعد ہی ایک فوجی سپاہی نے آ کر مجھے جھنجھوڑا۔ تھکن' فاقہ کشی اور نیند کے باعث میں اس وقت اپنے آپے میں نہ تھا۔ ایک چلتی پھرتی لاش کی مانند میں اس سپاہی کے ساتھ لڑکھڑاتا اور ڈگمگاتا چلا۔ وہ مجھے ایک کمرے میں لے گیا جہاں انگریزی کے حرف T کی شکل کی میز

کے پیچھے چار فوجی افسر بیٹھے تھے۔ میرے پہنچتے ہی انہوں نے جرمن اور انگریزی زبانوں میں سوالات کی بوچھاڑ کر دی اور میری زندگی کے حالات پوچھنے لگے۔ بچپن سے لے کر اب تک کے تمام حالات مجھے بیان کرنے پڑے' حتیٰ کہ میرا سر چکرانے لگا۔ میں کھڑے کھڑے تھک گیا اور جب ٹانگیں کانپنے لگیں' تو میں فرش پر گر پڑا۔ مجھے کمرہ گھومتا ہوا محسوس ہونے لگا' کیوں کہ کامل دس گھنٹے تک یہ بدبخت مجھ سے سوالات کرتے رہے اور جب انہوں نے دیکھا کہ میں بولنے پر بھی قادر نہیں رہا' تو دو سپاہیوں نے بازوؤں سے تھا' اور مجھے کوٹھڑی میں لا کر پھینک گئے۔

ایک گھنٹے بعد جب کہ مجھ پر غنودگی کی سی کیفیت طاری تھی' دروازہ پھر کھلا اور ایک سپاہی نے آ کر مجھے اٹھانا چاہا۔ نقاہت کے باعث میں حرکت کرنے کے قابل بھی نہ تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ جیل خانے کے ڈاکٹر کو بلا لائے۔ یہ سن کر اس نے اپنے جوتے کی نوک میری پسلی میں چبھوئی اور ڈانٹ کر کہا:

''جلدی اُٹھو' تمہیں ڈیوٹی آفیسر بلا رہا ہے۔''

خدا معلوم اس وقت مجھ میں قوت کی وہ لہر کہاں سے آ گئی کہ میں نے لیٹے ہی لیٹے سپاہی کے دونوں پاؤں پکڑ کر اسے نیچے گرا دیا اور اس پر اندھا دھند گھونسوں کی بارش کر دی۔ سپاہی پہلے تو ششدر رہ گیا' بعدازاں جب میرے دو گھونسے اس کے جبڑوں پر پڑے' تو اس نے اپنی مدافعت کے لیے میرا گلا دبانے کی کوشش کی اور اس کے ساتھ ہی اونچی آواز میں مدد کے لیے دوسرے سپاہیوں کو پکارنے لگا۔ اس اثناء میں میں نے اسے خوب ہی رگیدا' آخر وہ بھاگنے میں کامیاب ہو گیا' اس نے جلدی سے دروازے میں قفل لگایا اور دیوانوں کی طرح چیختا چلاّتا دوسری منزل کی سیڑھیوں کی طرف لپکا۔ دو منٹ بعد ہی میں نے لکڑی کی سیڑھیوں پر بہت سے قدموں کی آوازیں سنیں۔ سارجنٹ' اس کے ساتھ دو مسلح سپاہی اور وہی گارڈ جس کی میں نے مرمت کی تھی' نمودار ہوئے۔

میں نے اب پاگل بن جانا ہی بہتر سمجھا۔ انہیں دیکھتے ہی میں نے حلق پھاڑ کر جرمن اور انگریزی میں فحش گالیاں بکنی شروع کیں۔ اپنے سر کے بال نوچ ڈالے‘ جیکٹ اتار کر ایک طرف پھینکی‘ انگلیاں دانتوں سے کاٹیں اور دیواروں سے سر ٹکرانے لگا۔ یہ ترکیب بے حد مفید ثابت ہوئی۔ وہ میری ان وحشیانہ حرکتوں کو دیکھتے رہے اور جب میں نے دیکھا کہ سارجنٹ دروازہ کھول کر اندر آ رہا ہے‘ تو میں نے ایک نعرہ لگایا اور اس کی جانب لپکا۔ گھبرا کر وہ پیچھے مُڑا‘ سپاہیوں سے کچھ کہا اور دروازہ بند کر کے چاروں وہاں سے دفعان ہو گئے۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

تیسرے روز انہوں مجھے پھر کوٹھڑی سے باہر نکالا اور پوچھ گچھ کا وہی طویل سلسلہ شروع کیا‘ لیکن میں اپنے مؤقف پر ڈٹا رہا۔ اس مرتبہ میں نے نتائج سے بے پروا ہو کر اعلیٰ افسروں کو بھی گالیاں دیں‘ ان کا مذاق اُڑایا‘ ان کے لیڈروں پر پھبتیاں کسیں اور خدا جانے کیا کچھ بکتا رہا۔ ان میں سے ایک نے رائے دی کہ پڈنگٹن کے دماغ کا معائنہ کرایا جائے۔ عین ممکن ہے یہ شخص پاگل ہو چکا ہو۔ دوسرے افسران جو چپ چاپ میری حرکات کا جائزہ لے رہے تھے‘ کہنے لگے ”یہ ابھی تو پاگل نہیں ہوا‘ البتہ اس قسم کی بے ہودہ حرکتیں دانستہ کرتا رہا‘ تو عنقریب ذہنی توازن کھو بیٹھے گا اور پھر اس کے ملک کی خفیہ پولیس کہے گی کہ ہمارے ایک ”قابل ترین جاسوس“ کو روس والوں نے پاگل کر دیا‘ اس لیے اسے فی الحال آرام کرنے دیا جائے۔“

تین ماہ بیت گئے‘ اکتوبر ختم ہونے کو آیا‘ لیکن مجھے کوٹھڑی سے ایک لمحے کے لیے بھی آزاد نہیں کیا گیا۔ ہفتے میں صرف ایک مرتبہ شیو بنانے کے لیے ریزر دیا جاتا اور جب میں نے اُبلے ہوئے نمکین چاول لانے والے سپاہی سے کہا کہ وہ غسل کا انتظام کرے‘ تو وہ میری صورت تکنے لگا اور روسی زبان میں کچھ کہا۔ معلوم ہوا کہ میں نہ اس کی زبان سمجھتا ہوں‘ نہ وہ میری زبان سمجھتا ہے۔ میں نے اشاروں میں اسے سمجھانے کی

کوشش کی‘ لیکن وہ ہونقوں کی طرح مجھے دیکھتا رہا اور کچھ کہے بغیر چلا گیا۔ اگلے روز وہ پھر آیا‘ تو میں نے ایک اور ترکیب کی۔ اس نے پہلے چاولوں کی پلیٹ سلاخوں میں سے مجھے تھمائی اور جب پانی کا پیالہ مجھے پکڑا دیا‘ تو میں نے پانی اس کے اوپر پھینک دیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اس کی شکایت اپنے افسر اعلیٰ سے کرے گا اور جب وہ تحقیق کے لیے آئے گا‘ تو میں اس سے غسل کے لیے کہہ سکوں گا‘ لیکن یہ گارڈ اتنا ”شریف“ آدمی ثابت ہوا کہ اس نے میری اس حرکت کا کوئی نوٹس نہ لیا اور واپس چلا گیا۔

ایک رات جب میں اپنے مستقبل کے بارے میں طرح طرح کے پریشان کُن تصورات میں گم تھا‘ دروازے پر آہٹ ہوئی۔ میں چونک کر اٹھ بیٹھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ گارڈ کمانڈر اور ایک لیفٹیننٹ کوٹھڑی کے آگے کھڑے ہیں۔ وہ دونوں اندر آئے اور مجھے باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ ہر چہ بادا باد کہہ کر میں ان کے ساتھ ہو لیا۔ یہ مجھے دوسری منزل کی ایک کوٹھڑی میں لے گئے جو صرف تین فٹ چوڑی‘ دس فٹ لمبی اور بارہ فٹ اونچی تھی۔ اس میں کھڑکی تھی نہ روشن دان۔ چھت کے عین درمیان میں ایک بہت طاقت ور برقی بلب روشن تھا جس کی طرف دیکھنے ہی سے آنکھیں چندھیا جاتی تھیں۔ اس کوٹھڑی میں آتے ہی مجھے سردی کا شدید احساس ہوا۔ ان ظالموں نے نہ جانے کس تدبیر سے اس کوٹھڑی کو سرد کیا تھا۔

فرش پر قدم رکھتے ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے پیروں تلے کانٹے بچھے ہوئے ہیں۔ میں نے گھبرا کر اسے غور سے دیکھا‘ تو معلوم ہوا کہ فرش کنکریٹ کا ہے‘ لیکن پورے فرش پر ایک ایک انچ لمبے کنکریٹ ہی کے کانٹے معمار نے نہایت کاری گری سے بنائے تھے۔ لیفٹیننٹ نے مجھے کپڑے اتارنے کا حکم دیا اور جب میں حکم کی تعمیل کر چکا اور مادر زاد برہنہ ہو کر سردی سے تھر تھر کانپنے لگا‘ تو اس کے لبوں پر ایک حقارت آمیز تبسم نمودار ہوا۔ سپاہیوں نے میرے کپڑے اٹھائے اور باہر نکل کر کوٹھڑی کے دروازے کو مقفل کر دیا۔

یہ سارا مرحلہ اس سرعت سے طے ہوا کہ میں کچھ نہ سمجھ سکا کہ یہ لوگ میرے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہتے ہیں۔ چند ہی لمحوں میں میرا جسم برف کی مانند یخ ہو گیا اور میں نے محسوس کیا کہ اگر مجھے تمام رات اسی کوٹھڑی میں بند رکھا گیا' تو میں ہرگز زندہ نہ بچوں گا۔ یہ خیال آتے ہی میں اپنے بازوؤں کو حرکت دینے لگا۔ اس سردی سے محفوظ رہنے کا میرے پاس واحد طریقہ یہ تھا کہ جس قدر ممکن ہو' ورزش کی جائے۔ آدھ گھنٹے تک میں ورزش کرتا رہا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ میرا سن ہوتا ہوا جسم گرم ہونے لگا۔ میں نے کوٹھڑی کے فرش پر دوڑنے کی کوشش کی' لیکن کنکریٹ کے یہ سخت کانٹے اس طرح تلووں میں چبھتے تھے کہ بے اختیار چیخ نکل جاتی تھی۔ آہستہ آہستہ میرا جسم پھر سن ہونے لگا اور ٹانگیں تو بالکل ہی سن ہو گئیں جیسے جسم سے ان کا کوئی تعلق نہیں رہا۔ ہمت کر کے میں نے ایک دفعہ پھر ورزش شروع کی' لیکن چند ہی منٹ بعد بازو شل ہو گئے اور میرا جی چاہا کہ اپنے آپ کو اس عذاب سے نجات دینے کے لیے دیواروں سے سر ٹکراؤں اور مر جاؤں۔ دفعتہً ایک خیال میرے ذہن میں بجلی کی مانند کوندا اور میں دروازے پر پوری قوت سے مکّے برسانے لگا۔

تھوڑی دیر بعد گارڈ کمانڈر نے دروازہ کھولا۔ اندر داخل ہوتے ہی اس نے ایک زوردار گھونسا میرے جبڑے پر مارنے کی کوشش کی' مگر میں بھی غافل نہ تھا۔ اس کا وار خالی دے کر میں نے لات اس کے پیٹ میں ماری۔ وہ آگے کو جھکا' اسی لمحے میرے دائیں ہاتھ کا گھونسا اس کی کنپٹی پر پڑا۔ وہ سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ میں نے اس کی گردن اور پشت پر گھونسوں اور لاتوں کی بارش کر دی۔ وہ اتنا حواس باختہ ہوا کہ دروازے سے باہر بھاگا اور جلدی سے تالا لگا کر نیچے دوڑتا ہوا گیا۔ چند منٹ بعد میں نے بیرونی برآمدے میں جوتوں کی کھٹ کھٹ سنی۔ گارڈ کمانڈر اس مرتبہ اپنے ساتھ دو مسلح سپاہیوں کو لے کر آیا تھا۔

گارڈ کمانڈر اور ایک سپاہی تو دروازے کے پاس ہی رُکے اور دوسرا سپاہی ایک جنگلی بھینسے کی مانند مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میں پہلے ہی زندگی سے بیزار ہو چکا تھا' گھونسے بازی اور جوجتسو (جاپانی کُشتی) کا فن میرے بڑا کام آیا۔ میں نے ایک ہی گھونسے میں اس کی ناک کا بانسا توڑ دیا۔ ایک دلدوز چیخ کے ساتھ وہ نیچے گرا اور دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپائے بُری طرح تڑپنے لگا۔ گارڈ کمانڈر اور دوسرا سپاہی اسے سنبھالنے کے لیے لپکے۔ اب انہوں نے مجھے رائفلوں کی زد پر رکھ لیا تھا۔ میں نے جب زخمی سپاہی کی طرف دیکھا' تو خون سے اس کا چہرہ اور ہاتھ تر ہو چکے تھے۔ میں نے چلّا کر جرمن زبان میں کہا:

''فوراً باہر نکل جاؤ' ورنہ تم میں سے ایک شخص میرے ہاتھوں ضرور مارا جائے گا۔''

رائفلیں اگرچہ ان کے ہاتھوں میں تھیں' لیکن میری اس دھمکی نے اثر دکھایا اور وہ زخمی سپاہی کو باہر لے گئے اور دروازہ بند کر دیا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ لڑائی بھڑائی نے میرا جسم دوبارہ گرم کر دیا تھا اور اب میرے پاؤں بھی کنکریٹ کے کانٹوں پر چلنے کے عادی ہوتے جا رہے تھے۔ پانچ منٹ بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ میں نے کوٹھڑی کے باہر بہت سے قدموں کی آواز سنی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیل خانے کا پورا عملہ ادھر ہی چلا آیا ہے۔ کوٹھڑی کا دروازہ کھلا اور میں نے اپنے سامنے چھ آدمیوں کو کھڑے پایا جن میں ایک سارجنٹ میجر اور سارجنٹ' ایک گشتی فوجی سپاہی اور دو باوردی چوکیدار تھے۔ کوٹھڑی میں آتے ہی ان سبھوں نے مجھے اندھا دھند پیٹنا شروع کر دیا۔ لاتیں' گھونسے' ٹھوکریں' مُکّے' تھپڑ اور پھر جرمن اور روسی زبان کی ملی جلی فحش گالیوں کی بوچھاڑ۔ جب مارتے مارتے انہوں نے مجھے ادھ موا کر دیا اور میری چیخیں رُک گئیں' تو مجھے یاد ہے کہ انہوں نے میرے ہاتھ پیروں کو ہتھکڑیوں سے اچھی طرح جکڑ دیا' حتیٰ کہ میں ذرا سی حرکت کرنے کے قابل بھی نہ رہا۔

❁ ❁ ❁

مار پیٹ اور سردی کھانے کے باعث میرا جسم ایسا اکڑ گیا تھا کہ میں کوشش کے باوجود ہاتھ پیر ہلانے پر قادر نہ تھا' البتہ میرا ذہن اس حالت میں بھی کام کر رہا تھا۔ انہوں نے مجھے بُری طرح پیٹا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس زندگی سے موت اچھی۔ پوری قوت جمع کر کے میں نے زور سے چیخ ماری اور اپنے بندھے ہوئے پیروں کو لکڑی کے دروازے پر مارنے لگا۔ فوراً ہی باہر کھڑا ہوا پہرے دار اندر آیا۔ پہلے تو میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور پھر میری پسلی میں ٹھوکر مار کر روسی زبان میں کچھ کہا جو یقیناً کوئی فحش گالی ہی تھی۔ اس کے بعد اس نے مجھے ذبح کیے ہوئے بکرے کی مانند گھسیٹا اور دروازے سے دور ایک گوشے میں ڈال دیا۔ میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑی تھیں' تاہم اس وقت میں نے محسوس کیا کہ میں اپنی انگلیوں کو حرکت دے سکتا ہوں۔ جب وہ مجھے کونے میں پھینک کر واپس ہوا' تو میں نے اس کی ٹانگ پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا۔ بے خبری میں وہ اوندھے منہ کانٹوں بھرے فرش پر گرا' لیکن گرم وردی نے چوٹ لگنے سے اسے بچا لیا' البتہ اس کی پیشانی اور رخسار زخمی ہو گئے۔ وہ طیش میں آ کر اٹھا اور مجھے زدوکوب کرنے کے ارادے سے آگے بڑھا ہی تھا کہ باہر سارجنٹ کی آواز گونجی۔ وہ فوراً کوٹھڑی سے بھاگا اور دروازہ بند کر دیا۔

کہتے ہیں نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے۔ میں بھی اس لمبی سرد رات کو اتنا عذاب برداشت کرنے کے بعد سو ہی گیا۔ صبح جب آنکھ کھلی' تو میرے تمام جسم میں بے پناہ ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ دونوں ہاتھ اور ٹانگیں سُوج کر سرخ ہو گئی تھیں۔ گردن حرکت نہیں کرتی تھی اور سردی سے دانت بج رہے تھے۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا' تو کوٹھڑی کے فرش پر اور دروازے کے پاس جمے ہوئے خون کے بڑے بڑے دھبے دکھائی دیئے۔ نقاہت اور کمزوری کی یہ کیفیت تھی کہ جان سمٹ کر سینے میں آ گئی تھی۔ دفعتہً باہر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں بالکل لاش کی مانند اکڑ گیا اور منتظر رہا کہ اب کیا ہوتا ہے؟

دروازہ آہستہ سے کھلا' میں نے نیم باز آنکھ سے دیکھا کہ ڈیوٹی آفیسر دروازے میں کھڑا میری طرف دیکھ رہا ہے۔ غالباً وہ میرے بارے میں سوچ رہا تھا کہ یہ قیدی چل بسا۔ پھر وہ دبے پاؤں میرے قریب آیا اور جھک کر دیکھنے لگا۔ میں نے سانس روک لیا۔ اس نے پہلے ہاتھ سے میرا بدن چھوا اور پھر اپنی ٹانگ میرے شانے پر رکھ کر اسے زور سے دبایا۔ درد کی شدت سے میری چیخ نکل گئی اور میں نے اس کی ٹانگ پکڑ کر جھٹکا دیا۔ وہ بھی اوندھے منہ فرش پر گر پڑا اور گرتے ہی کوٹھڑی سے باہر بھاگا اور زور سے دروازہ بند کر دیا۔ جان کنی کے اس عالم سے گزرنے کے باوجود میری ہنسی چھوٹ گئی اور میں دیر تک بے جان قہقہے لگاتا رہا۔

کمرے میں پھیلی ہوئی سردی رفتہ رفتہ دور ہو رہی تھی اور میرا برہنہ اور زخمی جسم اب آرام اور گرمی پا کر حرکت کرنے لگا تھا۔ بیڑیاں پڑی ہونے کے باوجود میں کوشش کر کے اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا اور دیوار کا سہارا لیتا ہوا دروازے کی طرف کھسکنے لگا۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ چوں کہ یہ لوگ مجھے برطانیہ کا بہت بڑا جاسوس سمجھتے ہیں' اس لیے "راز" اگلوائے بغیر مجھے ہلاک کرنے کی کبھی کوشش نہ کریں گے' اس لیے میں انہیں جتنا پریشان کرنا چاہوں' کر سکتا ہوں۔

دروازہ پیٹتے ہی اس مرتبہ سارجنٹ میجر نمودار ہوا۔ اسے میری حالت دیکھ کر افسوس ضرور ہوا' لیکن زبان سے کچھ نہ کہا۔ اس نے ایک سپاہی کو بھیج کر میرے کپڑے منگوائے اور ایک گرم کمبل بھی عطا کیا اور مجھے دوبارہ اسی کوٹھڑی میں پہنچا دیا جہاں سے لایا گیا تھا۔ میں نے سارجنٹ کی اس مہربانی کا شکریہ ادا کیا' تو وہ بولا:

"ہم کسی کو اذیت دے کر خوش نہیں ہوتے' خواہ وہ ہمارا جانی دشمن ہی کیوں نہ ہو۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ جو کچھ پوچھا جائے' اس کا صاف اور سچا جواب ہمیں ملے۔"

میں نے کہا: ''جو کچھ مجھے معلوم تھا' میں بتا چکا۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ آپ......''

وہ بے صبری سے قطع کلام کرتے ہوئے بولا: ''بہرحال' بہرحال...... یہ میرا فرض نہیں کہ آپ سے کچھ پوچھوں' یہ اعلیٰ افسروں کا کام ہے۔'' میں نے جب پیروں میں جوتے پہننے کی کوشش کی' تو معلوم ہوا کہ رات ہی رات میں میرے پیر پہلے سے بھی زیادہ بڑھ چکے ہیں اور جوتا چھوٹا ہوگیا ہے۔ وجہ یہ تھی کہ پیر بری طرح سوجے ہوئے تھے۔ یہ دیکھ کر سارجنٹ نے کہا:

''آپ نے ہمارے آدمیوں سے ہاتھا پائی کی' یہ اسی کا نتیجہ ہے۔ آئندہ اس قسم کی شرارتوں سے پرہیز کیا جائے' تو آپ کے لیے بہتر ہے۔''

میں خاموش رہا اور چہرے پر ایسے تاثرات پیدا کرنے کی کوشش کی جیسے میں واقعی ان ''شرارتوں'' پر نادم ہوں۔ میں نے موقع غنیمت دیکھ کر گرم پانی سے نہانے کی درخواست کی جو دوپہر گیارہ بجے منظور کر لی گئی۔ نہانے اور کھانے کے بعد میری کھوئی ہوئی ساری توانائی لوٹ آئی۔ اس مرتبہ انہوں نے مجھے سگریٹ بھی پیش کیے اور میرے لیے آرام دہ بستر بھی مہیا کیا۔ آپ یقین کیجیے کہ میں دو دن اور دو راتیں سوتا رہا۔ اس دوران میں صرف دو مرتبہ آنکھ کھلی۔ تیسرے روز صبح جب میں قہوہ پیتے ہوئے گزشتہ حادثے پر غور کر رہا تھا کہ اب ان لوگوں کا آئندہ رویہ میرے ساتھ کیا ہوگا کہ دروازہ کھلا اور سارجنٹ میجر نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ اس روز نومبر کی 2 تاریخ تھی جسے میں زندگی بھر فراموش نہ کر سکوں گا۔

تفتیش اور پوچھ گچھ کرنے والے وہی افسر تھے جن سے میرا پہلے سابقہ پڑ چکا تھا۔ اس مرتبہ انہوں نے مجھے بیٹھنے کے لیے کرسی بھی پیش کی اور نرم لہجے میں وہی سوال پوچھے جن کے جواب میں دے چکا تھا۔ آخر انہوں نے ایک فائل نکال کر بہت سی تصویریں منتخب کیں اور میرے ہاتھ میں تھما دیں کہ کیا میں ان میں سے کسی کو پہچانتا

ہوں۔ یہ پندرہ بیس تصویریں نوجوان لڑکیوں کی تھیں جن کو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پس میں نے نفی میں جواب دیا۔ میجر کے چہرے پر مایوسی پھیل گئی۔ اس نے تصویریں مجھ سے لے کر فائل میں رکھیں اور فیصلہ کن انداز میں کہا:

''اچھا مسٹر پڈنگٹن' اب تم میرے ایک اہم سوال کا جواب سوچ سمجھ کر دو گے۔''

ایک منٹ تک میرے چہرے کا بغور جائزہ لینے کے بعد دفعتہً وہ ڈرامائی انداز میں بولا:

''میں جاننا چاہتا ہوں کہ فرولین میریا کون ہے اور کہاں رہتی ہے؟''

یہ سوال اتنا دھماکہ خیز ثابت ہوا کہ میں اپنی جگہ سے اُچھل پڑا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ انہیں میریا کے بارے میں پتہ چل جائے گا۔ میریا وہی لڑکی تھی جس سے شادی کرنے کے لیے میں یہ عذاب برداشت کر رہا تھا۔ غصے سے بے قابو ہو کر میں اٹھا اور میجر کی طرف دیکھ کر دھاڑا:

''میں تمہیں قتل کر دوں گا' اگر تم نے اس معصوم لڑکی کو ذرا بھی نقصان پہنچایا۔''

''آہ......میرے دوست اتنا طیش میں نہ آؤ۔'' میجر اپنی کامیابی پر مسکرایا۔ ''تم اپنی جان کی خیر مانگو۔ ثابت ہوگیا کہ تم اس لڑکی کو جانتے ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بھی برطانیہ کے لیے کام کر رہی ہے۔ ہم بہت جلد اسے پکڑ لیں گے۔ مجھے بتاؤ کہ تم اس لڑکی سے کہاں ملے تھے؟''

''میں اس کے بارے میں ایک حرف بھی نہیں بتاؤں گا' خواہ تم مجھے مار ہی ڈالو۔'' میں نے ڈپٹ کر کہا اور ہونٹ یوں بھینچ لیے جیسے اب منہ نہ کھولوں گا۔ میجر نے پھر کہا:

''مسٹر پڈنگٹن' تم غالباً اپنے ہوش و حواس میں نہیں یا دانستہ ایسا مظاہرہ کر رہے ہو' تاہم ہمارے پاس یہ ثبوت موجود ہے کہ تم اور تمہاری یہ نام نہاد منگیتر برطانوی جاسوسوں کی ٹولی سے تعلق رکھتی ہے۔ میں تمہیں اب آخری موقع دیتا ہوں کہ حقیقت اُگل دو'

ورنہ تمہارا اور فرولین میریا کا انجام اتنا عبرت ناک ہوگا کہ آئندہ کسی برطانوی جاسوس کو ہمارے علاقے میں آنے کی جرأت نہ ہوگی۔ تمہاری انٹیلی جنس سروس بے شک بہت اعلیٰ ہے' لیکن ہم تم سے بھی دس قدم آگے ہیں' میں تمہیں کل کی مہلت دیتا ہوں۔ اس عرصے میں خوب سوچ سمجھ لو کہ آیا تمہیں اس دنیا میں رہنا ہے یا نہیں۔ مجھے خوشی ہوگی اگر تم پرسوں میرے پاس آ کر فرولین میریا کا پتہ بتا دو گے' میں وعدہ.....''

''میجر صاحب! میرا دماغ نہ چاٹیے' میں اب کچھ کہنا نہیں چاہتا' جو آپ کے جی میں آئے کیجئے۔''

میجر اور اس کے ساتھیوں کے چہرے غصے سے سرخ ہوگئے۔ اس نے اسی وقت ایک لیفٹیننٹ کو بلایا اور روسی زبان میں کچھ ہدایتیں دے کر ''اجلاس'' برخاست کر دیا۔ لیفٹیننٹ مجھے کوٹھڑی میں واپس لے گیا۔ ایک دفعہ پھر میری تلاشی لی گئی' ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنائی گئیں' آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھی گئی' پھر جیل خانے سے باہر لے جا کر ایک جیپ میں بٹھایا گیا جو نہایت تیز رفتاری سے ایک نامعلوم منزل کی جانب روانہ ہوگئی۔

❁ ❁ ❁

جیپ تیزی سے دوڑ رہی تھی۔ راستے میں دیر تک کوئی موڑ نہ آیا جس سے میں نے اندازہ کیا کہ سفر بہت لمبا ہے۔ انجن کی پُرشور آواز رات کے اس گہرے سناٹے کو چیرتی ہوئی مسلسل آگے بڑھ رہی تھی۔ جیپ میں میرے اردگرد بیٹھنے والے ساتھی خاموش تھے۔ میری آنکھوں پر سیاہ کپڑے کی پٹی سختی سے بندھی ہوئی تھی اور ہاتھ پشت پر کسے ہوئے تھے۔ ذہن اس وقت سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت سے محروم تھا' تاہم اتنا احساس ضرور تھا کہ یہ لوگ مجھے شاید مشرقی برلن سے نکال کر روس کے کسی اندرونی علاقے کی طرف لے جا رہے ہیں۔ بعد میں یہ خیال غلط ثابت ہوا۔

چار گھنٹے کے بعد یہ اکتا دینے والا سفر ختم ہوا۔ راستے میں صرف دو موڑ آئے۔ جیپ جس رفتار سے چل رہی تھی' اس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ ہم نے ڈیڑھ دو سو میل طے کیے ہیں۔ مجھے جیپ سے اتار کر کافی دور پیدل لے جایا گیا۔ جب میری آنکھوں سے پٹی کھلی' تو میں نے اپنے آپ کو ہلکے دھندلکے میں گھری ہوئی ایک عظیم الشان عمارت کے صدر دروازے پر کھڑے پایا جس کی پیشانی پر لکھے ہوئے رومن حروف یہ اعلان کرتے تھے کہ یہ عمارت کارل شاٹ کا تحقیقاتی مرکز اور جیل خانہ ہے۔ اس جیل خانے کا نام میں نے پہلے بھی سن رکھا تھا اور خوب جانتا تھا کہ یہ کتنی بھیانک اور تکلیف دہ جگہ ہے۔ جنگ کے زمانے میں میرا ایک دوست جو بدقسمتی سے روسیوں کے ہاتھ لگ گیا تھا' اسی ''تحقیقاتی مرکز'' میں لایا گیا تھا اور اسے چھ ماہ تک یہاں رکھ کر جو ذہنی اور جسمانی اذیتیں دی گئی تھیں' وہ سب اس نے بعد میں مجھے سنائی تھیں اور اب میں اس تحقیقاتی مرکز کے سامنے کھڑا سوچ رہا تھا کہ مجھ پر کیا بیتنے والی ہے۔

مجھے دروازے کے بائیں جانب ایک چھوٹے سے کمرے میں لے جایا گیا جہاں ایک سرخ سفید اور تنومند سارجنٹ نے میرا استقبال کیا۔ اس کے منہ سے چند الفاظ نکلے:

''کپڑے اتار دو۔'' میں نے بے چون و چرا حکم کی تعمیل کی۔ کپڑے اتار کر میں ایک گوشے میں پیٹھ موڑ کر کھڑا ہوگیا۔ اس اثناء میں سارجنٹ نے میرے کپڑوں کو الٹ پلٹ کر اچھی طرح دیکھا بھالا اور جب اسے اطمینان ہوگیا کہ ان میں کوئی قابل اعتراض چیز نہیں' تو مجھے کپڑے پہننے کا حکم دیا گیا۔ پھر وہ مجھے بازو سے پکڑ کر عمارت کے اندرونی حصے میں لے گیا اور ایک کوٹھڑی کے دروازے پر رکا جس پر سات کا ہندسہ درج تھا۔ اس نے قفل کھولتے ہوئے صاف اور شستہ جرمن زبان میں کہا:

''مسٹر پڈنگٹن' اب آپ آرام کر سکتے ہیں۔''

اس کوٹھڑی کی کُل کائنات لکڑی کا ایک چوڑا سا تختہ تھا جو ایک کونے میں پڑا تھا اور

دوسری جانب رفع حاجت کے لیے ایک کموڈ......میں اس تختے پر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر کے اپنی اس نئی قیام گاہ اور یہاں پیش آنے والے مصائب پر غور کرنے لگا۔ پندرہ منٹ بعد میں نے دروازہ کھلنے کی آواز سنی اور آنکھیں کھولیں' تو ایک اور فوجی افسر میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے مجھ سے میرا نام پوچھا اور کہا کہ میں اپنی جیکٹ اور ٹوپی یہیں چھوڑ کر اس کے ساتھ چلوں۔ میں فوراً اس کے ساتھ ہولیا۔ وہ نچلی منزل کے ایک کمرے کے سامنے رکا جس کے دروازے پر نمبر 60 درج تھا۔ یہاں اس نے ہلکے سے دستک دی' دروازہ کھولا اور مجھے اندر جانے کے لیے کہا۔

ایک لمبی میز کے پیچھے ایم۔ وی۔ ڈی کا ایک کپتان فوجی وردی پہنے بیٹھا تھا۔ اس نے مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا۔ اسی لمحے دروازہ پھر کھلا اور ایک دبلی پتلی ادھیڑ عمر کی خاتون کمرے میں آئی جس کے ہاتھ میں ٹائپ کیے ہوئے کاغذوں کا ایک پلندہ تھا۔ کپتان نے یہ کاغذ ایک ایک کر کے دیکھے اور پھر مجھ سے مخاطب ہوا:

''مسٹر پڈنگٹن' اس عمارت میں آپ کے مقدمے کی آخری سماعت ہوگی۔ یہ آپ کی چارج شیٹ ہے' اسے بغور سنیئے۔'' اس نے ایک کاغذ ترجمان خاتون کو دیا جس نے صاف اور بلند آواز میں یوں پڑھنا شروع کیا:

''ولیم ارنسٹ پڈنگٹن پر سوویٹ قانون تعزیرات کی دفعہ $\frac{16}{84}$ کے تحت روس کے مقبوضہ علاقے مشرقی جرمنی میں بغیر ویزا داخل ہونے کا جرم عاید کیا جاتا ہے۔ 12 مارچ 1952ء کو تمہیں سرکاری طور پر گرفتار کیا گیا ہے......''

اس کے بعد اس خاتون نے دیر تک وہ تمام بیانات اور واقعات پڑھ کر سنائے جو میری گرفتاری کے بعد سے اس جیل خانے میں آنے تک پیش آئے تھے۔ میں خاموشی سے سنتا رہا۔ کپتان نے بھی اس دوران میں مداخلت نہ کی۔ جب یہ کارروائی ختم ہوئی' تو مجھ سے ان کاغذوں پر دستخط کرنے کے لیے کہا گیا۔ میں نے بلا تامّل ان پر دستخط

کر دیئے۔ غالباً کپتان کو مجھ سے اس ''شرافت'' کی امید نہ تھی۔ میں نے دیکھا کہ ایک ثانیے کے لیے اس کے سرخ سپید اور باوقار چہرے پر تعجب کی ہلکی سی شکن نمودار ہوئی۔ وہ مسکرایا اور کہنے لگا:

''مقدمے کی آخری سماعت دس دنوں کے اندر اندر اعلیٰ فوجی افسروں کے سامنے کی جائے گی۔ اس دوران میں آپ اپنی صفائی کے لیے جو بیان دینا پسند کریں' وہ تحریر کر سکتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے ضروری سامان آپ کو مہیا کیا جا سکتا ہے۔''

میں نے نفی میں گردن ہلائی اور کہا: ''جناب' میں اس سے پیشتر جو بیان دے چکا ہوں' وہی آخری ہے۔ اب کوئی نئی بات میرے پاس نہیں......''

مجھے دوبارہ کوٹھڑی میں بھیج دیا گیا۔ میں ایک ایک دن گنتا رہا۔ اس عرصہ میں ان لوگوں نے توقع کے خلاف مجھ سے بہتر سلوک کیا۔ کھانے میں نہ صرف انڈے' گوشت اور کافی پیش کی گئی' بلکہ سگریٹ بھی مہیا کیے گئے۔ شیو اور غسل کے مواقع بھی ملتے رہے۔ ٹھیک دسویں روز رات کے وقت گارڈ کمانڈر آیا اور مجھے اپنے ساتھ ایک وسیع و عریض کمرے میں لے گیا۔ یہ مئی کی 22 تاریخ تھی اور وقت گیارہ بجے شب......ان کم بختوں کو مقدمے کی سماعت کے لیے ہمیشہ آدھی رات کا ہی وقت مناسب معلوم ہوتا تھا۔

ایک لمبی چوڑی میز جس پر سرخ رنگ کا میز پوش بچھا تھا' تین فوجی افسر بڑی شان و تمکنت سے بیٹھے تھے اور ان کی وردیاں ظاہر کرتی تھیں کہ تینوں میجر ہیں۔ ان کے بائیں جانب وہی ترجمان خاتون اور ایک لیفٹیننٹ بیٹھا تھا۔ میری پشت پر دو سپاہی ٹامی گنیں ہاتھ میں لیے کھڑے تھے۔ جب وکیل استغاثہ جو ایک فوجی افسر تھا' کمرے میں آیا' تو مقدمے کی کارروائی کا آغاز کر دیا گیا۔ درمیان میں بیٹھے ہوئے میجر نے مجھ سے پوچھا:

"کیا تم کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

"جی ہاں۔" میں نے خشک لہجے میں کہا۔ "مجھے سمجھایا جائے کہ ایک شخص جسے 24 جولائی 1950ء کو گرفتار کیا گیا' دو سال تک اُسے مختلف جیل خانوں میں قید رکھا گیا اور طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں' لیکن اسے یہ بتایا جاتا ہے کہ تمہیں 12 مارچ 1952ء کو "سرکاری طور پر" گرفتار کیا گیا۔ آخر اس کا کیا مطلب ہے؟"

"اس کا جواب یہ ہے کہ 12 مارچ 1952ء سے پیشتر تم محض شبے کے تحت نظر بند تھے' لیکن بعد میں جب تمہارے جرم کا ثبوت مل گیا' تو تمہیں سرکاری طور پر گرفتار کیا گیا۔ کیا تم اپنے جرم کا اقرار کرتے ہو؟"

"میرا جرم صرف یہ ہے کہ میں ویزا کے بغیر مشرقی جرمنی میں داخل ہوا۔" میں نے اقرار کیا۔ "اس کے علاوہ مجھ پر جاسوسی کے جو الزامات عاید کیے گئے ہیں' میں ان سے انکار کرتا ہوں۔ یہ تمام الزامات بالکل غلط اور جھوٹے ہیں۔"

اس موقعے پر وکیل استغاثہ نے دیر تک وہی بیان پڑھ کر عدالت کو سنائے جو دس روز قبل کپتان کے کمرے میں مجھے سنائے جا چکے تھے۔ یہ کارروائی ختم ہونے کے بعد چیف جج نے مجھ سے کہا:

"تم اپنی صفائی میں مزید کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

میرے انکار پر مجھے کمرے سے نکال کر ایک دوسری کوٹھڑی میں لے جایا گیا اور معلوم ہوا کہ تھوڑی دیر بعد عدالت کا فیصلہ سنایا جائے گا۔ آدھ گھنٹے بعد میں دوبارہ عدالت کے سامنے کھڑا تھا۔ چیف جج اپنی نشست سے کھڑا ہوا اور اس نے ایک کاغذ پر لکھے ہوئے یہ الفاظ بلند آواز سے پڑھے:

"ولیم ارنسٹ پڈنگٹن' تم برمنگھم (انگلستان) کے باشندے ہو۔ تم پر آج 22 مئی 1952ء کو گیارہ بجے شب ایک خاص روسی فوجی عدالت میں جن کا سربراہ میں میجر

بریڈوف ہوں' مقدمہ چلایا گیا ہے۔ تم پر استغاثہ نے تین الزام عاید کیے تھے جو پایہ ثبوت کو پہنچ چکے ہیں۔ پہلا الزام یہ ہے کہ روسی ویزا کے بغیر روس کے مقبوضہ علاقے مشرقی جرمنی میں داخل ہوئے۔ دوسرا الزام یہ ہے کہ تم روسی حکومت کے خلاف پروپیگنڈا کرنے والے عناصر کی پشت پناہی کرتے رہے ہو اور تمہارے سامان سے ایسی چیزیں برآمد ہوئی ہیں جو یہ الزام درست قرار دیتی ہیں۔ تم پر تیسرا اور سب سے بڑا الزام جاسوس ہونے کا ہے۔ پس میں تمہیں مجرم گردانتے ہوئے علی الترتیب تین سال' دس سال اور پچیس سال کی قید با مشقت کی سزا کا حکم دیتا ہوں۔ یہ سزائیں ایک ساتھ شروع ہوں گی اور تمہیں یہ تمام عرصہ ایک روسی لیبر کیمپ میں بسر کرنا ہوگا۔ عدالت کے اس فیصلے کے خلاف اپیل دائر نہیں کی جا سکتی۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی عدالت برخاست ہوگئی۔ مسلح سپاہیوں کی حفاظت میں مجھے اب کوٹھڑی نمبر 82 میں لے جایا گیا اور یہ دیکھ کر پہلی بار میری جان میں جان آئی کہ قید تنہائی کا خاتمہ ہوا' کیوں کہ اس کوٹھڑی میں سات بدنصیب قیدی اور بھی تھے جو میری طرح لیبر کیمپ میں بھیجے جا رہے تھے۔

* * *

مجھے جس کوٹھڑی میں دوسرے سات قیدیوں کے ساتھ رکھا گیا' وہ اتنی تنگ تھی کہ ہم پیر پھیلا کر آرام سے سو بھی نہیں سکتے تھے۔ ان قیدیوں میں چار روسی اور تین جرمن تھے اور ہر چند میں نے ان سے معلوم کرنے کی کوشش کی کہ وہ کس جرم کی پاداش میں سائبیریا بھیجے جا رہے ہیں' لیکن کسی نے زبان نہ کھولی۔ ان پر دہشت اور خوف کی ایسی فضا مسلط تھی کہ وہ آپس میں بھی بات کرتے ہوئے ڈرتے تھے۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ ان قیدیوں کو بھی جاسوسی کے الزام میں لیبر کیمپ کی سزا ملی ہے اور ان کو نہایت ہی ہولناک اذیتیں دی جا چکی ہیں۔ میں نے دیکھا کہ ان میں سے اکثر قیدیوں کی پشت پر

سیاہ داغوں کے نشان ہیں جو لوہا گرم کر کے لگائے گئے ہیں۔ میں حیران تھا کہ میرے ساتھ یہاں ایسا سلوک اب تک کیوں نہیں کیا گیا۔

جولائی کے آخر میں ہم سب کو کوٹھڑی سے باہر نکال کر ایک بند لاری میں بٹھایا گیا۔ ہر قیدی کی تلاشی لی گئی۔ اس کے بعد گرم کپڑوں کا ایک ایک جوڑا عنایت کیا گیا اور یہ لاری ہمیں لے کر ایک ویران سے ریلوے سٹیشن پر پہنچی جہاں چاروں طرف سے بند ایک خاص ریل کے ڈبے میں ہمیں بھر دیا گیا۔ ریل کا یہ بند ڈبہ ساری رات سفر کرتا رہا اور علی الصبح رکا۔ معلوم ہوا کہ ہم مشرقی جرمنی کے آخری سرحدی مقام فرینکفرٹ پہنچ چکے ہیں اور اب پولینڈ کی سرحد میں داخل ہوا چاہتے ہیں۔ دن بھر یہاں ضروری چیکنگ ہوتی رہی' ہمارے کاغذوں کی جانچ پڑتال ہوئی اور ٹرین دوبارہ چل پڑی اور ایک دن اور ایک رات کہیں رُکے بغیر چلتی رہی۔ تیسرے روز ہم بریس لی سوک میں داخل ہو گئے جو روس کا سرحدی علاقہ تھا۔ یہاں ہمیں ٹرین سے اترنے کا حکم دیا گیا اور مسلح سپاہیوں کی نگرانی میں ہم سب قیدیوں کو پیدل چلنے کی ہدایت کی گئی۔ نہایت دشوار گزار اور پیچ در پیچ راستوں سے گزر کر ہم ایک عظیم الشان عمارت کے قریب پہنچے تو تقریباً نڈھال ہو چکے تھے' کیوں کہ دس میل لمبے اس راستے پر ہمیں ایک لمحے کے لیے بھی دم نہیں لینے دیا گیا۔

جیل خانہ ان تمام جیل خانوں سے بڑا تھا جن سے میرا زندگی میں اب تک سابقہ پڑ چکا تھا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ قلعہ نما عمارت کتنی قدیم تھی۔ اس کے چاروں طرف پتھر کی بنی ہوئی بہت اونچی فصیل تھی جس میں جابجا آہنی دروازے بنے ہوئے تھے۔ عمارت بہت وسیع و عریض قبے میں پھیلی ہوئی تھی اور اس کے چاروں طرف بے شمار روسی مسلح سپاہیوں کا پہرہ تھا اور نگرانی و احتیاط کا یہ عالم تھا کہ پرندہ بھی ان کی اجازت

کے بغیر پر نہ مار سکتا تھا۔ یقین کیجیے کہ اس عمارت اور اس کے نواحی منظر کو دیکھتے ہی میرے ہوش اُڑ گئے اور یقین ہو گیا کہ اب مصائب کا آغاز ہونے والا ہے۔

ہمیں ایک قطار میں کھڑا کر دیا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک روسی ڈاکٹر نمودار ہوا۔ اس نے ہر قیدی کا اچھی طرح جسمانی معائنہ کیا۔ ہمیں بتایا گیا کہ یہاں صرف تین روز قیام ہوگا' اس کے بعد ہمیں دو ہزار میل دور ورکوٹا کے مقام پر لیبر کیمپ میں بھیجا جائے گا۔ اس جگہ رُکنے کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوئی کہ اس دور دراز سفر کے لیے جس ٹرین کا انتظام کیا جانے والا تھا' اس میں کچھ تاخیر ہو گئی تھی۔ تیسرے روز رات کے وقت ہمیں ایک بار پھر اسی دس میل لمبے راستے پر پیدل چل کر سٹیشن جانا پڑا جہاں ایک بند گاڑی ہماری منتظر تھی' یہ فوراً ہمیں لے کر منسک کی طرف چل پڑی جو روس کا پہلا سرحدی قصبہ تھا۔ منسک سے اس ٹرین میں ہمارا سفر شمال مشرق کی طرف شروع ہوا اور بوریسوف' اور شا' سولنسک اور نیر ماہوتے ہوئے ہم ماسکو پہنچ گئے۔ ماسکو میں صرف ایک روز قیام کے بعد ہم دولوڈا کی جانب روانہ ہوئے۔ یاروسلال کے مقام پر قافلے میں دو قیدی اور شامل ہو گئے۔ یہ دونوں بھی روسی تھے جن کے بارے میں پتہ چلا کہ عادی مجرم ہیں اور اب عمر قید کی سزا بھگتنے کے لیے لیبر کیمپ میں بھیجے جا رہے ہیں۔ یہ دونوں مجرم اس قدر بدتمیز اور ناشائستہ تھے کہ جب تک سفر میں رہے' سبھی کا ناطقہ بند کیے رکھا۔ پہرے داروں سے مار کھاتے اور پھر بھی باز نہ آتے۔ دوسرے قیدیوں سے ان کی نپی تلی خوراک اور پانی چھین لیتے اور دھینگا مشتی تو ان کا ہر وقت کا مشغلہ تھا۔ ایک روز جرمن قیدیوں نے طے کیا کہ ان بدمعاشوں کو اچھی طرح پیٹنا چاہیے' چناں چہ انہوں نے پہلے تو سپاہیوں سے شکایت کی اور پھر انہی کی شہ پر ان دونوں پر پل پڑے اور مار مار کر بھرکس نکال دیا۔ سپاہیوں نے جب دیکھا کہ ان کی اچھی خاصی مرمت ہو چکی ہے اور سر پھٹ چکے ہیں' تو پھر وہ آگے بڑھے اور انہوں نے ہمیں ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیا۔ اس وقت سے

ان پر ایسا رعب طاری ہوا کہ پھر انہوں نے کبھی کوئی شرارت یا بدتمیزی نہیں کی اور باقی تمام عرصہ وہ فرمانبرداروں کی طرح رہے۔

بارو سال میں ایک روز قیام کیا۔ یہاں سے خاص گاڑی میں آگے روانہ ہوئے۔

اب ہم ایک دوسرے سے قدرے بے تکلف ہو گئے تھے اور اپنی اپنی روداد بیان کر رہے تھے۔ ابھی ہم کچھ دور ہی گئے ہوں گے کہ ایک بہت تیز گاڑی پیچھے سے آتی ہوئی نظر آئی۔ وہ گاڑی ہمارے برابر پہنچ کر رک گئی اور ساتھ ہی مخصوص اشارے پر ہماری گاڑی بھی رک گئی۔ دوسری گاڑی میں سے دو نیم برہنہ قیدی نکالے گئے۔ ان کے جسموں پر گہرے زخم تھے اور ان سے خون بہہ رہا تھا۔ یہ دونوں تقریباً چھ فٹ کے تھے اور شکل و شباہت سے بھائی معلوم ہوتے تھے۔ ان دونوں قیدیوں کو جن کے پاؤں میں بوجھل بیڑیاں تھیں اور ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے' ہماری گاڑی میں منتقل کر دیا گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ لیبر کیمپ سے فرار ہو گئے تھے اور صرف تین دن کے اندر اندر انہیں دوبارہ پکڑ لیا گیا۔

ہماری گاڑی تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی۔ شروع شروع میں ہمیں آپس میں باتیں کرنے کی اجازت نہیں تھی' لیکن ہم نے لمبے سفر سے اکتا کر آپس میں باتیں کرنا شروع کر دیں۔ ہماری توجہ کے مرکز نئے قیدی تھے۔ وہ بہت زیادہ خوفزدہ تھے اور منہ سے کچھ نہیں کہتے تھے' لیکن کچھ دیر بعد انہوں نے فرانسیسی زبان میں باتیں شروع کر دیں۔ انہوں نے بتایا کہ ہمیں لیبر کیمپ میں کام کرتے ہوئے چار سال ہو گئے ہیں اور ابھی سولہ سال اور رہتے ہیں۔ اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئے۔ ان کا بدن تھر تھر کانپ رہا تھا اور پیشانی پسینے سے تر ہو رہی تھی۔ اس کے بعد وہ ایسے خاموش ہوئے کہ پھر دوران سفر انہوں نے ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا۔

ہمارے پاس دو دن کی خوراک موجود تھی۔ ہمیں اس سے یہی اندازہ تھا کہ ہماری

منزل دو دن کے فاصلے پر ہے۔ گاڑی کا وائرلیس سیٹ کام کرتے کرتے یک لخت بیکار ہو گیا۔ فوجیوں نے اسے ٹھیک کرنے کی بہت کوشش کی' لیکن وہ ٹھیک نہ ہو سکا۔ فوجی مطمئن تھے کہ بس ایک ڈیڑھ دن میں منزل مقصود تک ضرور پہنچ جائیں گے۔ دوسرے دن شام کے وقت گاڑی میں گڑگڑاہٹ کی آواز پیدا ہونے لگی۔ شروع شروع میں ہمارے محافظوں نے اس آواز کی طرف توجہ نہیں دی' لیکن دو تین گھنٹوں کے بعد گاڑی نے ہچکولے کھانے شروع کر دیئے۔ ڈرائیور نے بریک لگا کر گاڑی روکنا چاہی' لیکن بریک فیل ہو چکے تھے اور گڑگڑاہٹ میں ہر لحظہ اضافہ ہو رہا تھا۔ ڈرائیور نے گیئر بدلنا چاہا' لیکن یہ کوشش بھی بے اثر رہی۔ اب ہماری گاڑی ڈرائیور کے قابو میں نہیں تھی اور شور کانوں کے پردے پھاڑ رہا تھا۔ گاڑی سڑک پر سے ہٹ کر نا معلوم سمت کی طرف دوڑی جا رہی تھی۔ ہر لحہ یہ گمان ہوتا تھا کہ قیامت آنے والی ہے۔ ہمارے سامنے ایک ٹیلہ تھا اور گاڑی اس کی طرف بڑھی جا رہی تھی۔ جوں جوں ٹیلہ ہمارے قریب آ رہا تھا' ہمارے ہوش و حواس جواب دے رہے تھے۔ اب ٹیلہ مشکل سے ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر تھا۔ اگلے ہی لمحے ہمیں احساس ہوا کہ ٹیلے سے پہلے ایک بہت بڑا گڑھا ہے۔ اگر ہماری گاڑی اس گڑھے میں جا گری' تو ہم میں سے کوئی بھی نہیں بچ سکے گا۔ ڈرائیور سٹیرنگ کو بار بار گھما رہا تھا' لیکن گاڑی تمام بندشوں سے آزاد ہو چکی تھی۔ اب ہمارے اور گڑھے کے درمیان صرف بیس گز کا فاصلہ تھا۔ ہمیں یقین ہو چکا تھا کہ ہمارا آخری وقت آ گیا ہے۔ ہر ایک کے چہرے پر موت کی سی زردی چھائی ہوئی تھی۔ ہم سب نے آنکھیں بند کر لیں۔ اگلا لمحہ ہماری زندگی کا آخری لمحہ تھا۔ عین اس وقت گاڑی ایک دھماکے کے ساتھ رُک گئی۔ گاڑی کا انجن پھٹ گیا تھا اور ہم موت کے منہ سے بال بال بچے تھے۔ صرف دو انچ کا فاصلہ رہ گیا تھا۔

رات سر پر تھی..... تاریک اور بھیانک رات۔ ہمارے محافظ ہمیں گاڑی سے باہر

نکالنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ رات اسی طرح گزاری۔ ہماری منزل ابھی ایک ہزار میل کے فاصلے پر تھی۔ اس نئی صورت حال کی اطلاع کہیں بھی نہیں دی جاسکتی تھی۔ پانچ دن اسی حالت میں گزر گئے۔ بھوک اور پیاس کی شدت سے بُرا حال تھا اور مدد پہنچنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ چھٹے روز فضا میں کسی چیز کی گونج سنائی دی۔ ہماری نگاہیں اس سمت میں اٹھیں جدھر سے آواز آ رہی تھی۔ دور فاصلے پر ہوائی جہاز محو پرواز تھا۔ وہ ہماری طرف آ رہا تھا۔ زندگی کی ایک کرن چمکی۔ جہاز ہمارے قریب آ کر مخالف سمت میں مُڑ گیا۔ ہم نے بہت شور مچایا، مگر آواز وہاں تک کہاں پہنچ سکتی تھی۔ ہوائی جہاز نے تین چار چکر لگائے اور ہم ہر بار یہ امید باندھ لیتے کہ اس دفعہ وہ ہمیں ضرور دیکھ لے گا۔ ہوائی جہاز واپس چلا گیا اور ہماری امید کا چراغ گُل ہوگیا۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد ہوائی جہاز پھر ہماری سمت آیا...... اس بار اس کی پرواز بہت نیچی تھی۔ ہمارے محافظوں نے مخصوص آوازیں نکالیں اور خاص انداز میں اپنے ہاتھ ہوا میں لہرائے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہوائی جہاز میں بیٹھنے والوں نے ان اشاروں کو سمجھ لیا ہے، کیوں کہ ہمیں ہوائی جہاز میں سے ایک ہاتھ لہراتا ہوا نظر آیا۔ ہوائی جہاز چلا گیا اور کوئی آٹھ گھنٹوں کے بعد ایک گاڑی تیزی سے ہماری طرف آتی ہوئی دکھائی دی۔ ہمارے دل خوشی سے بلیوں اچھل رہے تھے۔

گاڑی ہمارے پاس آ کر رُکی۔ ہمیں اس میں منتقل کر دیا گیا۔ کھانے پینے کا کچھ سامان اس گاڑی میں تھا۔ کھانے پینے کی چیزیں ہم میں تقسیم کر دی گئیں، لیکن وہ اتنی کم تھیں اور بھوک اتنی شدت کی تھی کہ ہم انہیں ایک دو منٹ ہی میں نگل گئے۔

دو دن کی مسافت کے بعد ہم سائبیریا کے لیبر کیمپ میں پہنچ گئے۔ دور دور تک چھوٹی چھوٹی بیرکوں اور کوٹھڑیوں کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ دراصل یہاں زیادہ کام کوئلے کی کانوں میں سے کوئلہ نکالنا تھا۔ یہاں کوئلے کی کانیں میلوں میں پھیلی ہوئی تھیں۔

ہمیں سب سے پہلے کیمپ انچارج کے سامنے پیش کیا گیا۔ ہمارے نام، قد اور انگلیوں کے نقش محفوظ کر لیے گئے اور اس کے بعد ہمیں کوٹھڑیوں میں منتقل کر دیا گیا۔ مجھے جس کوٹھڑی میں بھیجا گیا وہ بالکل تاریک تھی۔ اس میں ہوا اور روشنی کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ سونے کے لیے نہایت ہی سخت تختہ تھا۔ کوٹھڑی میں اس قدر بدبو تھی کہ میرے لیے سانس لینا دوبھر ہوگیا، لیکن کر کیا سکتا تھا۔ جوں توں کر کے رات گزاری۔ صبح سویرے بگل کی آواز بلند ہوئی اور ساتھ ہی میری کوٹھڑی کے دروازے کو کسی نے کھٹکھٹایا۔ میں اُٹھ بیٹھا۔ تازہ قیدیوں کو ایک جگہ جمع کیا گیا۔ ہم نے چوں کہ کوئلے کی کانوں میں کام کرنا تھا، اس لیے ہمیں تفصیلی ہدایات دینے کے لے جمع کیا گیا تھا۔ فوجی افسروں کے چہروں سے خونخواری ٹپکتی تھی اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ ہم بھیڑیوں کے درمیان آ گئے ہیں۔ اتنے میں ایک روسی انجینئر آیا۔ اس نے ہمیں لیکچر دینا شروع کیا۔ پہلے وہ روسی زبان میں کچھ کہتا تھا اور پھر خود ہی غلط ملط جرمن زبان میں ترجمہ کرتا تھا۔ مجھے اس کے اس لیکچر پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ اس کی باتوں میں کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ اس لیے میں اسے سن کر کیا کرتا۔ گزشتہ رات میں اس نئے مقام پر چوں کہ اچھی طرح سو نہیں سکا تھا، اس لیے میں وہیں بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگا۔ یکا یک میرے سر پر ایک دو ہنٹر پڑا۔ میں بدحواس ہو کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ دوسرے قیدی قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ انجینئر صاحب میرے قریب کھڑے لال پیلی آنکھوں سے مجھے گھور رہے ہیں؟

"گدھے کے بچے! تم میرا لیکچر نہیں سن رہے اور آنکھیں بند کر کے سو رہے ہو۔"

"مجھے آپ کے لیکچر سے کوئی دل چسپی نہیں۔" میں نے بھی چلّا کر جواب دیا۔

"میرے آباؤ اجداد نے کبھی کوئلے کی کانوں میں کام نہیں کیا۔ میں خود انجینئر ہوں اور آٹو موبائل کے فن میں استاد ہوں۔ کیا یہاں گیراج کی دیکھ بھال میرے سپرد نہیں کی جاسکتی۔"

میری یہ بات سن کر وہ کچھ مرعوب ہوا اور پیچھے ہٹ گیا۔ پھر کہنے لگا:

"بے شک یہاں ہر شعبے میں بہت سی لاریاں، ٹرک اور ریل انجن ہیں، لیکن فی الحال تمہیں کوئلے کی کانوں میں کام کرنا ہوگا۔ کیمپ کے انچارج کے احکامات یہی ہیں۔ اگر پلاننگ ڈیپارٹمنٹ کو محسوس ہوا کہ تم آٹو موبائل انجینئر ہو، تو تمہیں کسی گیراج میں منتقل کر دیا جائے گا۔ ہمارے پاس اچھے موٹر مکینکوں کی کمی ہے۔ کوئی بھی اس اجاڑ اور سرد علاقے میں آنا پسند نہیں کرتا۔"

اس کے چہرے پر ناگواری اور نفرت کے آثار نمودار ہوئے جس سے میں نے اندازہ کیا کہ ان انجینئروں اور دوسرے فوجی افسروں کو بھی یہاں جبراً بھیجا جاتا ہے اور یہ لوگ کسی نہ کسی بہانے کوئی غلطی یا خطا کر کے بھاگ جانے کی فکر کرتے ہوں گے۔ بعد میں میرا یہ اندازہ درست ثابت ہوا، کیوں کہ پندرہ روز بعد ہی یہ انجینئر اپنے شعبے کے انچارج سے لڑ پڑا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو زخمی کیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ ان کو فوراً ورکوتا سے نکال کر ماسکو بھیج دیا گیا اور ایک ہفتے بعد ان کی جگہ لینے والے دوسرے انجینئر آ گئے۔

اس دوران میں کان کے اندر میں اپنے کیمپ کے قیدیوں کے ساتھ کوئلہ کھودتا رہا۔ ہمیں سروں کی حفاظت کے لیے آہنی خود مہیا کیے گئے اور چوں کہ کان کے اندر تین تین فٹ پانی بھی کھڑا تھا، اس لیے ہمیں ٹانگوں پر موٹے پلاسٹک کی جرابیں چڑھانا پڑتی تھیں۔ کانوں سے پانی کھینچنے کے لیے پمپ بھی مسلسل کام کرتے تھے، مگر اس کے باوجود پانی برابر آتا تھا۔ ان کانوں کے اندر اترنے اور چڑھنے کے لیے کوئی لفٹ نہیں تھی، بلکہ کئی سو سیڑھیاں تھیں جن پر کان کنوں کو اترنا اور چڑھنا پڑتا تھا۔ ان کانوں کے اندر جا بجا سرنگیں تھیں جن کے اندر تازہ ہوا پہنچنے کا کوئی انتظام نہ تھا اور اس تاریک، سرد اور گھٹی ہوئی فضا میں کوئلہ کھودنا ایک عذاب سے کم نہ تھا۔ ان کانوں کی چھتوں کو گرنے

سے روکنے کے لیے لکڑی کی موٹی موٹی بلیاں لگائی گئی تھیں۔ اس کے باوجود چھت گر جانے کا خدشہ ہر وقت ذہن پر سوار رہتا تھا اور یہاں کام کرنے والے سینکڑوں قیدیوں کی جان کسی بھی لمحے ضائع ہو سکتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ان کانوں کے اندر کوئی مسلح سپاہی، کوئی انجینئر اور کوئی بڑا آفیسر داخل نہیں ہوتا تھا۔ یہاں قیدیوں کی اپنی اجارہ داری تھی اور وہ آزادی سے جہاں جی چاہے جا سکتے تھے۔ کانوں سے خام کوئلہ کھود کھود کر بڑے بڑے ٹوکروں میں بھر کر اوپر پہنچایا جاتا اور پھر اس کوئلے کو ٹرکوں پر لاد کر ویگنوں تک لے جایا جاتا۔ ان ویگنوں کے انجن بجلی سے چلتے تھے۔

نومبر کا مہینہ سر پر آ گیا اور میں مسلسل کوئلہ کھوتا رہا۔ مجھے بعض اوقات یوں محسوس ہوتا جیسے میں اسی کان میں پیدا ہوا ہوں اور یہیں مجھے مرنا ہے۔ ذہن کی پراگندگی اور ابتری کا یہ عالم تھا کہ مجھے اپنے تن بدن کا بھی ہوش نہ تھا۔ کوئلے کی سیاہ گرد میں رہنے کے باعث میرا جسم بھی سیاہ ہوتا جا رہا تھا۔ کام سے فارغ ہو کر جب میں اپنی بیرک میں پہنچ کر لکڑی کے تختے پر لیٹتا، تو بدن کا جوڑ جوڑ تھکن کے ہاتھوں فریاد کرتا۔ کانوں میں شائیں شائیں کی آوازیں گونجتیں۔ اندھیرے میں مسلسل دس گھنٹے رہنے کے باعث سورج کی روشنی سے جی گھبرانے لگا اور یہ حال صرف میرا ہی نہیں، ان سینکڑوں بدنصیب قیدیوں کا تھا جو ان کانوں میں جانوروں کی طرح بیگار بھگت رہے تھے۔ ہر ہفتے چار ڈاکٹروں کی ایک جماعت ہمارا جسمانی معائنہ کرتی اور جب انہیں معلوم ہوتا کہ قیدیوں میں سے اکثر کے پھیپھڑے خراب ہو رہے ہیں، تو انہیں یہاں سے تبدیل کر کے کسی اور شعبے میں عارضی طور پر منتقل کر دیا جاتا تھا۔ میں نے اس عرصے میں کئی مرتبہ پلاننگ ڈیپارٹمنٹ انچارج سے درخواست کی کہ وہ مجھے ٹرانسپورٹ کے شعبے میں تبدیل کر دے، لیکن اس نے میری درخواست ہر بار رد کر دی۔

نومبر کا آغاز ہوتے ہی ہمیں کیمپ کی طرف سے نئے گرم کپڑے مہیا کیے گئے،

کیوں کہ اب موسم روز بروز سرد تر ہوتا جا رہا تھا سارا سارا دن برف کے گالے آسمان سے گرتے رہتے۔ پھر طوفانی ہواؤں کے جھکڑ بھی چلنے لگے جن کی رفتار بعض اوقات پچیس تیس میل فی گھنٹہ تک پہنچ جاتی۔ اس کے باوجود کام کا ناغہ نہ ہوتا۔ ایک روز طوفان پوری شدت سے نازل ہوا اور یک لخت درجہ حرارت اتنا گر گیا کہ ہمارے جسم یخ ہو گئے۔ بیرکوں سے باہر نکلنے کی ہمت ہی کسی میں نہ تھی' لیکن انچارج کا حکم پہنچا کہ سب لوگ کام پر جانے کے لیے تیار ہو جائیں۔ ٹھیک ساڑھے سات بجے ہمیں اپنی ڈیوٹی پر پہنچ جانا چاہیے تھا' لیکن جب کیمپ نمبر 15 کا کوئی شخص حاضر نہ ہوا' تو انچارج پچاس مسلح سپاہیوں کا دستہ لے کر کیمپ میں آیا اور رائفلوں میں لگی ہوئی سنگینوں کے ذریعے ہر قیدی کو بیرکوں سے باہر نکالا گیا۔ ہمارے کیمپ میں روسی بدمعاشوں کی تعداد بھی زیادہ تھی اور چوں کہ ان کے ہم قوم ہی ان پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑتے تھے' اس لیے کبھی کبھار یہ قیدی تشدد پر اُتر آتے تھے' چناں چہ اس دن بھی یہی ہوا۔ ان روسی قیدیوں نے پہلے تو انچارج سے تلخ کلامی کی اور پھر کام پر جانے سے قطعاً انکار کر دیا۔ یہ صورت حال نہایت سنگین تھی۔ روسی قیدیوں کی دیکھا دیکھی سینکڑوں دوسرے قیدی بھی بغاوت پر آمادہ ہو رہے تھے۔ کیمپ میں خطرے کا سائرن بجا دیا گیا اور پھر تو پورے کیمپ کی مسلح فوجی قوت وہاں سمٹ آئی۔ انچارج بہت دور اندیش آدمی ثابت ہوا۔ اس نے پہلی بار نرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے طوفان کے ختم ہونے تک قیدیوں کو چھٹی دے دی۔ لیکن روسی قیدیوں کے تین سرغنوں کو پکڑ کر اپنے ساتھ لے گیا اور انہیں ''آئس بکس'' کی سزا دی گئی۔ دو قیدی تو اسی روز مر گئے اور تیسرے نے اگلے روز صبح دم توڑ دیا۔ انہیں گڑھے کھود کر دفنانے کا فرض اس کے ساتھیوں کو ادا کرنا پڑا۔ اس کے بعد کسی قیدی نے بد تر حالت میں بھی کام پر جانے سے انکار نہیں کیا۔

ایک روز جب میں اپنی ڈیوٹی ختم کر کے بیرک میں واپس آیا' تو میں نے سنا کہ

کیمپ کے اندر ایک خوفناک سازش پرورش پا رہی ہے۔ سازش یہ تھی کہ کوئلے کی کان کا اندرونی حصہ تباہ کر دیا جائے تا کہ سردیوں کے موسم تک کام رُک جائے۔ کان کا یہ اندرونی حصہ اسی وقت تباہ ہو سکتا تھا جب اس کی چھت کو سہارا دینے والے لکڑی کے موٹے موٹے شہتیروں کو گرا دیا جائے۔

یہ خطرناک سازش روسی ذہن کا شاہکار تھی جس سے جرمن' پولش اور فرانسیسی قیدی لاعلم تھے۔ مجھے بھی اس کا اتفاقیہ پتہ چلا کہ ایک روسی نے جو شراب کے نشے میں دُھت تھا' مجھے اپنا ساتھی سمجھ کر پوری تفصیل سنا دی۔ پروگرام یہ تھا کہ کان کے جس حصے میں غیر ملکی قیدی کام کرتے ہوں' پہلے اسے تباہ کیا جائے تا کہ ان کا قصہ پاک ہو اور ان کے حصے کی خوراک بھی روسیوں کے کام آئے۔ غیر ملکی قیدی جس شفٹ میں کام کرتے تھے' وہ رات کو شروع ہوتی اور صبح چھ بجے ختم ہوتی تھی اور میں صبح کی شفٹ پر جاتا تھا۔ میں نے جب اس سازش کا ذکر سنا' تو پیروں تلے سے زمین نکل گئی اور میں سوچنے لگا کہ اس سازش کو عمل میں لانے سے پہلے ہی روک دینا چاہیے' چناں چہ میں نے اپنی بیرک میں رہنے والے تین فرانسیسی اور جرمن قیدیوں کو اس سے آگاہ کیا' تو ان کے رنگ بھی زرد پڑ گئے۔ پھر آہستہ آہستہ یہ خبر دوسرے تمام قیدیوں میں بھی پھیل گئی کہ کوئلے کی کان کو تباہ کرنے کا منصوبہ عمل میں لایا جا رہا ہے۔ ہمیں بعد ازاں پتہ چلا کہ اس سازش میں بعض فوجی افسر اور سپاہی شریک ہیں جو خود موسم سرما میں ڈیوٹیاں دینے سے گھبراتے ہیں اور ان کی بھی خواہش ہے کہ سرنگوں کو تباہ کر دیا جائے تا کہ پورے مہینوں تک کام بند ہو سکے اور انہوں نے اس مقصد کے لئے ڈائنا میٹ بھی روسی قیدیوں کو مہیا کرنے کا وعدہ کیا ہے۔

اگلے روز جب وقت مقررہ پر ہم کام پر گئے اور حاضریاں لگوائیں' تو متفقہ فیصلے کے مطابق انچارج کو اس سازش سے آگاہ کیا گیا۔ اس نے پہلے تو اس پر یقین ہی نہ کیا'

لیکن جب ہم نے اسے ان روسی قیدیوں کے حوالے دیئے جو اس سازش کا تانا بانا بُن رہے تھے' تو اس کے چہرے پر تشویش کے ساتھ خوف کے آثار بھی نمودار ہوئے۔ اس نے اسی وقت پورے کیمپ کے انچارج اور متعلقہ انجینئروں کو اطلاع دی۔ ہمیں کان کے اندر جانے سے روک دیا گیا اور دوبارہ بیرکوں میں چلے جانے کی ہدایت کی۔ دوپہر تک ہمیں کچھ پتہ نہ چلا کہ کیا کارروائی عمل میں لائی گئی ہے۔ رات کی شفٹ ختم ہونے سے کچھ دیر پہلے بہت سے افسروں اور سپاہیوں کا ایک گروہ کیمپ نمبر 15 میں داخل ہوا اور انہوں نے چُن چُن کر روسی قیدیوں کو ایک جانب جمع کر دیا۔ اس کے بعد غیر ملکی قیدیوں میں سے بھی چند آدمی بیرک سے نکالے گئے' میں بھی ان میں شامل تھا۔ ہم سب کو کیمپ کے ایک بڑے کمرے میں لے جایا گیا جہاں انجینئروں اور اعلیٰ افسروں کی ایک جماعت ہماری منتظر تھی۔ ہر شخص کا بیان لیا گیا۔ روسی قیدیوں نے اس سازش سے قطعی لاعلمی کا اظہار کیا اور غیر ملکی قیدیوں پر الزام لگایا کہ انہوں نے روسیوں کو سزا دلوانے کے لیے یہ افسانہ گھڑا ہے۔ جب میری باری آئی' تو میں نے درخواست کی کہ میں کیمپ کے انچارج سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ یہ درخواست منظور ہوئی اور میں نے اس کو بتایا کہ اگر کوئلے کی کان کا اچانک معائنہ کیا جائے' تو روسی قیدیوں نے اسے تباہ کرنے کا جو منصوبہ بنا رکھا ہے' اس کا یقیناً سراغ مل جائے گا' کیوں کہ گزشتہ کئی روز سے ان میں سے بعض آدمی اپنی کدالوں اور ہتھوڑوں سے لکڑی کے شہتیروں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے رہے ہیں اور جب یہ لوگ اگلے روز ڈیوٹی پر جائیں گے' تو پھر ایسا کریں گے۔

میری یہ گزارش مان لی گئی اور سب قیدیوں کو اس ہدایت کے ساتھ بیرکوں میں بھیج دیا گیا کہ وہ آئندہ کسی قسم کی سازش نہ کریں اور جو شخص ایسی سکیمیں سوچنے کی شرارت کرنے' اسے فوراً حکام کے سامنے لائیں۔ روسی قیدی پہلے تو بڑے خوف زدہ تھے اور ان

کے منہ سے بات نہیں نکلتی تھی' لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ معاملہ ختم ہو گیا ہے' تو وہ بیرکوں میں واپس آتے ہی غیر ملکی قیدیوں پر پل پڑے اور ہاتھا پائی تک نوبت جا پہنچی۔ چار پانچ قیدی مجھ سے دست و گریباں ہو گئے اور اس سے پیشتر کہ پہرہ دینے والے سپاہی موقعے پر پہنچیں' بہت سے قیدیوں کے سر پھٹ چکے تھے' جسم لہولہان اور کپڑے تار تار...... میں نے اپنے حریفوں کو مارا اور ان سے بھی خوب پٹا۔ اس ہنگامے کی سزا ہمیں یہ ملی کہ رات کی خوراک دو روز کے لیے بند ہو گئی۔ زخموں کی مرہم پٹی البتہ کر دی گئی۔ روسی قیدیوں کو علیحدہ بیرک میں بند کر دیا گیا۔

دوسرے روز جب کہ ہم کان میں کام کر رہے تھے' کیمپ کا انچارج پہلی مرتبہ ساتھ مسلح سپاہیوں اور انجینئروں کے ساتھ کان کے اندرونی حصے میں آیا اور سیدھا اس جانب گیا جہاں روسی قیدی کوئلہ کھود رہے تھے۔ انجینئروں نے کان کے ہر حصے کا بغور معائنہ کیا اور ان شہتیروں پر کدالوں کے واضح نشانات پائے جو کان کی چھت کو سہارا دیئے ہوئے تھیں۔ کان کا یہ اندرونی حصہ اتنا خطرناک تھا کہ اس کی طرف دیکھنے سے دہشت طاری ہوتی تھی۔ چھت کہیں کہیں سے بہت زیادہ وزن کے باعث جھک رہی تھی اور لکڑی اور لوہے کے شہتیر ٹیڑھے ہو رہے تھے۔ بعض اوقات یوں محسوس ہوتا جیسے پوری چھت ایک دم آن پڑے گی۔ اتنے میں ایک زلزلہ سا آیا' کان کی دیواریں اور چھتیں ہلنے لگیں۔ بڑے بڑے پتھر اوپر سے گرنے لگے۔ قیدیوں اور مسلح سپاہیوں میں افراتفری پھیل گئی اور سب کے سب بدحواس ہو کر کان سے باہر نکلنے کے لیے اندھا دھند سڑھیوں کی طرف لپکے۔ کان سے باہر نکلنے کے دو راستے تھے۔ ایک راستہ قیدیوں کے آنے اور دوسرا کام ختم کر کے رخصت ہونے کے لیے مقرر تھا۔ انجینئروں اور اعلیٰ فوجی افسروں کے ہاتھ پیر بھی پھول گئے اور وہ بھی اپنی جانیں بچانے کے لیے دوڑ پڑے۔ کان کے اندر جلنے والے بلب یکا یک بجھ گئے اور گھپ اندھیرا چھا گیا۔ قیدیوں کی چیخ پکار سے

ایک ہنگامہ برپا ہو گیا' چوں کہ ان کو دن رات کان میں کام کرنے کا تجربہ تھا' اس لیے اکثر قیدی' جن میں بڑی تعداد غیر ملکیوں کی تھی' صحیح سلامت کان کے باہر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے' لیکن مسلح سپاہی' انجینئر اور فوجی افسر جنہیں کان کے اندر آنے کا موقع شاذ و نادر ہی ملتا تھا' ان اندھیری سرنگوں میں گم ہو کر رہ گئے۔ جونہی میں نے کان سے باہر کھلی فضا میں قدم رکھا' ایک خوفناک دھماکے کے ساتھ چھت بیٹھ گئی۔

یہ حادثہ اتنی سرعت سے پیش آیا کہ کانوں سے باہر کام کرنے والے سینکڑوں قیدی اور ان کی نگرانی کرنے والے پہرے دار اور کیمپ کے دوسرے لوگ حیران رہ گئے اور پھر وہاں نفسانفسی کا ایسا عالم طاری ہوا کہ قیدیوں نے موقع پا کر سپاہیوں سے ہتھیار چھیننے کی کوشش کی اور ان کی بیرکوں پر ہلہ بول دیا۔ میرے کئی ساتھیوں نے اس سنہری موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فرار ہونے کا ارادہ کیا' لیکن میں نے انہیں سمجھایا کہ یہاں سے فرار ہو کر ہم زیادہ عرصے تک روپوش نہیں رہ سکیں گے اور ضرور پکڑے جائیں گے' اس لیے ضروری ہے کہ ہم یہیں رہیں اور کیمپ کے اعلیٰ افسروں کی جان بچانے کے لیے کوشش کریں۔ ممکن ہے کہ ان خدمات کے عوض یہ لوگ ہماری سزاؤں میں تخفیف کر دیں۔

غیر ملکی قیدیوں نے اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر جس تندہی اور استقلال سے کام میں دبے ہوئے افسروں اور سپاہیوں کو باہر نکالا' اس نے ان کے لیے خاصا احترام اور عزت کا جذبہ روسی حکام کے دلوں میں پیدا کر دیا تھا اور انہوں نے اعلانیہ اس کا اظہار کیمپ میں کیا۔ ہماری اس خدمت کا صلہ یہ دیا گیا کہ ہر غیر ملکی قیدی کو اس کی پسند کا کام سونپا گیا اور مشقت کے اوقات میں بھی دو گھنٹے کی کمی کر دی گئی۔ میری درخواست پر مجھے ٹرانسپورٹ کے شعبے میں شریک کر لیا گیا۔ میرا خیال تھا کہ یہاں مجھے کچھ آرام مل سکے گا' مگر یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ یہ کام کچھ آسان نہ تھا۔ ٹرک' لاریاں' ویگنیں مناسب

دیکھ بھال نہ ہونے کے باعث ناکارہ ہو چکی تھیں اور حالت یہ تھی کہ ایک دو ٹرک روز ہی بگڑ جاتے تھے اور مجھے ان کے انجنوں کو درست کرنے میں کئی کئی دن لگ جاتے تھے۔ فالتو پرزے بمشکل دستیاب ہوتے تھے' اس کے علاوہ مستریوں کی بھی قلت تھی۔ کان کے حادثے نے تو پورے کیمپ کا نظام ہی درہم برہم کر دیا تھا اور جیسا کہ ہمیں کمانڈر کے مکان پر لگے ہوئے وائرلیس سے پتہ چلا کہ پورے روس میں اس حادثے پر رنج و غم کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ بہت سے روسی قیدیوں کو اس کیمپ سے نکال کر کسی دوسری جگہ پہنچا دیا گیا تھا اور ان کی جگہ نئے آدمی لائے جا رہے تھے۔ غیر ملکی قیدیوں نے چوں کہ اس ہنگامے میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا' اس لیے ان کے بارے میں اوپر سے یہ احکامات آئے کہ ان سے نرمی کا سلوک کیا جائے اور مناسب کاموں پر لگا دیا جائے' چناں چہ ہمیں پہلے سے بہتر خوراک اور کپڑے دیئے جا رہے تھے اور پہرے داروں نے بھی ہمیں بے ضرر سمجھ کر حفاظتی انتظامات نرم کر دیئے تھے۔

مارچ 53ء کے آغاز میں حالات نے دفعتہً پلٹا کھایا۔ کیمپ میں لگے ہوئے ریڈیو نے ایک روز اعلان کیا کہ کامریڈ سٹالن بہت بیمار ہے اور معالجوں نے اس کی زندگی سے مایوسی کا اظہار کر دیا ہے۔ اس خبر سے پورے کیمپ میں تصورات اور قیاسات کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ قیدیوں کے علاوہ اکثر روسی افسروں اور سپاہیوں کو کامریڈ سٹالن سے زیادہ عقیدت نہ تھی۔ اگرچہ وہ اس کے بارے میں زبان کھولتے ہوئے ہچکچاتے تھے' تاہم جب سے ریڈیو پر اس کی شدید علالت کی خبریں نشر ہوتی تھیں' میں نے محسوس کیا تھا کہ ان لوگوں کو اندرونی طور پر بے حد خوشی ہوئی ہے اور وہ اب اس کے مرنے کے منتظر ہیں۔ روسی قیدیوں نے تو کھلم کھلا اپنی خوشی کا اظہار شروع کر دیا تھا۔ آخر 6 مارچ کو دن کے دو بجے ریڈیو نے یہ خبر نشر کی کہ کامریڈ سٹالن چل بسے۔ بس پھر کیا تھا' قیدیوں نے ایک دوسرے کو مبارکباد دی اور بعض لوگوں نے تو نعرے لگانے سے بھی

گریز نہ کیا۔ روسی حکام کو بھی سٹالن کے مرنے کا کوئی رنج نہ تھا' بلکہ وہ بھی قیدیوں کے ساتھ اس خوشی میں شریک تھے۔ دبی دبی زبان سے انہوں نے قیدیوں کو یہ خوش خبری بھی سنائی کہ اب سزاؤں میں مزید تخفیف کیے جانے کا امکان ہے اور عین ممکن ہے کہ یہ کیمپ ہی بند کر دیا جائے۔

سٹالن کی وفات کے بعد ہیجان خیز خبروں کا ایک سلسلہ شروع ہوا اور پھر ایک روز ریڈیو نے یہ ڈرامائی خبر سنائی کہ سٹالن کے دست راست اور روس کی خفیہ پولیس کے سربراہ اعلیٰ بیریا کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اس خبر نے قیدیوں کا جوش و خروش انتہا کو پہنچا دیا اور انہوں نے اس روز شراب پی کر خوب جشن منایا۔ واقعہ یہ تھا کہ بیریا نے روس میں بیگار کیمپوں کی بنیاد ڈالی تھی۔ اور اس شخص کے خلاف نفرت و حقارت کا یہ عالم تھا کہ اگر لوگوں کا بس چلتا' تو وہ اس کی بوٹیاں نوچ لیتے۔ بیریا کو صحیح معنوں میں سٹالن سے بھی زیادہ قوت و اقتدار حاصل تھا اور اس شخص کی ہلاکت خیز سرگرمیوں سے کمیونسٹ پارٹی کے بڑے بڑے لوگ ہر وقت خائف رہتے تھے۔ اس نے سٹالن کے مخالفین کو چن چن کر مروا ڈالا تھا اور کسی میں اتنی جرأت نہ تھی کہ اس کے سامنے سر اٹھاتا۔ بیریا کی گرفتاری پر کیمپ کے حکام نے اعلانیہ خوشی کا اظہار کیا اور قیدیوں کو ایک ہفتے کی رخصت دے دی۔

انہی دنوں ماسکو سے کیمپ کا ایک نیا انچارج آیا۔ یہ شخص ریاست ایسٹونیا کا باشندہ تھا۔ اس نے آتے ہی کیمپ کا سارا نظام بدل ڈالا۔ قیدیوں کی نئی فہرست تیار کی گئی اور اس نے سب کو یقین دلایا کہ جو لوگ محنت اور دیانت داری سے اپنا کام کریں گے' وہ ان کی سزا میں تخفیف کر دے گا' لیکن جو قیدی شورش برپا کریں گے' انہیں سخت سزائیں دی جائیں گی۔ سٹالن اور بیریا کے ہٹ جانے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ کیمپ میں کام بند کر دیا جائے۔ اس شخص نے آتے ہی اپنی روایتی سخت گیری کا مظاہرہ کیا اور قیدیوں کو نئے سرے سے کان کھودنے پر لگا دیا۔

دن آہستہ آہستہ گزرتے گئے۔ میں بدستور ٹرانسپورٹ کے شعبے میں کام کرتا رہا۔ اس دوران میں کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔ جون کا مہینہ شروع ہوتے ہی کیمپ میں ہیضے کی وبا اچانک پھیل گئی اور چند ہی روز میں دو ڈھائی سو قیدی اور سپاہی موت کا شکار ہو گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کیمپ میں جو پانی استعمال کیا جا رہا تھا' وہ ناقص تھا۔ ہیضے کی وبا نے کیمپ کے حکام کو سراسیمگی میں مبتلا کر دیا۔ انہوں نے ماسکو اطلاع بھیجی اور وہاں سے طبی امداد کی درخواست کی۔ جواب آیا کہ کیمپ عارضی طور پر بند کر دیا جائے اور تندرست قیدیوں کو فوراً وہاں سے ہٹا لیا جائے۔ اس مقصد کے لیے سپیشل ٹرینیں بھیجی گئیں۔ قیدی دھڑا دھڑ موت کے منہ میں جا رہے تھے اور ان کی لاشوں کو دبانے والا بھی کوئی نہ تھا۔ ایسی افراتفری اور دہشت پھیلی کہ کوئی کسی کا پرسان حال نہ تھا۔ اتفاق دیکھیے کہ کیمپ کا نیا انچارج بھی اس وبا کی لپیٹ میں آیا اور مر گیا۔ سپاہیوں نے اپنی نگرانی اٹھا لی اور قیدیوں کو ٹرینوں میں بھر بھر کر مختلف قصبوں اور گاؤں میں بھیجا جانے لگا۔ سیاسی قیدیوں کے علاوہ سب سے بڑا مسئلہ ان ہزارہا اخلاقی قیدیوں کا تھا جو اس کیمپ میں عمر بھر کے لیے بھیجے گئے تھے۔ ان میں چور' ڈاکو' قاتل سبھی قسم کے قیدی تھے اور ظاہر ہے کہ ان کو کسی قیمت پر چھوڑا نہیں جا سکتا تھا' لیکن وبا نے جو خطرناک صورت اختیار کر لی تھی' اس نے ان قیدیوں کے لیے فرار کے سارے راستے کھول دیئے تھے۔ انہوں نے ایک روز مسلح سپاہیوں پر ہلّہ بول دیا' ان کی رائفلیں چھین لیں۔ پھر ٹرکوں اور لاریوں پر قبضہ جما لیا اور جدھر جس کے سینگ سمائے اُدھر بھاگ نکلا۔

پچاس غیر ملکی قیدیوں کا ایک گروہ جس میں میں بھی شامل تھا' بمشکل ایک ٹرین میں سوار ہونے میں کامیاب ہوا۔ ہم سب ایک ہفتے کے فاقے سے تھے۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ مکمل فاقہ کریں اور کچھ کھائیں نہ پئیں۔ یہی وجہ تھی کہ ہم میں سے کوئی بھی ہیضے کا شکار نہیں ہوا۔ ایک ہفتے کی بھوک پیاس نے ہمیں

نڈھال ضرور کر دیا تھا۔ جب ہم کیمپ کی حدود سے باہر نکل گئے' تو ہم نے اطمینان کا سانس لیا۔ ایک سٹیشن پر جب گاڑی رُکی' تو مسلح گارڈوں نے جو ریل کی نگرانی کر رہے تھے' ہم پر ترس کھایا اور تازہ پانی اور باسی روٹیاں مہیا کیں' جنہیں کھا کر جان میں جان آئی۔ اس کے بعد ماسکو پہنچنے تک' جس میں پورے دس دن صرف ہوئے' ہمیں صرف اُبلے ہوئے چاولوں اور پانی پر گزارہ کرنا پڑا۔

ماسکو میں ہمیں زبردست پہرے میں فوجی ہیڈ کوارٹر لے جایا گیا۔ ہر ایک سیاسی قیدی کی تصویر اور انگلیوں کے نشانات اُتارے گئے اور سب کی فائلیں ازسرنو تیار کی گئیں۔ بتایا گیا کہ ہمیں جلد ہی نئے کیمپ میں بھیجا جائے گا۔ یہ سنتے ہی ہمارے دل دہل گئے اور ہم نے سمجھ لیا کہ اس سرزمین سے صحیح سلامت اپنے وطن پہنچنا کبھی نصیب نہ ہوگا۔ ایک ماہ تک ہمیں ماسکو کی جیل میں رکھا گیا۔ ہر قیدی کے لیے علیحدہ علیحدہ کوٹھڑی کا بندوبست کیا گیا۔ کسی کو آپس میں بات کرنے کی اجازت نہ تھی۔ ایک روز جب کہ میں اپنی کوٹھڑی میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ نئے کیمپ میں جا کر نہ جانے مجھ سے کیا کام لیا جائے گا اور وہاں کن کن اذیتوں کا سامنا کرنا پڑے گا کہ دروازہ کھلا اور ایک سارجنٹ مجھے اپنے ساتھ اعلیٰ کمانڈر کے دفتر میں لے گیا۔ کمانڈر نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا اور مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا۔ پھر وہ مسکرا کر کہنے لگا:

''مسٹر پڈنگٹن' کیا آپ جلد سے جلد ہمارا ملک چھوڑ سکیں گے؟''

میں دم بخود ہو کر اس کی صورت تکنے لگا۔ مجھے اپنے کانوں پر اعتبار نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ شاید وہ مذاق کے موڈ میں تھا۔ میں نے بے دلی جواب دیا:

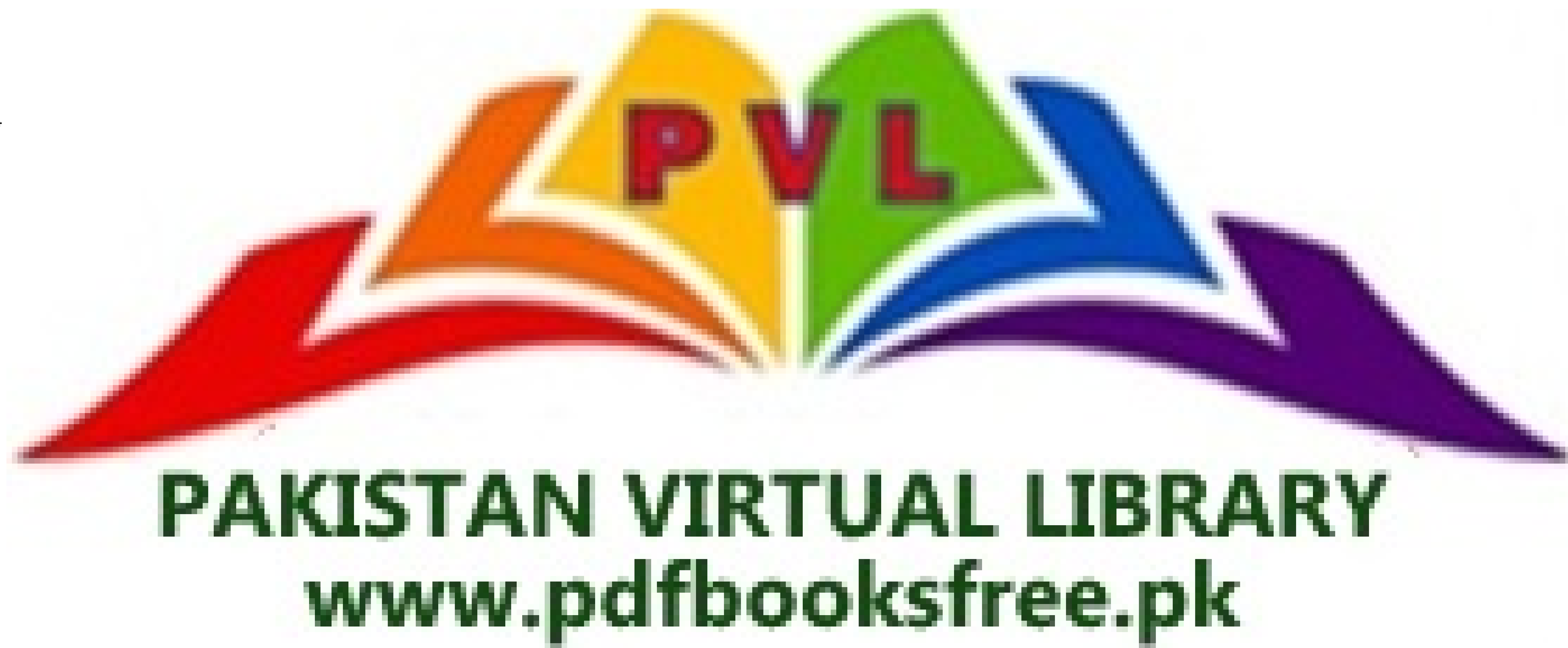
''یہ ملک شاید میں مرنے کے بعد ہی چھوڑ سکوں گا۔ اس سے پہلے تو مجھے کوئی امید نہیں۔''

یہ سُن کر اس نے قہقہہ لگایا اور ایک لمبا کاغذ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا:

''براہ کرم اس پر دستخط کر دیجیے۔ تمہارے بارے میں ابھی ابھی یہ حکم آیا ہے کہ اس شخص کو فوراً مشرقی جرمنی کی سرحد پر پہنچا دیا جائے۔ تمہارے لیے خصوصی ویزا بھی تیار کر دیا گیا ہے۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر تم ہوائی جہاز سے مشرقی جرمنی کی طرف پرواز کرو گے۔''

میں آج کل لندن میں ہوں۔ اس واقعے کو اتنے برس بیت چکے ہیں' لیکن مجھے کوشش کے باوجود پتہ نہیں چل سکا کہ روسی خفیہ پولیس نے مجھے اچانک رہا کر دینے کا فیصلہ کیوں کیا۔ میں تو اتنی اہم شخصیت بھی نہ تھا۔ میں اس معمے کا حل سوچتے سوچتے تھک گیا ہوں' مگر کامیاب نہیں ہوا۔

* * *



آسکر ذنّر

ستمبر 1946ء کی وہ صبح میں کبھی فراموش نہیں کرسکوں گا۔ جب کہ میں دھڑکتے ہوئے دل اور مرجھائے ہوئے چہرے کے ساتھ کیلیٹی کے ریلوے اسٹیشن پر کھڑا تھا۔ ہر طرف موت اپنے خوف ناک جبڑے کھولے ہوئے نظر آ رہی تھی۔ کیلیٹی کا چھوٹا سا قصبہ بوڈاپسٹ میں شامل تھا جہاں روسی فوجوں نے سفاکانہ قتل عام کیا تھا۔ میرے اعصاب پر ایک ناقابل برداشت بوجھ محسوس ہو رہا تھا اور مجھے بخوبی علم تھا کہ اگر میں نے اپنے خوف و اضطراب پر جلد ہی قابو نہ پالیا' تو میں ہنگری سے فرار ہوکر صرف موت کے منہ ہی میں جاسکوں گا۔

ریلوے سٹیشن پر سرخ سپاہی سنگینیں تانے ٹہل رہے تھے۔ آسٹرین پناہ گزینوں کا قافلہ تیار کھڑا تھا اور اب ایک ایک آدمی کو آواز دے کر گاڑی میں بٹھایا جانے والا تھا۔ میں دل ہی دل میں خدا سے دعائیں مانگ رہا تھا کہ آسکر ذنّر کا نام جلدی جلدی پکارا جائے تاکہ میرے دل پر جو وزن رکھا ہوا ہے وہ دور ہو۔ میں جانتا تھا کہ اگر رازافشا ہوگیا تو میں ایک سیکنڈ سے زیادہ اس فضا میں سانس نہیں لے سکتا اور رائفل کی کئی گولیاں میرے سر میں سوراخ کرتی ہوئی نکل جائیں گی۔

قسمت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ دس روز پیشتر میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہ تو اس شخص آسکر ذنّر کو دیکھا تھا اور نہ اس کا نام سنا تھا......لیکن ایک روز ایسا ہوا کہ میرا ایک پرانا دوست خفیہ طور پر میرے پاس آیا اور اسے معلوم تھا کہ آسٹرین پناہ گزینوں کا قافلہ

کب بوڈاپسٹ سے روزانہ ہوگا۔ یہ آسٹرین بوڈاپسٹ میں رہتے تھے اور اب جبری طور پر انہیں ان کے وطن بھیجا جا رہا تھا۔

''پناہ گزینوں کی فہرست بن چکی تھی'' میرے دوست نے کہا......''اور ان سب کو روسیوں نے خط بھیج کر اطلاع دے دی ہے کہ فلاں تاریخ کو بوڈاپسٹ سے ویانا جانے والی آخری ٹرین روانہ ہوجائے گی......تمام پناہ گزینوں نے تحریری طور پر ان خطوط کا جواب دے دیا ہے لیکن ان میں سے ایک شخص کا جواب ابھی تک موصول نہیں ہوا۔ ممکن ہے وہ مر چکا ہو۔ یہ شخص ایک اچھا مصور ہے اور اس کا نام آسکر ذنّر ہے۔ بولو! کیا تم آسکر ذنّر کی شخصیت اختیار کرکے یہاں سے فرار ہونا چاہتے ہو؟''

یہ الفاظ سن کر میں کانپ اٹھا......خدا رحم کرے...... میں تو یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ آسکر ذنّر کون ہے اور کس قسم کی شخصیت کا مالک ہوگا۔ اگر روسی سپاہیوں کو پتہ چل گیا کہ ایک اتحادی جاسوس آسکر ذنّر کے نام سے فرار ہو رہا ہے تو وہ موقعے ہی پر مجھے ہلاک کر دیں گے......کیا عجب تماشا تھا کہ مجھے ہنگری کا باشندہ ہوکر ایک آسٹروی پناہ گزین کی حیثیت میں ویانا جانا پڑ رہا تھا۔ لیکن مجھے تو ہر صورت میں اپنے وطن سے فرار ہونا تھا۔ ورنہ جلد یا بدیر میرا بھی وہی حشر ہونے والا تھا جو میرے کئی ساتھیوں کا ہوا تھا۔ میں نے ہنگری پر نازی قبضہ کے دوران اور پھر روسی حملے کے وقت اتحادی طاقتوں کے لیے جاسوسی کی خدمات انجام دی تھیں اور اب مجھے اس مقام سے فرار ہوجانا چاہیے تھا۔ لیکن روسی ظالموں نے بوڈاپسٹ اور اس کے گرد ونواح کا ایسا کڑا محاصرہ کر رکھا تھا کہ ایک چوہے کا بھی بغیر اجازت فرار ہوجانا ناممکن تھا۔ جب میرے ساتھیوں کو گولی کا نشانہ بنا دیا گیا تو میں فوراً پوشیدہ ہوگیا تھا اور صرف ایک شخص کو میرا پتہ تھا۔ یعنی وہی میرا دوست' جو ایک خطرناک مہم کی تجویز لے کر میرے پاس آیا تھا۔

فرینس لازلو کی شخصیت میں تبدیلی کرنے کے لیے مجھے کسی پاسپورٹ کی ضرورت نہ تھی کیوں کہ روسیوں نے اس بڑے پیمانے پر قتل و غارت اور آتش زنی کا مظاہرہ

کیا تھا۔ کہ بوڈاپسٹ کا کوئی گھر محفوظ نہ رہا تھا اور تمام کاغذات اور سامان جل کر راکھ ہوگیا تھا۔ میرے دوست نے مجھے چند ٹائپ شدہ کاغذات دیئے۔ ان میں آسکر ذنر کی شخصیت اور زندگی کے بعض واقعات تحریر تھے۔

"خوب اچھی طرح جان لو کہ تم اب آسکر ذنر ہو...... میرے دوست نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ "اب تم فرینس لازلو نہیں ہو...... اپنی شخصیت اور نام کو قطعی فراموش کردو۔ آسکر ذنر تمہارا نام ہے اور تم اس کی ہر عادت اپنے آپ میں پیدا کرلو۔" یہ کہہ کر اس نے ان کاغذات کو تھپ تھپایا اور بولا...... "سرحدوں پر روسی پہرے داروں کے پاس ان کاغذات کی ایک ایک نقل ہوگی اور مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ وہ کس سختی سے چیکنگ کریں گے۔ اس کے علاوہ ان کاغذات کی ایک نقل تمہارے قافلے کے سپروائزر کے پاس ہوگی۔ وہ آسکر ذنر سے واقف نہیں ہے' لیکن تم اس بات کا خیال رکھنا' کہ جب آسکر ذنر کا نام پکارا جائے تو جواب دینے سے پہلے چند لمحے انتظار کرلینا......"

"انتظار"......؟ میں نے حیرت سے پوچھا۔ "کس بات کا انتظار؟"

"ارے بھئی یہ عین ممکن ہے کہ اصلی آسکر ذنر ہی نہ نکل آئے۔" میرے دوست نے کہا "اگر تم دونوں نے بیک وقت جواب دے دیا تو تم جانتے ہو اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ یہ سمجھ لو کہ ان میں سے جو نقلی آسکر ذنر ہوگا وہ وہیں مارا جائے گا......"

یہ سن کر میں ایک بار پھر کانپ اٹھا...... ہرچند کہ اس طرح فرار ہونے میں سو فی صد جان کا خطرہ تھا لیکن اس کے سوائے اور کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ چند روز تک میں نے ان کاغذات میں درج شدہ ایک ایک حرف اچھی طرح رٹ لیا اور میں آسکر ذنر کی زندگی سے اتنا آگاہ ہوگیا کہ جتنا خود اپنی زندگی سے آگاہ تھا۔ اب میں بلاجھجک یہ بتا سکتا تھا کہ آسکر ذنر جس گھر میں پیدا ہوا تھا اس میں کتنے کمرے تھے۔ ہر کمرہ کس طرح استعمال ہوتا تھا۔ آسکر ذنر کی پرورش کیسے ہوئی' اس نے کہاں تک تعلیم پائی' اس میں کون سی عادات پختہ تھیں۔ اس کی پسند اور ناپسند کا معیار کیا تھا۔ وہ کیسی تصویریں بناتا

تھا اور تصویر بنانے کا سٹائل تک میں نے ذہن نشین کرلیا۔ مجھے یہ بھی یاد تھا کہ نقادوں نے اس کی بعض تصویروں پر کن الفاظ میں تنقیدیں کی تھیں اور اس نے جن جن قیمتوں پر اپنی تصویریں فروخت کی تھیں۔ ان قیمتوں کی فہرست بھی مجھے یاد تھی۔ اور یہ بھی معلوم تھا کہ کن کن لوگوں نے وہ تصویریں خریدی تھیں۔ غرضیکہ میں نے آسکر ذنر کی شخصیت اختیار کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

جس روز صبح مجھے روانہ ہونے کے لیے اسٹیشن پر جانا تھا' اس رات میں نے آسکر ذنر کی سوانح حیات کے کاغذات جیبوں میں رکھے اور فرانز جوزف برج کو عبور کرکے دریائے ڈوبنی کے کنارے پہنچ گیا۔ یہاں میں نے ان کاغذات کو پرزے پرزے کرکے دریا میں بہا دیا کیوں کہ یہ کاغذات اگر میرے پاس سے برآمد ہوجاتے تو ہر صورت میں زندگی کا خاتمہ تھا۔

دفعتہً ریلوے سٹیشن پر لگے ہوئے لاؤڈ سپیکر پر ایک گونجتی ہوئی آواز نے مجھے خیالات کے بھنور سے نکال دیا۔ اور پھر ایک گرجتی ہوئی آواز حروف تہجی کی ترتیب سے پناہ گزینوں کے ناموں کی فہرست پڑھتی سنائی دی۔ جوں جوں نام آتے جاتے میرا کلیجہ منہ کو آتا گیا۔ ذرا قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ میرا نام بھی سب سے آخری کے حرف یعنی زیڈ (Z) سے شروع ہوتا تھا...... خوف سے میرے ہاتھ کانپ رہے تھے اور یہ کیفیت چھپانے کے لیے میں نے اپنے ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں ڈال لیے۔

آخر کار یہ جان کنی کا لمحہ ختم ہوا...... ذنر...... آسکر...... ذنر......" لاؤڈ سپیکر پر آواز گونجی۔ میں فوراً جواب میں پکارنا چاہتا تھا لیکن میرے حلق سے آواز ہی نہ نکلی...... میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ میرے کان بج رہے تھے اور ذہن دعا میں مصروف تھا کہ اے خدا کہیں اصلی آسکر ذنر جواب میں نہ بول پڑے۔

"ذنر...... آواز سخت لہجے میں دوبارہ گونجی۔ میں نے قدم آگے بڑھایا اور ہچکچاتے ہوتے جواب دیا۔

"میں حاضر ہوں جناب۔"

اس عرصے میں اصلی آسکر ذنر نمودار نہیں ہوا۔ بہرحال اب تک تمام معاملہ اچھی طرح چل رہا تھا۔ پھر سب پناہ گزینوں کو دس گروپوں میں تقسیم کر کے بھیڑ بکریوں کی مانند گاڑی کے ڈبوں میں ہانک دیا گیا۔ ڈبے میں اپنی نشست پر بیٹھنے کے بعد دل ہی دل میں میں بار بار آسکر ذنر کی سوانح حیات دہراتا رہا۔ "میں تصویریں بناتا ہوں...... میں گراز میں پیدا ہوا۔ میرا باپ معماروں کا کام کیا کرتا تھا......"

اسٹیشن کے پلیٹ فارم سے ایک چیختی ہوئی سیٹی کی آواز سنائی دی۔ یہ ریل گاڑی کے لیے روانگی کا اشارہ تھا۔ لیکن گاڑی نے جنبش بھی نہ کی۔ دفعتہً ہمارے ڈبے کے باہر روسی زبان میں زور زور سے باتیں کرنے کی آوازیں آئیں اور دوسرے ہی لمحے چار روسی فوجی افسر چپ راست کرتے ہوئے ہمارے کمپارٹمنٹ کے دروازے پر آن پہنچے پھر وہ دوسرے کمپارٹمنٹ کے دروازے پر رکے اور میں نے سنا کہ انہوں نے کمپارٹمنٹ کے تمام پناہ گزینوں کو تحکمانہ انداز میں باہر نکلنے کا حکم دیا۔ بے چارے پناہ گزین ڈبے سے نکل کر ریل کی کاریڈور میں بیٹھ گئے۔ فوجی افسروں نے کمپارٹمنٹ پر قبضہ جما لیا اور تھوڑی دیر بعد ہی ان کے قہقہوں اور شراب کے گلاسوں کی کھنکھناہٹ سے کمپارٹمنٹ گونج رہا تھا۔ سیٹی کی آواز ایک مرتبہ اور فضا میں گونجی اور ریل حرکت میں آ گئی۔

جوں جوں ریل کی رفتار تیز ہوتی گئی۔ میرے خیالات کی رفتار میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ میرا دل اندر سے رو رہا تھا۔ میرا پیارا وطن آج ہمیشہ کے لیے مجھ سے چھوٹ رہا ہے...... خدا ہی بہتر جانتا تھا کہ مجھے کبھی دوبارہ آنا نصیب ہوگا بھی یا نہیں...... تب مجھے یاد آیا کہ میں تو آسکر ذنر ہوں...... اور ایک آسٹروی پناہ گزین کی حیثیت سے اپنے وطن ویانا جا رہا ہوں۔

کیلن فولڈ کے اسٹیشن پر پہنچ کر ریل ٹھہر گئی۔ سب سے پہلا چیک پوائنٹ تھا اور

ہمیں زیادہ دیر تک روسی آفیسر اور اس کے ترجمان کا انتظار نہیں کرنا پڑا...... چند لمحوں بعد ہی وہ روسی سپاہیوں کے ہمراہ ریل کی راہداری میں نمودار ہوا۔ وہ بھاری اسلحہ سے مزیّن تھے اور چاق و چوبند کھڑے کارروائی کے منتظر تھے۔ روسی افسر نے جوستے ہوئے چہرے کا پست قد آدمی تھا میرے سامنے بیٹھی ہوئی عورتوں سے اپنی چیکنگ کی ابتداء کی۔ اس کے ہاتھوں میں ہر فرد کے نام اور زندگی کے ضروری حالات کی تفصیل پر کاغذات کا ایک پلندہ دبا ہوا تھا۔ ان میں سے وہ باری باری کاغذ چھانٹتا اور روسی زبان کے کرخت لہجے میں عورتوں سے مختلف سوالات پوچھتا جاتا تھا۔ جن کا ترجمہ جرمن زبان میں اس کا ترجمان کر رہا تھا۔ اسی طرح چیکنگ کرتا ہوا وہ میرے مقابل کی کھڑکی کے قریب بیٹھے ہوئے ایک شخص کے پاس پہنچ گیا اور میں نے ایک مرتبہ پھر دل ہی دل میں "اپنی سوانح حیات" کے ابتدائی الفاظ دہرانے شروع کر دیئے۔ "میں ایک مصور ہوں'...... میں گراز میں پیدا ہوا تھا...... میرا نام...... میرا نام......

میری پیشانی پسینے کے سرد قطروں سے تر ہوگئی...... اور کلیجہ اندر ہی اندر بیٹھنے لگا...... خدا کی پناہ کیا میرا ذہن ماؤف ہو چکا تھا...... مجھے نام یاد نہ آتا تھا...... دراصل یہ میرے کشیدہ اعصاب کا اثر تھا...... میں نے ایک مرتبہ پھر تمام باتیں یاد کرنی شروع کیں...... چیکنگ آفیسر کی آواز جیسے خلا سے آتی ہوئی سنائی دے رہی تھی اور پھر میں نے دیکھا کہ وہ میرے ساتھ بیٹھی ہوئی عورت کی جانب متوجہ ہوا اور میں نے دل ہی دل میں گڑگڑا کر خدا سے نام یاد آنے کی دعا مانگی۔

"اے خدا! رحم کر...... میں ایک مصور ہوں...... میں گراز میں پیدا ہوا تھا...... میرا نام...... میرا نام......"

میں نے لاکھ زور مارا۔ ذہن کو خوب جھٹکے دیئے لیکن نام کچھ ایسا حافظہ کی لوح سے مٹا تھا کہ یاد ہی نہ آتا تھا۔ اب میں موت کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھا۔ یقیناً اس عورت کے بعد اب میرا ہی نمبر آتا تھا۔ اور عین اسی لمحے اگلے کمپارٹمنٹ کا زور سے

دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ پھر راہداری میں باتوں کی آواز سنائی دی اور پھر سرخ فوج کے ایک کرنل نے ہمارے کمپارٹمنٹ میں جھانکا۔

''ورسپیلیٹ چیز ہے؟''اس نے جرمن زبان کے تندو تلخ لہجے میں سوال کیا۔''تم میں کوئی شطرنج کھیلنے والا ہے؟''

ہمارے چیکنگ آفیسر نے اس بے جا مداخلت پر فوراً مڑ کر گھورتی ہوئی نظروں سے کرنل کو دیکھا اور جونہی اس نے اپنے افسر اعلیٰ کو پہچانا ادب سے فوجی سلام کر کے ایک قدم اور پیچھے ہٹ گیا۔ چونکہ میں کمپارٹمنٹ کے دروازے کے قریب ہی بیٹھا تھا' اس لیے کرنل نے اپنا سوال براہ راست مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھا:

''کیا تم شطرنج کھیلتے ہو؟''

شطرنج کھیلتے ہوئے مجھے دس برس کا طویل عرصہ بیت چکا تھا' لیکن ایک خیال بجلی کی مانند میرے ذہن میں آیا۔ میں اس وقت سکون چاہتا تھا تا کہ اپنا نام یاد کرلوں۔ اس اثنا میں کمپارٹمنٹ کے کسی دوسرے شخص نے کرنل کے سوال کا جواب نہیں دیا تھا۔ پس میں نے کہا۔

''میں شطرنج کھیلنی جانتا ہوں۔''

...... یہ سن کر کرنل نے مجھے آنے کا اشارہ کیا اور میں دوسرے کمپارٹمنٹ میں پہنچ گیا۔ جہاں فوجی افسر موجود تھے جنہوں نے کمپارٹمنٹ کے پناہ گزینوں کو نکال کر خود قبضہ جما لیا تھا۔ ان میں سے دو کرنل تھے اور ایک جنرل تھا جس کے کشادہ سینے پر بے شمار رنگ برنگے تمغے لٹک رہے تھے اس کی عمر پچاس سال کے قریب تھی' لیکن اس عمر میں بھی تن و توش کے لحاظ سے وہ کسی دیو سے کم نہ تھا۔ کمپارٹمنٹ میں پہنچ کر مجھے پتہ چلا کہ جنرل صاحب ہی دراصل شطرنج کے شوقین تھے اور مجھے انہی کے ساتھ زندگی کی بازی کھیلنی تھی۔ میرے پہنچنے پر جنرل نے کرنل کا شکریہ ادا کرتے ہوئے مجھے اپنے مقابل کی نشست پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میرے سامنے مٹھائیوں کے ڈبوں اور سینڈوچز کا

انبار لگا ہوا تھا۔ کھڑکی کے قریب رکھی ہوئی ایک چھوٹی سی میز پر ووڈکا شراب اور ہنگری شراب کی کئی بوتلیں اور چند گلاس رکھے تھے۔ جنرل نے میری جانب پسندیدہ نگاہوں سے دیکھا۔ پھر شراب اور مٹھائیوں کی جانب اشارہ کر کے تحکمانہ لہجے میں بولا:

''ڈاوَئی......''اس نے روسی زبان میں کہا......''چلو شروع ہو جاؤ......''

میں نے اس سہمے ہوئے جانور کی مانند جسے ذبح کرنے سے پیشتر قصائی کھلا پلا دیتا ہے چند سینڈوچز اور برانڈی کا ایک گلاس پیا۔ اس تمام عرصے میں میرے دل کو برابر دھڑکا لگا رہا کہ ابھی کوئی لمحہ جاتا ہے جنرل میرا نام دریافت کرے گا۔ عین ممکن ہے کہ چیکنگ آفیسر وہاں سے فارغ ہو کر سیدھا یہیں آ جائے......اس اثناء میں گاڑی اپنی منزل مقصود کی جانب روانہ ہو گئی۔ تب جنرل نے شطرنج کی بساط اور مہرے نکال کر میز پر بچھا دیئے اور انہیں ترتیب دینے میں مصروف ہو گیا۔

''خدا ہی اب میرا مددگار ہے۔''میں نے دل میں سوچا''یہ بازی میری زندگی اور موت کی بازی ہو گی اور مجھے کوشش کر کے کھیل اچھا کھیلنا چاہیے تا کہ ان ظالموں کا دھیان کھیل ہی میں لگا رہے۔ میں بخوبی جانتا تھا کہ اگر میں جیت گیا تو یہ فوجی لوگ مجھے کبھی نہیں بخشیں گے۔ کیوں کہ یہ لوگ اپنا ہار جانا اچھا نہیں سمجھتے۔ بہرحال کھیل شروع ہو گیا اور قسمت کی خوبی دیکھیے کہ میں نے شروع میں جنرل کے دو مہرے مار لیے اور کھیل آہستہ آہستہ میرے حق میں چلنے لگا۔ دوسرے فوجی افسر نہایت مؤدبانہ خاموشی سے ہمارا کھیل دیکھنے میں مصروف تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جنرل نہایت اچھا کھلاڑی تھا۔ تاہم میں نے جان بوجھ کر اسے جیتنے کا راستہ دکھایا۔ اور کھیل نہایت سرگرمی سے جاری رہا۔

وقت پر لگا کر اڑتا رہا۔ بازی جاری رہی۔ آخر کار ریل کی رفتار ایک مرتبہ پھر مدھم ہونے لگی۔ اور پھر وہ گیئر کے اسٹیشن پر رُک گئی۔ یہ دوسرا چیک پوائنٹ تھا۔ میرا دل پھر زور زور سے دھڑکنے لگا۔ دفعتہً فوجی کمپارٹمنٹ کا دروازہ جھٹکے سے کھلا اور آسٹرین گروپ کے سپروائزر نے اندر قدم رکھا۔

"اس شخص سے ابھی تک پوچھ کچھ نہیں کی گئی ہے۔" اس نے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔

لیکن اب مجھے فکر کرنے کی ضرورت نہ تھی زبان سے ایک لفظ نکالے بغیر دیو قامت جنرل اپنی نشست سے اٹھا اور ریچھوں کی مانند اپنا پنجہ بے چارے سپروائزر کے سینے پر اس زور سے مارا کہ وہ لڑھک کر دور جا گرا۔ جنرل نے اسے لات مار کر کمپارٹمنٹ سے باہر نکال دیا۔ پھر اس نے زور سے دروازہ بند کیا اور میری جانب واپس آتے ہوئے گرجدار لہجے میں کہا۔

"ڈاوئی میگر......تمہاری چال ہے ہنگرین۔"

ہنگرین......جنرل کے منہ سے اپنے لیے ہنگرین کا لفظ سن کر میرے بدن کا سارا خون سوکھ گیا......خدا کی پناہ تو کیا اسے معلوم ہے کہ میں آسٹروی پناہ گزین نہیں ہوں بلکہ ہنگری کا باشندہ ہوں؟ ممکن ہے اس نے اس سبب سے کہہ دیا ہو کہ میں ہنگری سے ویانا جا رہا تھا......دو ایک مرتبہ میں نے محسوس کیا کہ اس کی عقابی نظریں میرے چہرے کا جائزہ لے رہی ہیں۔ لیکن جب میں اس کی جانب دیکھتا تو وہ فوراً اپنی نظریں پھیر کر بساط کی جانب متوجہ ہو جاتا۔ جب پہلی بازی ختم ہوئی' جس کی جیت کا سہرا جنرل کے سر رہا تو اس نے منہ پھیر کر اپنے ماتحت افسر سے روسی زبان میں کچھ کہا جو جرمن زبان بول سکتا تھا۔ اس نے ترجمہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔

"جنرل صاحب کو تمہارا کھیلنے کا انداز بہت پسند آیا ہے اور وہ ایک بازی اور کھیلنا چاہتے ہیں۔"

اس سے پہلے کہ ہم دوسری بازی شروع کرتے جنرل نے اصرار کیا کہ میں تھوڑی سی شراب اور چکھوں میں نے حکم کی تعمیل کی۔ ووڈ کا شراب نے میرے کشیدہ اعصاب کو اصلی حالت پر لانے میں بڑی مدد دی اور میں ایک بار پھر ہمہ تن توجہ سے کھیل میں مصروف ہو گیا اور پھر اچانک مجھے محسوس ہوا کہ بازی سراسر میرے حق میں جا رہی ہے

اور میں عنقریب جیتنے ہی والا ہوں۔ اور جب کہ بازی ہار جیت کے انتہائی نازک مرحلوں سے گزر رہی تھی' ٹرین آخری چیک پوائنٹ یعنی ہیگ شیلوم کے اسٹیشن پر رک گئی یہ وہ مقام تھا جہاں زندگی اور موت کی بازی میں ہار جیت کا فیصلہ ہونا مقدر تھا۔

اس مرتبہ ایک درجن کے قریب سپاہی اپنے کندھوں پر رائفلیں اٹھائے ہوئے اور اپنی پیٹیوں سے دستی بموں کے بنڈل باندھے ہوئے ایک جلوس کی صورت میں نمودار ہوئے ان کے ساتھ ترجمانوں اور حفاظتی گارڈوں کی بھاری تعداد تھی۔ انہوں نے سرسری طور پر ہمارے کمپارٹمنٹ میں نظریں دوڑائیں اور آگے بڑھ گئے۔ دوسرے کمپارٹمنٹ میں یقیناً اس پست قامت چیکنگ آفیسر نے فوجیوں کو بتایا ہوگا کہ جنرل کے ساتھ شطرنج کھیلنے والا ایک "آسٹرین" ہے جسے ابھی تک چیک نہیں کیا گیا ہے۔ چناں چہ دومنٹ بعد ہی ایک گارڈ اس معاملہ کی تحقیق کے لیے کمپارٹمنٹ کے دروازے پر نمودار ہوا۔ نہایت چستی سے اس نے فوجی افسروں کو سلیوٹ کیا اور میری جانب اشارہ کرتے ہوئے روسی زبان میں جلد جلد کچھ کہنے لگا۔

ایک بار پھر میرا خون سرد ہو کر میری رگوں میں منجمد ہونے لگا۔ اب یقیناً جنرل مجھے ان کے ساتھ جانے کا حکم دے دے گا۔ میں نے منہ ہی منہ میں اپنا سوانحی خاکہ یاد کرنا شروع کر دیا......"میں ایک مصور ہوں......اور میرا نام......" میں نے بہت کوشش کی کہ نام یاد آ جائے لیکن نام ذہن سے کچھ اس طرح خارج ہو چکا تھا جیسے کبھی ذہن میں نہ تھا۔

گارڈ نے جونہی منہ سے چند جملے نکالے میں نے دیکھا کہ جنرل کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا' میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ گارڈ نے اس سے کیا کہا ہے لیکن اتنا ضرور اندازہ ہوا کہ گارڈ کے فقروں نے جنرل کو غصے اور طیش کی آگ میں دھکیل دیا ہے۔ اس سے پیشتر میں نے کبھی کسی شخص کو اس طرح غصے میں نہیں دیکھا تھا۔ اس نے وحشیانہ انداز میں ایک بار میری جانب دیکھا تب اس نے احتیاط سے شطرنج کی بساط اٹھا کر میز کے نیچے رکھ دی اور خود اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"بس اب میرا خاتمہ ہے۔" میں نے دل میں سوچا۔ پھر جنرل نے اپنا ہاتھ اس انداز میں پیچھے ہٹایا جیسے وہ تلوار نکال رہا ہو اور دفعتہً گارڈ کے منہ پر اس زناٹے کا تھپڑ پڑا کہ وہ لڑھکنیاں کھاتا ہوا کمپارٹمنٹ کی دیوار سے جاٹکرایا۔ جنرل نے اس کو گریبان سے پکڑ کر اٹھایا اور دو تین گھونسے اور لاتیں مار کر کمپارٹمنٹ کے باہر پھینک دیا۔ اس کے بعد اس نے اس زور سے دروازہ بند کیا کہ پورے کمپارٹمنٹ میں زلزلہ آ گیا۔ پھر وہ غصے سے بڑبڑاتا ہوا اپنی نشست پر آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے میز کے نیچے سے شطرنج کی بساط نکالی اور مہرے ترتیب دینے لگا۔

"چلو......شروع کرو۔" اس نے مجھے حکم دیا اور میں نے اطمینان کا سانس لے کر کھیل کی ابتداء کر دی۔

اس مارپیٹ کے بعد کسی فوجی سپاہی یا چیکنگ آفیسر نے ہمارے کمپارٹمنٹ کے نزدیک آنے کی جرأت نہ کی۔ گاڑی نے جونہی رفتار تیز کی تو پہلی مرتبہ میں نے سکون کا سانس لیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے خوف و اضطراب کا جو منوں بوجھ میرے سینے پر رکھا تھا وہ اب دور ہو چکا ہے اور پہلی بار کھیل کے دوران میں مسکرایا۔ جنرل نے بساط سے نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا اور جواباً وہ بھی مسکرا دیا۔ پھر اس نے اپنے ماتحت آفیسر سے روسی زبان میں کچھ کہا' جس نے جرمن زبان میں ترجمہ کرتے ہوئے مجھے بتایا۔

"جنرل صاحب پوچھتے ہیں کہ کیا تم ویانا میں بھی ان کے چندروزہ قیام کے دوران شطرنج کے لیے وقت دے سکو گے؟"

"بتاؤ تم کہاں انہیں مل سکتے ہو؟"

اور میری زبان سے خود بخود ویانا ہوٹال کا نام نکل گیا۔

"اور تمہارا نام؟" آفیسر نے پوچھا۔ اور میں نے بلا جھجک اور بغیر اٹکے فوراً جواب دیا۔ "آسکر ذرّ۔"

اب میں سوچتا ہوں تو سخت تعجب ہوتا ہے کہ میں ان دو سادہ سے الفاظ کو کیسے بھول گیا تھا؟

❊ ❊ ❊

نئی زِندگی

میں خاص وجوہ کی بناء پر اس ایئر پورٹ کا نام نہیں بتاؤں گی جہاں سے میری زندگی کے اس ناقابل فراموش واقعہ کی ابتدا ہوئی تھی۔ صرف اتنا بتا سکتی ہوں کہ وہ ایئر پورٹ "آہنی پردے کے پیچھے" واقع تھی اور امریکہ کا یہ آخری جہاز تھا جو اس ایئر پورٹ سے پرواز کرنے والا تھا۔ اکتوبر کی اس گرم دوپہر کو ہمارا جہاز صرف ایک گھنٹے کے لیے یہاں رکا تھا' اعلیٰ افسروں کے احکام یہ تھے کہ ہم ایک گھنٹے سے زائد عرصے تک یہاں نہیں ٹھہر سکیں گے۔ اس ایک گھنٹے میں ہمیں صرف ایندھن بھرنا تھا اور چھ مسافروں کو لے کر فرنیکفرٹ کی طرف واپس پرواز کرنی تھی۔ اس وقت مجھے کیا معلوم تھا کہ یہی وہ ساٹھ منٹ کا معمولی سا وقفہ ہے جو میری زندگی کا ایک ناقابل فراموش بلکہ سخت اذیت بخش لمحہ گنا جائے گا۔ جہاز کا کپتان اور عملے کے دوسرے افراد بھی ایئر پورٹ کی خاموش اور پراسرار فضا سے کچھ مرعوب ہو گئے تھے۔ ہر طرف خوف کی ایک لہر سی دوڑ رہی تھی۔

اس وقت ہمیں معلوم نہیں تھا کہ یہ انجانا سا خوف ایئر پورٹ پر کیوں طاری ہے۔ مسلح فوجی سپاہی نہایت مستعدی سے ہر جگہ پھیلے ہوئے تھے۔ شاید کوئی خاص واقعہ پیش آیا تھا یا آنے والا تھا؟ میرے جہاز کے چھ مسافر نہایت بے چینی اور اضطراب کی حالت میں ویٹنگ روم میں ایک جگہ کھڑے تھے۔ جیسے طوفان کی آمد پر بھیڑیں ایک جگہ سہم کر جمع ہو جاتی ہیں۔ میں ان کے پاس گئی اور اپنے لہجے کو ممکن حد تک خوش گوار بنا کر کہا:

''حضرات! ہم پندرہ منٹ کے اندر اندر جہاز پر سوار ہوجائیں گے۔ شاید آپ جہاز اڑنے کا انتظار کر رہے ہیں۔'' مسافروں نے ذردیدہ نگاہوں سے پہلے مجھے اور پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر ایک شخص نے مدھم آواز میں مجھ سے کہا:

''ہم تو اس وقت ہی خوش ہوں گے جب یہ پندرہ منٹ ختم ہوجائیں گے......اس سے پہلے جب میں امریکہ گیا تھا تو میرے بیس رشتے دار مجھے رخصت کرنے آئے تھے۔ لیکن آج کسی نے بھی یہاں آنے کی جرأت نہیں کی......''

میں نے چپکے سے اس سے پوچھا۔ ''یہ اتنے مسلح سپاہی یہاں کیوں گھوم رہے ہیں؟''

''خفیہ تحریک کا ایک رکن فرار ہوگیا ہے۔ وہ بے چارہ ایک نوجوان لڑکا ہے۔ یہ سب اسی کی تلاش میں یہاں گھوم رہے ہیں۔ ایک گھنٹہ پہلے اسے یہیں کہیں دیکھا گیا تھا۔ بہرحال وہ اب تک ان کے ہاتھ نہیں لگ سکا۔ اسی لیے یہ سپاہی کھنکھنے کتوں کی طرح دانت نکالے پھر رہے ہیں......'' اس کے لبوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے چاروں طرف دیکھا اور پھر مجھ سے کہنے لگا۔

''مادام اگر میں آپ سے کہوں کہ اب یہاں سے پرے ہٹ جائیے تو آپ مجھے بداخلاق نہ سمجھیں۔ اگر ہم زیادہ دیر تک آپ سے باتیں کرتے رہے تو یہ لوگ ہم پر شک کرنے لگیں گے......''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے افسردہ لہجے میں کہا ''اچھا اب دس منٹ بعد ہوائی جہاز میں آپ سے ملاقات ہوگی۔''

خوف زدہ مسافروں کے اس چھوٹے سے گروہ کو چھوڑ کر میں آگے بڑھی تو جہاز کا کپتان اپریشن روم سے نکلا۔ اس نے اشارے سے مجھے بلایا اور پوچھا' ''جون کی طبیعت اب کیسی ہے؟''

جون مرچیسن میری گہری سہیلی اور اسی جہاز میں میری معاون ہوسٹس تھی۔ اس کی طبیعت دفعتہً خراب ہوگئی تھی۔ اور وہ اس وقت جہاز ہی میں آرام کر رہی تھی۔

''مجھے افسوس ہے جناب کہ میں نے اب تک اسے نہیں دیکھا۔ جب جہاز یہاں اُترا ہے تو وہ کمرے میں سو رہی تھی۔ اور میں یہاں کے پُراسرار ماحول میں ایسی کھوئی کہ......'' میں نے مسلح سپاہیوں کی طرف آنکھ سے اشارہ کیا۔ ''سنا ہے کہ خفیہ تحریک کا کوئی رکن ان کے پنجے سے بچ نکلا ہے۔''

ویٹنگ روم سے نکل کر میں اپنے جہاز کی طرف جانے لگی۔ ہوائی اڈے پر سردی کی شدت بڑھ گئی تھی اور گہری دھند کے باعث اندھیرا چھا گیا تھا۔ ہمارے جہاز کے عین پیچھے کوئی تیس گز کے فاصلے پر ایک اور جہاز کھڑا پرواز کا منتظر تھا۔ شاید اس جہاز کی تلاشی لی جارہی تھی۔ کیوں کہ میں نے تین مسلح سپاہیوں کو جہاز کی سیڑھیاں چڑھتے دیکھ لیا تھا۔ میرے جسم میں خوف کی ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ میں دوڑ کر اپنے جہاز کی طرف گئی۔ اور اندر جا کر کیبن کا دروازہ بند کر کے اسے مقفل کر دیا۔ یہاں آ کر مجھے کچھ سکون محسوس ہوا' جیسے میں اپنے گھر میں آ گئی ہوں۔ عملے کے کمرے میں جون اب بھی آرام کی نیند سو رہی تھی۔ میں نے ایک اور کمبل اٹھایا اور آہستہ سے اسے اوڑھا دیا۔ اس کے بعد میں پھر اپنے کیبن میں آئی۔ گھڑی دیکھی تو جہاز روانہ ہونے میں ابھی پانچ منٹ باقی تھے۔ میں نے اپنا دستی بیگ کھول کر چھوٹا آئینہ اور کنگھا نکالا۔ شیشے میں اپنی صورت دیکھی۔ بالوں میں کنگھا پھیرا اور اپنی ٹوپی کا زاویہ درست کر کے تنقیدی نگاہ آئینے میں ڈالی۔ عین اُسی لمحے میں نے محسوس کیا جیسے کسی نے میری ریڑھ کی ہڈی پر برف کی طرح سرد انگلی رکھ دی ہے۔ آئینے کے واضح عکس میں میں نے دیکھا کہ جہاز کے پچھلے گوشے میں آخری نشست کے پیچھے کوئی شخص دبکا بیٹھا ہے۔ میرے جسم پر لرزہ سا طاری ہوگیا۔ میں نے فوراً کھڑکی کی طرف دیکھا اور چاہا کہ مدد کے لیے کسی کو پکاروں۔ تین سپاہی لمبے

لمبے ڈگ بھرتے میرے جہاز کی طرف آتے دکھائی دیئے۔ پھر میرے کانوں میں ایک ہلکی سی آواز آئی جس کا لہجہ میرے لیے نامانوس تھا۔

''میڈموازل...... براہ کرم اپنا شیشہ ایک طرف ہٹا دیجیے۔''

میں نے فوراً مڑ کر پیچھے دیکھا تو مجھے اٹھارہ برس کا ایک دبلا پتلا لڑکا دکھائی دیا۔ جس کے بال سنہری تھے اور نیلی آنکھوں میں سے خوف جھانک رہا تھا۔ اس کا چہرہ دہشت سے دھلے ہوئے کپڑے کی طرح سفید تھا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر مدھم سی کپکپاتی لیکن مصر آواز میں کہا:

''مادام مجھ سے خوف نہ کھائیے...... میں آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔''

اس نے دروازے کی طرف سر سے اشارہ کیا اور کہا'' کیا اس کے علاوہ کوئی اور دروازہ بھی ہے جس سے میں باہر چلا جاؤں؟ یا مجھے چھپنے کے لیے کوئی جگہ بتا دیجیے...... اگر انہوں نے مجھے پالیا تو''...... لڑکے نے انگلی اپنے حلق پر پھیری...... ''اگر انہوں نے مجھے پالیا تو وہ مجھے جان سے مار ڈالیں گے......''

''یہاں کوئی جگہ نہیں۔ میں تمہیں کہاں چھپاؤں۔ نہیں، نہیں۔ میں اپنی ایئر لائن کو بدنام نہیں کر سکتی۔''

کہنے کو تو میں نے گھبراہٹ میں یہ کہہ دیا۔ لیکن میرا دل نہیں مانتا تھا کہ اس معصوم صورت لڑکے کو جلاّدوں کے حوالے کر دوں۔ جہاں تک ایئر لائن کی بدنامی کا معاملہ تھا' اسے اس لڑکے کی زندگی پر قربان کیا جا سکتا تھا۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ اگر میں اس لڑکے کی جان بچا سکی تو میری کمپنی کے اعلیٰ آفیسر مجھ سے ناراض نہیں ہوں گے۔

ٹھپ...... ٹھپ...... ٹھپ......

میں نے فوجی سپاہیوں کے بوٹوں کی آہٹ جہاز کی سیڑھیوں پر سُنی اور پھر جہاز کے بند دروازے پر ایک زوردار گھونسہ پڑا۔ میں نے جھپٹ کر الماری سے جہاز کے

نیوی گیٹر کی فالتو یونیفارم' جیکٹ اور ٹوپی اتاری اور لڑکے کی طرف پھینکتے ہوئے کہا۔

''جلدی کرو۔ یہ کپڑے پہن لو......''

لڑکے نے حیرت انگیز پھرتی کے ساتھ یونیفارم پہن لی۔ ٹوپی اس کے سر سے بڑی تھی' تاہم اس نے اسے اوڑھ لیا۔ جہاز کے دروازے پر اس مرتبہ اور زور سے دستک دی گئی۔ میں نے لڑکے کو دھکا دے کر جہاز کی پچھلی نشست پر بٹھا دیا اور جلدی سے مسافروں کے سامان کی فہرست کا پلندہ اٹھا کر اس کی گود میں پھینکا۔

''دیکھو اپنا منہ قطعاً نہ کھولنا...... اور یاد رکھو...... تمہارا نام ہے جو...... جو...... اور تم جہاز کے ایک ایکسٹرا اسٹیورڈ ہو...... اب خدا سے دعا مانگو کہ وہ پاسپورٹ نہ مانگ بیٹھیں...... میں دروازہ کھولتی ہوں......''

میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ میں بمشکل کیبن تک پہنچ سکی۔ میں نے ہینڈل گھما کر دروازے کو تھوڑا سا کھولا اور مسلح سپاہیوں کو اپنے سامنے دیکھتے ہی میں نے ایسا لہجہ اختیار کیا جیسے مجھے سخت پریشانی ہوئی ہو۔

''سٹیورڈ اور میں اپنے کاغذات چیک کر رہے ہیں۔ آخر اس مداخلت کی آپ کو کیا ضرورت پیش آئی ہے؟''

''تمہیں خوب معلوم ہے کہ ہم ایک آدمی کو تلاش کر رہے ہیں اور میں تنبیہ کرتا ہوں کہ تمہیں پولیس کے کام میں روڑے اٹکانے کا کوئی حق نہیں......''

''اور آپ لوگ میرے فرائض میں کیوں مزاحمت کر رہے ہیں؟'' میں نے غصے سے کہا۔ ''میں جہاز کے کپتان سے شکایت کروں گی۔ آپ لوگوں کو ایک امریکی جہاز میں داخل ہونے کا کوئی حق نہیں......''

''ہمیں احکامات ملے ہیں کہ ہوائی اڈے پر کھڑے ہوئے ہر جہاز کی تلاشی لی جائے۔'' سپاہیوں کے افسر نے کہا۔ ''آپ ایک طرف ہٹ جائیے ورنہ ہمیں زبردستی جہاز میں داخل ہونا پڑے گا اور خواہ مخواہ ناگوار صورت پیدا ہوگی......''

میں فوراً جہاز میں واپس گئی اور لڑکے کی نشست کے پاس اس طرح بیٹھ گئی کہ سپاہیوں کی نظر فوراً ہی اس پر نہ پڑے۔ لڑکا میرے آدھے جسم کی آڑ میں چھپ گیا تھا۔ اس کا سر کاغذوں پر جھکا ہوا تھا اور جہاز کی اندرونی مدھم روشنی میں اس کی ڈھیلی ڈھالی وردی پر کوئی شک نہیں گزر سکتا تھا۔ جھکے ہوئے سر کے باعث گلے میں ٹائی کی غیر موجودگی بھی نمایاں نہ ہو سکتی تھی۔

میں نے کسٹم کے بعض کاغذات اس کے اوپر پھینکے اور اونچی آواز سے کہا:

"جو...... ہم اس فالتو وقت میں اس کام کو نمٹا دیں تو مناسب ہے...... کرامک...... سٹیفن...... کوگ نیگ کی چھ بوتلیں...... جن کی قیمت" تیس ڈالر بنتی ہے...... ایک کلاک...... قیمت......

"تم دونوں کے علاوہ جہاز پر اور کون ہے؟" سپاہیوں کے افسر اعلیٰ نے تحکمانہ لہجے میں پوچھا:

"میری ایک معاون ہوسٹس عملے کے کمرے میں سو رہی ہے۔ وہ بیمار ہے۔ اور مجھے آپ سے مطالبہ کرنا پڑے گا کہ اسے نہ چھیڑا جائے۔"

اس کی نگاہوں نے جو کا بے پروائی سے جائزہ لیا...... "تم کہتی ہو جہاز میں اور کوئی نہیں ہے مگر میرا خیال ہے کہ وہ بدمعاش ضرور ادھر آیا ہوگا۔ کیوں کہ ہوائی اڈے پر یہی ایک امریکی طیارہ ہے......"

اتنے عرصے میں دوسرا سپاہی کپڑوں کی الماری، نشستوں کے نیچے اور کیبن کی تلاشی لے چکا تھا اور تیسرا سپاہی عملے کے کمرے میں دیکھ بھال کر کے واپس آ گیا تھا۔

"ہاں تو کمبل میں لپٹا جو کوئی بھی سو رہا ہے وہ ہمارے مطلوبہ آدمی سے کہیں چھوٹا ہے......"

میں نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی...... جہاز روانہ ہونے میں ایک منٹ باقی تھا اور

مسافر یقیناً ویٹنگ روم سے نکل کر ہوائی اڈے میں داخل ہو چکے ہوں گے۔ اب میرے پاس ان مردود سپاہیوں سے نجات پانے اور لڑکے کو چھپانے کے لیے صرف ایک منٹ تھا۔

میں اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی لیکن اس تدبیر سے کہ جو میرے پیچھے ہی چھپا رہے، میں نے نہایت سرد لہجے میں کہا۔

"آپ لوگ جہاز کی تلاشی لے چکے ہیں۔ میرے مسافر اب جہاز میں سوار ہونے کے لیے آ رہے ہیں اس لیے میں آپ کو حکم دیتی ہوں کہ جہاز فوراً خالی کر دیں۔"

"لڑکی! تم ہم سے چھٹکارا پانے کے لیے کیوں غیر معمولی طور پر بے چین دکھائی دیتی ہو؟" سپاہیوں کے افسر نے کہا۔

"اس لیے کہ آپ لوگوں نے خواہ مخواہ میرا وقت ضائع کیا ہے اور میں اب تک اپنا کام ختم نہیں کر سکی۔ اور جب مسافر جہاز میں سوار ہو جائیں تو کام ختم کرنا ناممکن ہوتا ہے۔ تمہارے اس ناگوار رویے کی رپورٹ میں واشنگٹن بھجواؤں گی۔"

ایک مرتبہ پھر جہاز کی سیڑھیوں پر فوجی جوتوں کی ٹھپ ٹھپ سنائی دی اور دوسرے ہی لمحے ایک اور فوجی افسر نے جہاز میں داخل ہو کر سپاہیوں کے لیڈر کو سلیوٹ کیا اور کہا:

"جناب! کمشنر کہتا ہے کہ تلاشی کی مکمل رپورٹ پیش کی جائے۔"

یہ سُن کر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ تینوں سپاہی جہاز کے دروازے کی طرف بڑھے اور جب وہ جہاز کی سیڑھیاں اُتر رہے تھے تو مسافر باہر کھڑے انتظار کر رہے تھے۔ جہاز کے اگلے دروازے سے کپتان اور عملے کے دوسرے افراد جہاز پر سوار ہو چکے تھے۔ لڑکا اپنی نشست سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا اور میرے نئے احکامات کا منتظر تھا۔ میں نے اس کا بازو پکڑا اور مردانہ پیشاب خانے کی طرف دھکیل دیا۔

"جلدی کرو...... اندر جا کر دروازہ بند کر لو...... اور جب تک میں خود آواز نہ

دوں، ہرگز دروازہ نہ کھولنا۔'' یہ کہہ کر میں کیبن کے دروازے پر کھڑی ہوگئی اور ایک جبری تبسم کے ساتھ مسافروں کا استقبال کرنے لگی۔ ہوائی اڈے کے ایک کارندے نے مجھے مسافروں کے ناموں کی ایک فہرست پکڑائی۔ میں نے تمام مسافروں کو باری باری ان کی نشستوں پر بٹھا کر فہرست پر نگاہ ڈالی۔ اس پر سات نام درج تھے۔ چھ ٹائپ کے حروف میں اور ساتواں سیاہی سے لکھا ہوا تھا۔ اس نام کے آگے انگریزی کے پانچ حروف اس طرح لکھے تھے۔ ''ای، ایکس، سی، او، آر۔''

میں نے نہایت تعجب سے پوچھا ''یہ کون شخص ہے؟''

''یہ کم بخت وہی پولیس کمشنر ہے۔'' کارندے نے چپکے سے جواب دیا۔ ''نہایت بدمزاج اور بددماغ آدمی ہے۔ بس ایک ہی منٹ میں آیا چاہتا ہے۔ وہ اس وقت ان پولیس والوں سے باتیں کر رہا ہے، جو مفرور لڑکے کو تلاش کر رہے تھے۔ تم اسے خوش رکھنے کی کوشش کرنا۔''

کمشنر پولیس کا نام سنتے ہی میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اب کیا کروں؟ اس وقت غور کرنے کا موقع ہی نہ تھا کیونکہ فوراً ہی وہ منحوس آدمی جہاز کی سیڑھیاں چڑھتا ہوا کیبن میں داخل ہوگیا۔ اور میں نے کوشش کر کے اپنے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔ وہ پچاس سال کا ایک طویل القامت شخص تھا، پتلے نتھنوں اور بھنچے ہوئے ہونٹوں سے اس کی سخت گیر طبیعت کا مجھے فوراً ہی اندازہ ہوگیا۔

''میری نشست کا نمبر شاید بیالیس ہے۔'' کمشنر نے درشت لہجے میں مجھ سے پوچھا۔ یہ سنتے ہی میرے اوسان خطا ہوگئے کیوں کہ نشست نمبر بیالیس جہاز کے پچھلے حصے میں تھی اور اس کے ساتھ ہی مردانہ پیشاب خانہ تھا۔ اگر وہ وہاں بیٹھتا تو جُو کو پیشاب خانے سے نکلتے ہوئے بآسانی دیکھ سکتا تھا۔ ہر چند کہ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا، لیکن میں نے پُرسکون انداز میں کہا:

''میرے خیال میں اگر آپ اگلی نشستوں میں سے کسی ایک پر تشریف رکھیں تو آپ کا سفر بے حد خوش گوار رہے گا......''

''میں پچھلی نشست ہی کو ترجیح دیتا ہوں۔ وہاں سے باہر کا نظارہ بہتر رہتا ہے۔''

''جناب! بہت ممکن ہے کہ آگے چل کر جہاز کو موسم کی خرابی کا سامنا کرنا پڑے اور جہاز کی بمپنگ کا اثر پچھلی سیٹوں پر بہت پڑتا ہے۔ اس لیے آپ اگلی نشست ہی پر تشریف رکھیں۔''

کمشنر نے گھور کر مجھے دیکھا۔ اپنے کندھے سکوڑے اور میرے ساتھ ہولیا۔ اب میرے سامنے ایک اور خطرہ ابھر آیا۔ میں نے ناموں کی فہرست پر نظر ڈالی اور اس کشمکش میں مبتلا ہوگئی کہ کمشنر کو اکیلا بٹھاؤں یا کسی مسافر کے ساتھ...... اگر میں اسے کسی مسافر کے ساتھ بٹھا دوں تو وہ باتوں میں مشغول ہوکر جہاز کی نگرانی نہیں کر سکے گا۔ لیکن اگر کمشنر نے اس مسافر کو بھی بتادیا کہ وہ ایک مفرور لڑکے کی تلاش میں آیا ہے تو شاید وہ دونوں ہی چوکنے ہوجائیں۔ اور جب میں پیشاب خانے سے جُو کو نکالوں گی تو وہ ضرور مجھے پکڑ لیں گے۔ کمشنر کو اکیلا ہی بٹھانا چاہیے۔ میں نے یہ فیصلہ تین چار سیکنڈ میں کر لیا اور نشست نمبر 3 پر کمشنر کو بٹھا کر اس کا بیگ نیچے رکھ دیا اور پھر اس کی پیٹیاں کستے ہوئے میں نے رسماً کہا:

''مجھے امید ہے جناب کہ آپ کا سفر بہت خوش گوار رہے گا۔''

کمشنر نے جواب میں منہ ٹیڑھا کر کے کچھ کہا۔ جو میری سمجھ میں نہ آیا۔ ابھی میں کمشنر صاحب کی پیٹیاں کس ہی رہی تھی کہ ایک اور آفت نے سر اٹھایا۔ نشست نمبر سات کا مسافر اٹھا اور مردانہ پیشاب خانے کی طرف چلا۔ اس وقت میری دہشت کا اندازہ آپ لگا ہی نہیں سکتے۔ میں فوراً لپک کر اس کے پیچھے گئی اور عین دروازے پر ہی اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور ہانپتے ہوئے کہا۔

"براہ کرم آپ اپنی نشست پر چلے جایئے جہاز اب اڑنے ہی والا ہے۔"

میں نے دیکھا اس آدمی کا چہرہ کسی اندرونی تکلیف سے سفید ہو رہا تھا۔

"مادام! مجھے نہ روکیے۔ میں شدید بے چینی محسوس کر رہا ہوں۔ جہاز اڑتے وقت ہمیشہ مجھ پر ایسی ہی گھبراہٹ طاری ہوتی ہے۔"

میں نے اس کا ہاتھ سختی سے تھام لیا۔ ورنہ وہ ضرور دروازہ کھولنے کی کوشش کرتا۔

"آپ میرے ساتھ آیئے۔ میں ایسی گولیاں دیتی ہوں جو آپ کی طبیعت کو پُرسکون کر سکیں گی۔ دیکھیے، جب جہاز پرواز کرنے والا ہو تو قاعدے کے مطابق ہر مسافر کو اپنی نشست میں ہونا چاہیے۔"

میں نے منت سماجت کر کے اسے نشست پر لے جا کر بٹھایا ار جلدی سے مائیکروفون اٹھا کر مسافروں سے خطاب کیا۔ اس وقت مجھ پر اضطراب کا ایسا شدید دورہ پڑا کہ میں اپنی آواز ہی نہ پہچان سکی۔

"گڈ ایوننگ......حضرات......میں آپ کی میزبان بول رہی ہوں۔ میری ہگنز کلارک۔ براہ کرم سب لوگ اپنی اپنی پیٹیاں کس لیں۔ اور جب تک سامنے کے دروازے پر سرخ نشان روشن ہے۔ تمباکو نوشی سے پرہیز کریں۔ ہماری منزل فرینکفرٹ ہے اور یہ پرواز دو گھنٹے پانچ منٹ میں ختم ہو جائے گی۔ تھوڑی دیر بعد ہلکا سا ناشتہ تقسیم کیا جائے گا۔ اگر آپ میں سے کسی صاحب کو کوئی ضرورت ہو تو بغیر ہچکچاہٹ کے فوراً مجھے حکم دیجیے۔"

اتنی دیر میں جہاز رَن وے پر دوڑ کر فضا میں بلند ہو چکا تھا۔ اور سب مسافر مع کمشنر صاحب کے باہر کے نظارے میں محو تھے۔ موقع غنیمت جان کر میں مردانہ پیشاب خانے کے پاس گئی اور آہستہ سے آواز دی......

"جو......"

لڑکے نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور بغیر آہٹ کے باہر نکل آیا۔ جہاز کی اندرونی مدھم روشنی میں اس کا جسم ایک سایہ سا نظر آ رہا تھا۔ میں نے اپنا منہ اس کے کان کے قریب لے جا کر کہا "دائیں طرف کی آخری نشست......فرش پر فوراً لیٹ جاؤ۔ میں تمہارے اوپر کمبل ڈال دوں گی......"

لڑکے نے حکم کی تعمیل کی اور دائیں طرف کی آخری نشست کے پیچھے لیٹ گیا۔

میں نے اوپر کے خانے سے ایک کمبل اُتارا اور پھیلا کر اس کے اوپر ڈال دیا۔ میری نگاہیں سامنے دروازے پر لگے ہوئے سرخ الفاظ پر جمی ہوئی تھیں۔

"اپنی پیٹیاں کس لیجیے......سگریٹ پینا منع ہے۔"

مجھے معلوم تھا کہ جب تک یہ الفاظ روشن ہیں جہاز کی اندرونی بتّیاں نہیں جلیں گی۔ لیکن جوں ہی یہ بجھے مجھے بتیاں جلانی پڑیں گی اور پھر مسافروں کو اجازت ہوگی کہ وہ اپنی ضرورت کے لیے جہاز میں چل پھر سکتے ہیں اور خطرہ اسی وقت پیش آ سکتا ہے۔

اب پہلی مرتبہ مجھے خیال آیا کہ میں نے جو حرکات کی ہیں وہ مجھے کہاں تک نقصان پہنچا سکتی ہیں۔ میں ایک ایسی کمپنی کی ملازم تھی، جس کے اصول وضوابط بڑے سخت تھے بہرحال مجھے ایک بات کا ضرور یقین تھا اور وہ یہ کہ جہاز کا کپتان اور عملے کے دوسرے افراد میری حمایت کریں گے خواہ انہیں اپنی ملازمت سے ہاتھ ہی دھونے پڑیں۔

جہاز جب حسب معمول صحیح پرواز پر آ گیا تو سرخ الفاظ بجھ گئے۔ میں نے ایک سرد آہ بھری اور آہستہ سے اٹھ کر سوئچ بورڈ کی طرف گئی اور بٹن دبا کر جہاز کی اندرونی بتیاں روشن کر دیں۔ اس کے بعد میں نے مسافروں میں رسالے اور اخبارات تقسیم کرنے شروع کیے۔ نشست نمبر 7 کے جس مسافر کو پرواز کے وقت بے چینی سی تھی اور جسے میں نے گولیاں دی تھیں، اب اس کی طبیعت بحال تھی۔ اس نے مجھ سے اخبار لیتے ہوئے کہا:

"مادام! تمہاری وہ گولیاں خوب تھیں۔ میری ساری تکلیف جاتی رہی۔"

اس نے جیب ٹٹول کر اپنی عینک نکالنا چاہی' اس کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہوئیں۔

"لو میں بھول ہی گیا۔ عینک تو میرے کوٹ کی جیب میں ہے۔" یہ کہہ کر وہ اٹھا اور جہاز کے پچھلے حصے کی طرف جانے لگا...... میرے حواس پھر گم ہوئے۔ میں نے جلدی سے کہا۔

"آپ یہیں رُکیے...... میں آپ کی عینک لائے دیتی ہوں۔"

"نہیں...... میں خود ہی لاتا ہوں......" اس نے جواب دیا اور آگے بڑھ گیا۔ میں خوف سے کانپتی اس کے پیچھے گئی۔ کیبن میں جس جگہ جو کمبل اوڑھے پڑا تھا' وہ وہاں سے گزر کر کپڑوں کی الماری تک گیا اور عینک نکال کر جب واپس پلٹنے لگا تو اس کی نگاہ کمبل پر پڑی۔ وہ ٹھٹھکا اور پھر جھک کر کمبل اٹھانے لگا۔

"ارے یہ کمبل یہاں گر گیا ہے......" اس سے پہلے کہ وہ کمبل کو ہاتھ لگاتا میں نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"جناب! آپ یہ زحمت نہ کیجیے۔ میں اسے خود اٹھالوں گی۔" یہ کہہ کر میں نے اسے آگے بڑھا دیا اور وہ اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ اب میں نے چور نظروں سے سارے کیبن کا جائزہ لیا۔ تمام مسافر اپنے اپنے رسالوں اور اخبارات کے مطالعہ میں محو تھے۔ کمبل ایسی جگہ پڑا تھا کہ کسی وقت بھی جو کو دریافت کیا جاسکتا تھا لیکن میں کر ہی کیا سکتی تھی؟ میں نے دل ہی دل میں خدا سے التجا کی کہ کہیں کمشنر ادھر نہ آجائے۔ عین اسی لمحے اس کم بخت نے مجھے بلانے کے لیے گھنٹی بجائی' میں فوراً اس کے پاس گئی۔

"فرمایئے جناب! کیا حکم ہے؟"

کمشنر کی پتلی پتلی انگلیاں اپنی نشست کے بازو پر طبلہ بجا رہی تھیں اور اس کے ہونٹ سختی سے بھنچے ہوئے تھے۔ ایک دو منٹ بعد اس نے مصنوعی تبسم کے ساتھ کہا:

"میں تم سے ایک ذاتی نوعیت کا سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔"

"پوچھیے۔" "یہ بتاؤ کہ تم کتنے عرصے سے اس ایئر لائن میں کام کر رہی ہو؟"

میں نے یہ سن کر اطمینان کا سانس لیا۔ پہلے مجھے یہ خدشہ تھا کہ وہ میری پریشانی نہ بھانپ گیا ہو۔ اس کا سوال کوئی نیا نہیں تھا بلکہ دنیا بھر میں عام طور پر ہر ہوسٹس سے یہی سوال پوچھا جاتا ہے اور سوال کرنے والے کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ ایئر ہوسٹس کی صحیح عمر معلوم کرے۔ چنانچہ میں نے یہی تصور کر کے جواب دیا۔

"جناب! مجھے اس لائن میں کام کرتے ہوئے کافی برس ہو گئے ہیں۔ اب تو صحیح طور پر نہیں بتا سکتی کہ کتنے سال ہوئے۔"

"آہا...... میرا بھی یہی اندازہ تھا۔" کمشنر نے چبھتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا۔ پھر دفعتہً کہا۔

"تب تم اتنا ڈر کیوں محسوس کر رہی ہو؟"

"میں نہیں سمجھی آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"تم خوب سمجھتی ہو' جو میں کہنا چاہتا ہوں' تم اپنا اندرونی خوف مجھ سے پوشیدہ نہیں رکھ سکتیں۔ میں پولیس کمشنر ہوں اور ایک پولیس کمشنر دن رات کے ہر لمحے ڈیوٹی پر ہوتا ہے۔ یہی میرا فرض ہے کہ دوسروں میں خوف کی بُو محسوس کروں۔ ہمیں اسی کی مشق کرائی جاتی ہے لیکن تم مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کرتی ہو۔ اونہہ...... تمہیں اتنے برس پرواز کرتے گزر گئے کہ تم یاد بھی نہیں کر سکتیں لیکن پھر بھی تم ڈر رہی ہو۔ میں نے یہی سوال بار بار اپنے آپ سے کیا ہے؟ آخر تم کیا چھپانے کی کوشش کر رہی ہو؟"

کمشنر کے آخری الفاظ میں نے بمشکل سنے۔ کیوں کہ اس وقت میرا ذہن لڑکے کو محفوظ کرنے کی تدبیریں سوچنے میں مصروف تھا۔ اور پھر فوراً ہی مجھے ایک لاجواب تدبیر سوجھ گئی۔ میری معاون ہوسٹس جون مرچیسن عملے کے کمرے میں ابھی تک سو رہی تھی۔

بس ہم دو عورتیں اس جہاز پر سوار تھیں۔ اگر میں کسی طرح جو کو عورتوں کے کمرے میں پہنچا دوں کہ کوئی اسے جاتے نہ دیکھے تو وہ محفوظ ہو جائے گا۔ لیکن ایسا کرنے کے لیے مجھے جہاز کی اندرونی روشنی بجھانی پڑے گی تاکہ تاریکی کا فائدہ اٹھا کر جو اس کیبن تک پہنچ جائے۔ اب سوال یہ تھا کہ بتیاں بجھانے کے لیے میں کون سا بہانہ کروں؟

''مادام تم میری بات سن کر ہنس رہی ہو؟'' کمشنر نے پھر کہا۔

''میں نے اس انداز میں جیسے کوئی خاص بات کہنا چاہتی ہوں' ذرا جھک کر کہا۔

''جناب! آپ غلط فہمی کا شکار ہیں کہ میں خوفزدہ ہوں۔ اب مجھے مجبوراً آپ کو ایک ''تجارتی راز'' سے آگاہ کرنا پڑے گا۔ بات یہ ہے کہ جب ہمارے جہاز پر کوئی اہم شخصیت سوار ہوتی ہے تو ناموں کی فہرست میں اس کے نام کے آگے ایک مخصوص لفظ لکھ دیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ ہم اس شخصیت کی طرف خاص توجہ دیتے رہیں۔ میں تو محض اس وجہ سے گھبرائی ہوئی ہوں کہ مجھے آپ کو ہر طرح سے خوش رکھنا ہے۔ اور مجھے افسوس ہے کہ میں اس فرض میں کامیاب نہیں ہوئی۔''

''تم ہو تو بڑی چالاک اور چرب زبان...... لیکن میں قطعی مطمئن نہیں ہوا......'' یہ کہہ کر وہ اٹھا اور کہنے لگا۔

''پانی کا نل کس طرف ہے؟''

''جہاز کے پچھلے حصے میں۔'' میں نے فوراً جواب دیا۔ ''لیکن آپ تکلیف نہ کریں۔ میں پانی کا گلاس لاتی ہوں۔''

''نہیں...... میں خود اپنی ٹانگیں سیدھی کرنا چاہتا ہوں......''

یہ سُن کر میرا تو خون ہی خشک ہو گیا۔ عین اسی لمحے اگر غیبی مدد شامل حال نہ ہوتی تو سارا معاملہ طشت ازبام ہو گیا تھا۔ دفعتہً جہاز نے ایک زبردست جھٹکا کھایا۔ اور اس میں تھرتھراہٹ سی نمودار ہوئی۔ پھر ''پیٹیاں کس لیجیے'' والی تختی روشن ہو گئی۔ کمشنر دوبارہ اپنی

نشست میں دھنس گیا۔ میں بجلی کی مانند جہاز کے پچھلے حصے میں گئی اور کمبل پر جھک کر آہستہ سے کہا۔

''جو...... میری بات سنو...... تمہارے عین پیچھے بائیں ہاتھ کو عورتوں کا کمرہ ہے۔ میں اب بتیاں بجھانے والی ہوں۔ جوں ہی جہاز میں اندھیرا ہو' تم فوراً کمرے میں چلے جانا اور اندر سے دروازہ بند کر لینا۔ سمجھ گئے؟''

کمبل میں دبکا ہوا بے چارہ لڑکا پہلے تو کانپا...... اور پھر اس نے آدھا چہرہ باہر نکالا۔ اف خدایا...... اس کے چہرے پر موت کی سی زردی چھا گئی تھی اور آنکھیں ویران نظر آ رہی تھیں۔ اس نے زبان سے تو کچھ نہ کہا صرف سر کو جنبش دی۔ واپس آ کر میں نے فوراً سوئچ بند کر دیا۔ کیبن میں ایک دم گھپ اندھیرا چھا گیا۔ مسافروں کے منہ سے کلمہ حیرت بلند ہوا۔ میں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں بلند آواز سے کہا۔

''میں بھی کتنی بے وقوف ہوں...... میں نے غلطی سے دوسرا سوئچ دبا دیا۔ براہ کرم ہر شخص اپنی نشست پر ہی بیٹھا رہے۔''

میں دراصل عورتوں کے کیبن کا دروازہ بند کیے جانے کی آہٹ سننا چاہتی تھی۔ وہ آہٹ مجھے سنائی دی...... اور پھر کسی نے سختی سے میرا ہاتھ تھام لیا۔

''جلدی کرو۔ بتی جلاؤ۔''

میں نے بتیوں والا سوئچ دبا دیا اور جہاز میں روشنی پھیل گئی۔ کمشنر میرا ہاتھ پکڑے مجھے گھور رہا تھا۔

''تم نے یہ حرکت کیوں کی؟''

''مجھے افسوس ہے جناب! میں مائیکروفون کا سوئچ دبانا چاہتی تھی تاکہ ڈنر کا اعلان کروں۔ لیکن غلطی سے دوسرا سوئچ دبا دیا۔ آپ خود دیکھ لیجیے دونوں سوئچ برابر برابر لگے ہوئے ہیں۔ اب آپ اپنی جگہ پر تشریف لے جائیے۔''

کمشنر نے غور سے سوئچ بورڈ کا معائنہ کیا۔ لیکن صاف ظاہر تھا کہ اس نے میرے بیان پر ذرہ برابر بھی یقین نہیں کیا۔ میں نے مائیکروفون اٹھا کر خوشگوار لہجے میں مسافروں کو مخاطب کیا۔

''حضرات! آپ سب اب بھوک محسوس کر رہے ہوں گے۔ لیجیے پانچ منٹ کے اندر اندر میں کھانا تقسیم کر رہی ہوں۔ کھانے سے پہلے میں آپ کی تواضع ''کاک ٹیل'' سے کروں گی۔''

میں نے کمشنر کی طرف پلٹ کر کہا...... ''آپ کاک ٹیل سے شغل کریں گے؟''

''بشرطیکہ تم میرے ساتھ پینا پسند کرو۔''

''افسوس ہے جناب! میں اس وقت ڈیوٹی پر ہوں۔''

''تو پھر میں کاک ٹیل کیوں پیوں؟ کیا میں ڈیوٹی پر نہیں؟'' اس نے اپنی نشست پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔ میں نے کاک ٹیل کے گلاسوں کی ٹرے اٹھائی۔ اور ہر مسافر کو ایک ایک گلاس تقسیم کر دیا۔ اس کے بعد میں نے ریفریجریٹر سے ہر مسافر کے لیے علیحدہ علیحدہ پلیٹوں میں کھانا نکالا۔ کمشنر کی پلیٹ پر میں نے خصوصی توجہ دی پھر میں نے کپتان کو کھانا دیا۔ اس نے ''کنٹرول'' پر فرسٹ آفیسر کو بٹھایا اور خود نیوی گیٹر کی میز پر آ کر کھانا کھانے لگا۔ کپتان کو جو کے بارے میں تمام باتیں بتا دینے کا یہ بڑا اچھا موقع تھا۔ لیکن پھر میں نے سوچا کہ فرینکفرٹ پہنچ کر ہی بتاؤں گی۔ میری معاون ہوسٹس جون بھی اب جاگ رہی تھی۔ میں نے آہستہ سے اس کا کمبل ہٹایا۔

''کہو اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟''

''پہلے سے تو بہتر ہے۔ افسوس ہے کہ تمہیں اکیلے ہی سب کام کرنا پڑا۔ میں ابھی اٹھتی ہوں۔ تمہارا ہاتھ بٹاؤں گی۔''

''بس چپ چاپ لیٹی رہو۔ اٹھنے کی ضرورت نہیں۔ جہاز جب منزل پر پہنچے گا تو

میں تم سے ایک خاص بات کروں گی۔'' یہ کہہ کر میں کیبن میں واپس آئی اور کھانے کے برتن جمع کرنے لگی۔ کمشنر صاحب کی ٹرے ویسی کی ویسی ہی پڑی تھی۔ اس نے کھانے کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا اور وہ اپنے سامنے کسی غیر مرئی شئے کو گھور رہا تھا۔

''یہ ٹرے لے جاؤں جناب؟ آپ نے تو کچھ بھی نہیں کھایا۔''

دفعتہً وہ اپنی نشست سے اٹھا اور کہنے لگا۔

''ابھی میری یادداشت اتنی خراب نہیں ہوئی۔ دو گھنٹے پہلے جب اس جہاز کی تلاشی لی گئی تھی تو پولیس نے جہاز اڑنے سے پہلے مجھے رپورٹ دی تھی کہ جہاز میں ایک ہوسٹس تو بیمار ہے اور دوسری...... یعنی تم...... ایک سٹیورڈ کے ساتھ سامان کی فہرست کی جانچ پڑتال کر رہی ہے۔ بتاؤ میں تم سے پوچھتا ہوں کہ وہ سٹیورڈ کہاں ہے؟ کیوں نہیں اس نے اب تک تمہارا ہاتھ بٹایا؟ اس کا جواب میں خود دوں گا اور وہ یہ کہ اس جہاز میں سٹیورڈ ہے ہی نہیں...... وہ مصنوعی سٹیورڈ ہمارا مفرور ملزم ہے جو اس جہاز پر سوار ہے اور تم نے اسے چھپا رکھا ہے۔ بولو وہ کہاں ہے؟''

اس نے میرا بازو پکڑ لیا اور اپنی پتلی پتلی انگلیاں میرے کندھے میں چبھونے لگا۔

''اپنا ہاتھ پرے ہٹائیے اور مجھے کام کرنے دیجیے۔'' میں نے کہا۔

''ہوں...... تو تم تسلیم کرتی ہو کہ وہ جہاز پر ہے۔ خیر اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ تمہارا کپتان جہاز کو واپس موڑ سکتا ہے اور پھر اسے اور تمہیں اچھی طرح سبق پڑھایا جائے گا کہ دوسروں کے سیاسی معاملات میں دخل دینے کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔''

یہ کہہ کر کمشنر نے مجھے ایک طرف دھکا دیا اور کنٹرول روم کی طرف بڑھا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا لیکن اس نے پھر مجھے پرے دھکیل دیا۔ سب مسافر حیرت سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔

میرے پاس امید کی ایک آخری جھلک باقی تھی اور وہ جہاز کے مسافر تھے جو آہنی

پردے کے پیچھے کام کرنے والی جابرانہ قوت سے خائف ہو کر اب امریکہ میں پناہ لینے جا رہے تھے۔ وہ ضرور میری مدد کریں گے۔ میں نے چیخ کر ان سے کہا:

''خدا کے واسطے میری مدد کرو۔ اس بے چارے لڑکے کو میں نے جہاز میں پناہ دی ہے۔ ورنہ یہ اسے ہلاک کر دیتے۔''

میری آواز سن کر مسافر پہلے تو بھونچکا سے رہ گئے۔ پھر یکایک وہ سب کے سب چیتے کی مانند کمشنر پر ٹوٹ پڑے اور گھونسے مار مار کر اسے نشست میں گرا دیا۔ اس کے ساتھ ہی دروازے پر لگی ہوئی تختی پر سرخ الفاظ روشن ہو گئے۔

''اپنی پیٹیاں کس لیجیے۔ جہاز اب اُترنے والا ہے۔''

میں نے کھڑکی سے جھانکا تو فرینکفرٹ کے ہوائی اڈے کی بتیاں جھلملا رہی تھیں۔ جہاز نے ایک معمولی سا غوطہ لگایا اور رن وے پر اُتر گیا...... کپتان کنٹرول روم کا دروازہ کھول کر باہر نکلا اور حیرت سے سب کو دیکھ کر کہنے لگا۔

''مس میری! یہ ابھی جہاز میں کیا ہنگامہ برپا ہو رہا تھا؟''

میں نے بمشکل جواب دیا ''جناب! آپ کو اطلاع دینا میرا فرض تھا کہ میں نے ایک مفرور لڑکے کو جہاز میں پناہ دی ہے۔''

اس کے بعد کیا ہوا؟ یہ ایک طویل داستان ہے۔ البتہ تین باتیں ایسی ہیں جنہیں میں موت کے آخری لمحے تک فراموش نہیں کر سکوں گی۔

پہلی بات یہ کہ پولیس کمشنر کا غصے سے لال بھبوکا چہرہ اور اس کا وہ فقرہ مجھے کبھی نہیں بھولے گا' جب اس نے کہا تھا۔

''یہ ملزم میرے ملک کا شہری ہے۔ اور میں مطالبہ کرتا ہوں کہ اسے فوراً واپس کر دیا جائے۔''

دوسری بات یہ کہ فرینکفرٹ ایئرپورٹ کے ایک اعلیٰ افسر نے اسے جواب دیتے ہوئے کہا:

''ہمیں اس واقعے پر افسوس ہے لیکن اب ہمارا فرض یہ ہے کہ لڑکے کو حکومت بون کے حوالے کر دیں۔ جانچ پڑتال پر اگر اس کے کاغذات درست ثابت ہوئے تو اسے سیاسی پناہ دی جائے گی۔ ہماری پالیسی یہی ہے اور ہم اس پر کاربند رہیں گے۔ جائیے...... شب بخیر!''

اور تیسری بات ان سب میں قیمتی یادگار ہے یہ ایک دبلے پتلے اٹھارہ سالہ لڑکے کا معصوم چہرہ ہے۔ جس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو جھلملا رہے تھے اور جس نے آہستہ سے جھک میرے ہاتھ پر بوسہ دیا اور لرزتی ہوئی آواز میں کہا:

''مادام! میں آپ کا احسان کبھی نہیں بھولوں گا...... آپ نے مجھے نئی زندگی عطا کی ہے...... نئی زندگی......''



نیاگرا کا حادثہ

4فروری 1912ء کا دن تھا اور اتوار کا روز...... نیاگرا آبشار پر موسم معمول کے خلاف بے حد اداس اور سوگوار تھا۔ اس مرتبہ سیاحوں کی تعداد بھی گزشتہ سال کی نسبت کہیں زیادہ تھی۔ اس کی بڑی وجہ دو فرلانگ لمبا ''برف کا وہ پُل'' تھا جو آبشار کے عین قدموں تلے برف کے عظیم تودوں کے ایک جگہ اکٹھے ہو جانے کے باعث دو ہفتوں سے بن رہا تھا۔

برف کے اس پُل نے آبشار کے دونوں حصوں کینیڈین شور اور امریکن شور......کو آپس میں ملا دیا تھا۔ کینیڈین شور مغرب میں اور امریکن شور مشرق میں تھا۔ یہ دونوں حصے دراصل جزیرہ گوٹ کی وجہ سے وجود میں آئے تھے جو دریائے نیاگرا کے عین وسط میں واقع ہے۔

مقامی لوگوں کا کہنا تھا کہ برف کا یہ عظیم الشان ٹھوس پُل اپنی دل کشی اور خوب صورتی کی بدولت سیاحوں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ بعض مقامات پر تو برف کے اس طویل تودے کی موٹائی اسّی فٹ سے بھی زیادہ تھی۔

مسٹر ایلرج سٹنٹن اور اس کی بیوی کلارا سٹنٹن اس مرتبہ بھی نیاگرا کی سیر کے لیے آئے ہوئے تھے۔ سال میں دو مرتبہ ٹورنٹو سے یہاں ضرور آتے تھے۔ ان کی شادی کو چھ سال ہو گئے تھے لیکن برف کے اس پُل پر وہ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اس طرح گھوم

رہے تھے جیسے ان کی کل ہی شادی ہوئی ہو اور وہ 'ہنی مون' منا رہے ہوں۔ ان کا ارادہ تھا کہ کینیڈین شور پر اپنے دوستوں سے ملنے جائیں اور کچھ وقت وہاں گزار کر آہنی پُلوں کے ذریعے واپس امریکن شور پہنچ جائیں۔ ان کے دل فرحت و انبساط سے غیر معمولی طور پر پُر تھے۔ آبشار کا منظر بے حد دلفریب اور نظر افروز ہوتا جا رہا تھا۔ برف کے پُل پر اور بہت سے سیاح بھی خوش گپیوں اور اُچھل کود میں مصروف تھے۔ ولیم ہل نے اسی پُل پر ایک جگہ اپنا چھوٹا سا ہوٹل بھی کھول رکھا تھا جو وہ ہر سال اسی سیزن میں کھولا کرتا تھا۔ مونرو گلبرٹ اور ولیم لیلانڈ بھی اسی ہوٹل میں بیٹھے تھے۔ ان کے قریب ہی دو نوجوان لڑکے بورل ہیکاک اور نوئیس روتھ آپس میں تفریحاً ہاتھا پائی کر رہے تھے اور برف کے گولے بنا بنا کر ایک دوسرے پر پھینک رہے تھے۔

دفعتہً ولیم ہل نے اپنے پیروں تلے ہلکی سی تھرتھراہٹ محسوس کی جیسے برف اس کے پیروں کے نیچے سے کھسکی جا رہی ہو۔ ابھی وہ اس عجیب حادثے پر پوری طرح غور بھی کرنے نہ پایا تھا کہ ایک زبردست گڑگڑاہٹ کی آواز اس کے کانوں میں آئی۔ ہر چند کہ آبشار کا پانی ایک سو باون فٹ کی بلندی سے نیچے گر کر ایک ہولناک شور پیدا کر رہا تھا' لیکن جو گڑگڑاہٹ ولیم ہل نے سُنی وہ اس شور سے زیادہ بلند آہنگ تھی۔ وہ چوں کہ نیاگرا کا پرانا باشندہ اور دریا کی فطرت سے اچھی طرح واقف تھا۔ اسے شک گزرا کہ ضرور کوئی آفت آیا چاہتی ہے۔ اس نے باہر نکل کر چاروں طرف غور سے دیکھا وہ یہ یقین کرنے پر ہرگز تیار نہ تھا کہ برف کا وہ اسّی فٹ موٹا پُل اتنی جلدی ٹوٹ سکتا ہے۔ اتنے میں پھر ایک گرج کے ساتھ اس کے پیروں تلے دبی ہوئی برف کانپ اٹھی۔ وہ بے تحاشا کینیڈین شور کی طرف بھاگا اور دوسرے لوگوں کو چیخ چیخ کر خبردار کرنے لگا۔

''برف ٹوٹ رہی ہے......جلدی کرو...... یہاں سے نکل جاؤ۔''

لیلانڈ اور گلبرٹ اور آپس میں ہاتھا پائی کرنے والے دونوں لڑکوں نے اسے پریشانی کے عالم میں بھاگتے دیکھا تو وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے دوڑنے لگے۔ برف کا پُل اب تنکے کی مانند لرز رہا تھا اور اس میں بڑے بڑے شگاف پڑنے شروع ہو گئے تھے۔ جتنے لوگ وہاں سیر کر رہے تھے' سب کے سب کنارے کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے اور چند منٹ کے اندر اندر برف کا پل تنہا رہ گیا۔ لیکن نہیں...... وہ تنہا نہیں تھا۔ اس پر اب بھی دو بدنصیب انسان موجود تھے۔ مسٹر اور مسز سٹنٹن...... جو اس وقت برف کے عین وسط میں تھے اور مڑے سے کینیڈین شور کی طرف جا رہے تھے۔ انہوں نے جب برف کا تودہ اپنے پیروں کے نیچے ہلتے ہوئے محسوس کیا اور پھر برف ٹوٹنے کی گڑگڑاہٹ سنی تو وہ رُک گئے اور فوراً امریکن شور کی جانب بھاگے جواب تھوڑے ہی فاصلے پر تھا...... لیکن جوں ہی وہ آخری حد تک پہنچے ان سے چند گز کے فاصلے پر برف کا تودہ ایک دم نیچے بیٹھ گیا اور نیچے سے دریا کا پانی لہریں مارتا ہوا نمودار ہوا۔ وہ دہشت زدہ ہو کر پیچھے ہٹے۔ کنارہ اب ان سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ چند سیکنڈ تک وہ خوف سے کنارے کی طرف تکتے رہے۔ پھر دفعتہً پیچھے مڑے اور کینیڈین شور کی طرف پوری قوت سے دوڑنے لگے۔ اب انہوں نے پہلی مرتبہ دور فاصلے پر ولیم ہل اور دوسرے لوگوں کو اسی طرف بھاگتے ہوئے دیکھا دیکھتے ہی دیکھتے ایک آدمی نے جست لگائی اور کنارے پر پہنچ گیا۔ دوسرے نے بھی جلدی سے چھلانگ لگائی اور کنارے پر جا اُترا۔ اتنے میں یہ دونوں میاں بیوی بھی کنارے کے قریب پہنچ گئے۔ لیکن آہ...... وہ ابھی کنارے سے پچاس گز کے فاصلے پر تھے کہ کلارا سٹنٹن کا پیر لڑکھڑایا اور وہ منہ کے بل برف پر جا پڑی۔ اس کے خاوند نے اسے اٹھانے کی کوشش کی لیکن عورت کے پاؤں میں اتنی شدید چوٹ آئی تھی کہ وہ چل نہیں سکتی تھی...... وہ بمشکل اٹھی لیکن پھر گر پڑی۔ مسٹر سٹنٹن نے جھک کر اسے اٹھایا اور کمر پر لاد کر جب آگے بڑھا تو دہشت سے اس کا چہرہ سفید پڑ

گیا۔ اس نے اپنے سامنے دو سو فٹ اُونچی برف کی دیوار کو حرکت کرتے ہوئے پایا' جس کے کنارے سے دریا کا پانی اس طرح بل کھاتا ہوا نکل رہا تھا جیسے اسے برسوں کی قید سے رہائی حاصل ہوئی ہو۔

اب ان کے کنارے کے درمیان یخ بستہ پانی کی زبردست رکاوٹ حائل ہو چکی تھی جسے وہ کسی حالت میں بھی عبور نہیں کر سکتے تھے۔ سٹنٹن نے کنارے پر موجود آدمیوں کو مدد کے لیے زور زور سے پکارا لیکن وہ لوگ کیا کر سکتے تھے انہیں اپنی جانیں بچانے کی فکر تھی۔ لیلانڈ کمر تک یخ بستہ پانی میں ڈوبا ہوا کنارے پر پہنچنے کی سر توڑ کوشش کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ولیم ہل بھی غوطے کھا رہا تھا۔ اس نے روتھ کو بھی سنبھال رکھا تھا اور ساتھ ساتھ ولیم ہیکاک کو بھی آوازیں دیتا جاتا تھا کہ فوراً پانی میں کود جائے۔ ہیکاک پانی میں کودنے ہی والا تھا کہ اسے اپنی پشت پر ایک عورت اور مرد کے چیخنے اور مدد مدد پکارنے کی آوازیں سنائی دیں۔ اس نے گردن موڑ کر ادھر دیکھا۔ ابھی سٹنٹن برف کے تودے پر ہی کھڑا تھا جو آہستہ آہستہ کنارے سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ ہیکاک نے مسٹر اور مسز سٹنٹن کو مصیبت میں مبتلا پایا وہ ان کی مدد کے لیے اس طرف بڑھا...... کنارے پر کھڑا ہوا اس کا دوست روتھ حلق پھاڑ پھاڑ کر چلا رہا تھا۔

''ہیکاک! خدا کے واسطے ادھر نہ جاؤ تم اب بھی کنارے پر آ سکتے ہو۔ فوراً چھلانگ لگا دو......'' ہیکاک نے تذبذب کے عالم میں کنارے کی طرف دیکھا۔ جیسے سوچ رہا ہو کہ اپنی جان بچائے یا اس جوڑے کی مدد کرے۔ آخر اس نے نفی میں سر ہلایا اور مڑ کر ان کی طرف دوڑا۔ پھر دونوں نے مل کر مسز سٹنٹن کو اٹھایا اور اسے گھسیٹ کر کینیڈین شور کی طرف لے جانے کی کوشش کرنے لگے۔ اس اثنا میں دریائے نیاگرا کے دونوں کناروں پر برف کا پل ٹوٹنے کا تماشا دیکھنے کے لیے ہزاروں کی تعداد میں لوگ جمع ہو گئے تھے۔ ان کی نظروں کے سامنے ایک لرزہ خیز منظر تھا۔ برف کی ایک بہت بڑی سفید

چادر آہستہ آہستہ دریا کے بہاؤ پر تیر رہی تھی۔ اور اس کے کینیڈین کنارے کی طرف دور فاصلے پر دو مرد دکھائی دیتے تھے' جنھوں نے ایک عورت کو بازوؤں میں تھام رکھا تھا۔ امریکن شور پر جتنے لوگ جمع تھے انہیں ان تینوں کے جسم بونوں کی مانند ننھے ننھے دکھائی دے رہے تھے۔

''ارے یہ کون ہیں؟'' کنارے پر کھڑی ہوئی کسی عورت نے دہشت سے چلّا کر کہا:

''پتہ نہیں یہ کون بدنصیب ہیں جو اس مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔'' قریب سے ایک بوڑھے نے جواب دیا۔

''اگر برف کے تودے کی رفتار تیز ہوگئی تو یہ جانیں صحیح وسلامت لے کر نہیں آ سکیں گے' اب خدا ہی ان کا محافظ ہے۔''

اب ہزارہا افراد پلک جھپکائے بغیر برف کے اس تیرتے ہوئے تودے پر نظریں جمائے سانس روکے کھڑے تھے۔ دریا دو میل نیچے کی طرف طغیانی کی صورت اختیار کر چکا تھا اور یہاں اور وہاں بپھرے ہوئے بھنور ہر اس شئے کو نگل لینے کے لیے بے تاب تھے جو ان کے قریب آ جائے...... برف کی مانند سفید جھاگ دار پانی آبشار کی صورت اختیار کرتا ہوا پستی میں مسلسل ایک ہیبت ناک گرج پیدا کر رہا تھا۔

دھائیں......دھائیں......دھائیں......اور برف کا وہ عظیم تودہ آہستہ آہستہ اسی طرف بڑھا چلا جا رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ دریا کے عین درمیان میں پہنچ گیا۔ اب اس کی رفتار میں بھی تیزی آ گئی۔

اس پر سوار تینوں افراد اضطراب کے عالم میں کبھی امریکن شور کی طرف دوڑتے اور کبھی کینیڈین شور کی طرف لپکتے۔ اس دوران میں ہیکاک اور مسٹر سٹنٹن کو لوگوں نے دیکھا کہ وہ آپس میں کچھ باتیں بھی کرتے تھے۔ شاید بچنے کی تدبیریں ایک دوسرے کو

بتا رہے تھے...... بے چاری مسز سٹنٹن نے اپنے خاوند کا بازو تھام رکھا تھا اور جدھر وہ دوڑتا لنگڑاتی ہوئی وہ بھی اس کے ساتھ ساتھ دوڑتی۔

اتنے میں برف کا تودہ تیرتا ہوا اس مقام تک پہنچ گیا جہاں دریا پر لوہے کا پہلا پُل بنا ہوا تھا۔ یہاں پہنچتے ہی برف کے تودے کا رُخ امریکن شور کی طرف ہوگیا۔ اور کنارے پر تماشا دیکھنے والوں کے دلوں میں امید کی ہلکی سی روشنی نمودار ہوئی......لیکن دو منٹ بعد ہی سب کے سب درد وغم کی تصویر بن گئے۔ ہائیڈرو الیکٹرک پلانٹ نے جو دریا میں پوری قوت سے پانی پھینک رہا تھا۔ زبردست دباؤ کی وجہ سے برف کے تودے کا رخ بدل دیا اور وہ پھر دریا کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگا۔

چھ سو فٹ کا سفر طے کرنے کے بعد برف کا تودہ ایک ہولناک دھماکے کے ساتھ دو حصوں میں تقسیم ہوگیا۔ ایک حصے نے امریکن شور کا رخ کیا اور دوسرا جس پر مسٹر اور مسز سٹنٹن اور ہیکاک سوار تھے' وہیں رُک کر چکر کھانے لگا۔ پہلا حصہ کنارے کے عین قریب پہنچ کر اس سے ٹکرایا اور اس کے کئی چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہوگئے اگر یہ تینوں اس پر ہوتے' تو یقیناً امریکن شور پر اتر جانے میں کامیاب ہو جاتے لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

اس اثناء میں نیاگرا کا حفاظتی عملہ کیل کانٹے سے لیس ہو کر ان تینوں کی جانیں بچانے کے لیے میدان عمل میں اُتر آیا تھا۔ فائر مین' پولیس مین اور ریلوے ورکرز کی بہت بڑی تعداد بقیہ دو آہنی پُلوں پر مستعد تھی۔ ان پُلوں کے درمیان تین سو گز کا فاصلہ تھا۔ اونٹوریو پولیس کا افسر اعلیٰ مسٹر جے کیلے بذات خود حفاظتی عملے کی نگرانی کر رہا تھا۔ اس نے حکم دیا کہ بالائی پُل سے دو رسے نیچے لٹکا دیئے جائیں۔ لوگوں نے دوسرے پُل سے پہلے ہی سے ایک رسا لٹکا رکھا تھا۔ جس کا پھندا بپھری ہوئی موجوں سے چھو رہا تھا۔ دریا کے دونوں کناروں پر رضا کاروں کی ایک بڑی تعداد بھی اس امر

کی منتظر تھی کہ اگر تو وہ کنارے کے قریب آئے تو وہ چھلانگیں لگا کر اس پر پہنچ جائیں اور تینوں افراد کو بچالیں۔ ارد گرد کی ابھری ہوئی چٹانوں پر بھی رسّے پھینک دیئے گئے تھے۔

تماشائیوں کے لیے یہ لمحات جان کُنی کے لمحات سے کچھ کم نہ تھے۔ بہت سے لوگ گڑ گڑا کر خدا سے دعائیں مانگ رہے تھے کہ ان تینوں کی جان بچ جائے۔ عورتیں سسکیاں لے لے کر رو رہی تھیں۔ اکثر نے منہ پھیر کر دونوں آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے تھے۔ شاید ان میں اس دل دوز منظر کو دیکھنے کی تاب نہیں تھی۔ ادھر...... برف کے تیرتے ہوئے تودے پر...... جو ہر لمحہ موت سے ہم آغوش ہونے کے لیے تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا...... تین انسان زندگی بچانے کی آخری جدوجہد میں مصروف تھے۔ لیکن اب کوئی معجزہ ہی انہیں موت کے منہ سے بچا سکتا تھا۔ مسٹر اور مسز سٹنٹن دونوں کے ہوش وحواس جواب دے چکے تھے۔ البتہ نوجوان لڑکے ہیکاک کی جرأت و ہمت بے مثال تھی۔ وہ مسلسل اپنے دونوں ساتھیوں کو ہمت سے کام لینے اور ہوش برقرار رکھنے کی تلقین کرتا رہا۔ اس نے خاص طور پر مسز کلارا سٹنٹن کو سنبھالنے کی طرف زیادہ دھیان دیا۔ لیکن جونہی برف کا تودہ دوسرے پُل کے نیچے پہنچا' جہاں پانی کا بہاؤ اور تیز ہو گیا تھا۔ تو کلارا سٹنٹن اپنے اوپر قابو نہ پا سکی اور غش کھا کر برف پر گر پڑی۔ یہاں سے بہاؤ کے ساتھ بہتے ہوئے تقریباً دو فرلانگ کے فاصلے پر برف کا یہ تودہ پھر ایک گرج کے ساتھ مزید دو ٹکڑوں میں بٹ گیا...... اب ستم یہ ہوا کہ ایک ٹکڑے پر ہیکاک تھا تو دوسرے پر مسٹر اور مسز سٹنٹن ...... ہیکاک نے چلّا کر ان دونوں کو الوداع کہا اور ہاتھ سے اشارہ کیا...... سٹنٹن نے بھی ہاتھ کے اشارے سے اس کے سلام کا جواب دیا۔

اتنے میں پانی کی ایک زبردست لہر دریا میں اٹھی' جس نے برف کے اس ٹکڑے کو کینیڈین شور کی طرف دھکیل دیا۔ جس پر مرد عورت زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہے تھے۔ برف کا تودہ حیرت انگیز طور پر کنارے کی طرف جا رہا تھا...... تماشائیوں کے دل

میں ایک مرتبہ پھر امید کی کرن روشن ہوئی...... شاید قدرت انہیں بچانا چاہتی ہے۔

کنارے سے چند گز کے فاصلے پر برف کا تودہ یک لخت یوں ٹھہر گیا' جیسے کسی ان دیکھے ہاتھ نے اسے تھام لیا ہے۔ سٹنٹن نے اس انداز میں فاصلہ ناپا جیسے وہ کودنا چاہتا ہو...... اس کا ارادہ بھانپ کر کسی نے بلند آواز سے پکار کر کہا۔

''کود جاؤ...... کود جاؤ'' عین ممکن تھا' کہ سٹنٹن کود ہی جاتا۔ اور شاید کنارے پر پہنچنے میں کامیاب بھی ہو جاتا۔ لیکن جونہی اس کے کانوں میں یہ آواز پہنچی' وہ رُک گیا...... اور پلٹ کر نہایت حسرت بھری نگاہوں سے اپنی بیوی کو دیکھا جو برف پر پڑی ہسٹریائی انداز میں چیخ رہی تھی......

''سٹنٹن...... جاؤ تم اپنی جان بچاؤ۔ ہم دونوں میں سے ایک کو ضرور جینا چاہیے...... جاؤ...... جاؤ......''

وہ ایک نئے عزم کے ساتھ پلٹا اور اپنی بیوی کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے کھڑا کیا۔

ادھر ہیکاک جس ٹکڑے پر رہ گیا تھا وہ نہایت تیزی سے دریا کے بہاؤ پر بڑھا جا رہا تھا۔ لڑکے نے ایک مرتبہ پھر مُڑ کر ان دونوں کو الوداعی سلام کیا پھر نہایت اطمینان سے اپنا اوورکوٹ اتارا اور اس رسے کو پکڑنے کے لیے پوری طرح مستعد ہو گیا۔ جو دوسرے پُل پر سے لٹکایا گیا تھا اور جس کے نیچے سے چند سیکنڈ کے اندر اندر برف کا یہ تودہ گزرنے والا تھا۔ جونہی وہ اس کے نیچے پہنچا' ہیکاک نے اُچھل کر رسّہ پکڑ لیا۔ دوسرے ہی لمحے اس کے پیروں تلے سے برف کا تودہ گزر چکا تھا اور اب وہ رسے کو پکڑے ہوئے دریا کی خونخوار موجوں کے اندر لٹکا ہوا تھا۔ اس کی کمر یخ بستہ پانی میں ڈوب گئی تھی۔ جوں ہی اس نے رسہ پکڑا' دو سو فٹ کی بلندی پر پولیس افسر کیلے نے چلّا کر اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔

''کھینچو...... جلدی سے رسّہ کھینچو...... شاباش......''

اس سے پیشتر کہ رسہ کھینچ کر ہیکاک کو پانی سے اونچا کیا جاتا' پیچھے سے برف کے تین چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تیرتے ہوئے آئے اور اس کے جسم سے ٹکراتے ہوئے آگے نکل گئے......اس شدید چوٹ نے بے چارے ہیکاک کی رہی سہی ہمت کو ختم کر کے رکھ دیا۔ رسہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ ہی گیا ہوتا' اگر وہ سنبھل نہ جاتا......فوراً ہی حفاظتی عملے کے آدمیوں نے رسّے کو پوری قوت سے کھینچا اور ہیکاک پانی سے اٹھ کر فضا میں لٹکنے لگا۔ کنارے پر کھڑے ہوئے تماشائیوں نے' جن میں سے ہر ایک خود جان کنی کی سی کیفیت محسوس کر رہا تھا' بے اختیار خوشی سے نعرہ لگایا اور تالیاں بجائیں اور لڑکے کی بے پناہ قوت برداشت اور استقلال پر آفرین کہی......لڑکا اب پانی کی سطح سے کوئی تیس فٹ کی بلندی پر فضا میں لٹو کی مانند گردش کر رہا تھا۔ اس نے اپنی ایک ٹانگ کے گرد رسّہ باندھنے کی کوشش کی۔ لیکن بدقسمتی سے وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کی انگلیاں یخ بستہ پانی کے باعث ٹھٹھر کر بالکل بے کار ہو گئی تھیں۔ وہ رسّے پر اپنی گرفت قائم نہ رکھ سکا اور پھسلتا ہوا پھر دریا کی طرف آنے لگا۔ اس نے رسّے کو اپنے دانتوں سے پکڑنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ حفاظتی عملے کے لوگ اسے پوری قوت سے اوپر کھینچ رہے تھے۔ ساٹھ فٹ کی بلندی پر پہنچ کر لڑکے کی طاقت بالکل جواب دے گئی۔ رسّہ اس کی انگلیوں کی گرفت سے آزاد ہو گیا اور وہ دھڑام سے دریا میں جا گرا۔

تماشائیوں کے منہ سے رنج اور غم کے کلمات بلند ہوئے۔ ایک لمحے کے لیے لڑکے کا جسم پانی کی سطح پر اُبھرا' اس نے اضطراب میں دونوں ہاتھ اِدھر اُدھر چلائے' جیسے کسی شئے کا سہارا لینا چاہتا ہے' لیکن پھر بپھری ہوئی موجوں نے اسے اندر گھسیٹ لیا۔ دوبارہ اس کی شکل کسی نے نہیں دیکھی۔

''کیا ہم ایسا بہادر لڑکا پھر کبھی دیکھ سکیں گے......'' پولیس آفیسر کیلے نے بچوں کی طرح روتے ہوئے کہا......تماشائی عورتوں میں سے اکثر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔

اتنے میں پھر ایک شور برپا ہوا اور لوگوں نے دیکھا کہ برف کا وہ تودہ جس پر مسٹر اور مسز سٹنٹن بہتے ہوئے چلے آ رہے تھے' اب گرداب سے آزاد ہو کر دوسرے پُل کی طرف بڑھ رہا تھا انہوں نے ہیکاک کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا اور اب خود ان کی باری تھی۔

سٹنٹن ان لوگوں میں سے تھا جو ہر کام پُرسکون انداز میں سرانجام دینے کے عادی ہوتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اسے اپنے بچ نکلنے کی پوری امید تھی۔ پُل کے نیچے لٹکا ہوا رسہ اس کے لیے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا تھا۔ لوگوں نے چلّا چلّا کر اس کی ہمت بندھائی۔ جونہی برف کا تودہ پُل کے نیچے آیا۔ سٹنٹن نے لپک کر رسہ تھام لیا اور نہایت پھرتی سے اپنی بیوی کی کمر میں ڈال کر گرہ کس دی۔ برف کا تودہ تیزی سے آگے بڑھا تو پھندہ اور سخت ہو گیا اور اس سے پہلے کہ پُل والے لوگ عورت کو کھینچیں۔ تنا ہوا رسّہ یک لخت ٹوٹ گیا۔

اب ان کے سامنے صرف ایک موقع تھا تیسرے آہنی پُل کے نیچے ایک اور رسہ لٹک رہا تھا۔ اگر وہ اسے تھام لیں تو شاید جان بچ جائے۔ برف کا تودہ بپھری ہوئی موجوں میں ڈبکیاں لگاتا اور ڈگمگاتا ہوا دریا کے تیز و تند بہاؤ کے ساتھ مسلسل آگے بڑھ رہا تھا۔ دوسرے پُل کے حفاظتی عملے نے عین اس کے راستے میں اوپر سے رسہ پھینک رکھا تھا۔ کنارے پر کھڑا ہوا مجمع اب نہایت اضطراب اور بے چینی کے عالم میں اس بھیانک ڈرامے کا آخری سین دیکھنے کے لیے بے تاب تھا۔ برف کے عظیم پُل کو ٹوٹے ہوئے اب تک ایک گھنٹہ گزر چکا تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے صدیاں بیت گئیں۔ ایک جان ضائع ہو چکی تھی اور دو جانیں موت و زیست کی کش مکش میں مبتلا تھیں۔ لیکن ان سینکڑوں افراد میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا جو ان کی مدد کے لیے آگے بڑھتا۔ سب مجبور و بے بس تھے۔

سٹنٹن نے ایک مرتبہ پھر تیسرا آخری رسّہ پکڑا۔ حفاظتی عملے نے اوپر سے رسے کو اور ڈھیل دے دی تاکہ سٹنٹن کو پھندہ لگانے میں آسانی رہے۔ انتہائی استقلال سے کام لیتے ہوئے اس نے پھر اپنی بیوی کی کمر میں پھندہ ڈال کر گرہ دینے کی کوشش کی۔ لیکن افسوس کہ اس کی سوجی ہوئی انگلیاں اب بے کار تھیں۔ گرہ نہیں بندھ سکی۔ برف کا تودہ چند ثانیے میں اس مقام سے دور نکل گیا۔ یہاں تک کہ رسّے کی لمبائی بالکل ختم ہوگئی۔ سٹنٹن نے گرہ باندھنے میں اپنی پوری قوت صرف کر دی لیکن بے سود...... جونہی رسّہ تنا۔ گرہ کھل گئی۔ اس نے پھر جھپٹ کر رسہ تھام لیا۔ وہ اب بھی اپنی جان بچانا چاہتا تو بچا سکتا تھا۔ لیکن میاں بیوی جس رشتے میں بندھے ہوئے تھے وہ رسّے کی نسبت کہیں زیادہ مضبوط تھا۔ اس نے رسّہ چھوڑ دیا۔

ہر تماشائی اس بے مثال ایثار و قربانی پر انگشت بدنداں تھا۔ سٹنٹن نے اپنی مدہوش بیوی کو وہیں برف کے بہتے ہوئے تودے پر لٹا دیا اور خود اس کے برابر بیٹھ گیا۔ اب وہ موت سے ہم آغوش ہونے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے برف کا حقیر تودہ ایک تنکے کی طرح دیوپیکر موجوں سے ٹکرایا اور اس کے پرخچے اُڑ گئے۔ لوگوں نے آخری بار سٹنٹن اور مسز سٹنٹن کو اس حالت میں دیکھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے تھے اور چند لمحوں بعد شوریدہ سر موجوں کے سوا وہاں کوئی اور شئے نہ تھی۔ نیاگرا آبشار نے تین جانوں کی قربانی قبول کر لی تھی اور اس طرح نیاگرا پر تاریخ کا وہ حادثہ وقوع پذیر ہوا...... جو اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا...... جس میں ایثار‘ محبت‘ قربانی اور جرأت و استقلال کا شاندار نمونہ پوشیدہ تھا۔



ایک جزیرہ ایک انسان

25 نومبر 1809ء کی رات کا ذکر ہے۔ ایک سو پچاس ٹن وزنی جہاز "نیگوسی ایٹر" بحرالکاہل کے شمالی حصے میں سفر کر رہا تھا جہاں برفانی گلیشیر قدم قدم پر اس کے راستے میں حائل ہو رہے تھے۔ موسم روز بروز بد سے بدتر ہوتا جا رہا تھا۔ طوفانی اور یخ بستہ ہواؤں کے طوفان جہاز کو راستے سے بھٹکانے کی مسلسل کوشش کر رہے تھے اور اگر جہاز کا کپتان اور دوسرے تجربہ کار ملاح دن رات دیکھ بھال نہ کرتے‘ تو نیگوسی ایٹر کبھی کا غرق ہو چکا ہوتا‘ تاہم ان کے دل کسی نادیدہ خطرے کے باعث دھڑک رہے تھے اور ہر شخص خاموش خاموش دکھائی دیتا تھا۔ جہاز کو فلاڈلفیا سے چلے ہوئے اس روز پورا ایک مہینہ ہو چکا تھا اور اب وہ فرینڈلی آئی لینڈز کی جانب بڑھ رہا تھا۔

آدھی رات کا وقت تھا‘ آسمان سے برف کے گالے سمندر پر تیزی سے گر رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے گہری‘ دودھیا دھند نے جہاز کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ کپتان اپنے کیبن کی کھڑکی سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر تشویش کی گہری علامات نمودار ہوئیں۔ وہ چند لمحے تک اپنے سامنے کچھ دیکھتا رہا‘ پھر ایک دم بدحواس ہو کر کیبن کی ایک میز پر پڑی ہوئی دوربین اٹھائی اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ جہاز ہچکولے کھاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا اور کیبن کی دیواریں لرز رہی تھیں۔ یکا یک کپتان نے دوربین میز پر رکھی، جلدی سے کیبن کا دروازہ کھولا اور پاگلوں کی طرح دوڑتا ہوا عرشے پر گیا جہاں

ڈینیل فوس ڈیوٹی پر موجود تھا۔ اس کے کپڑوں پر برف جم رہی تھی لیکن وہ اس سے بے نیاز تھا۔ اس کی ساری زندگی سمندر ہی میں گزری تھی اور اس نے صدہا حادثوں کا مقابلہ کیا تھا، تاریک رات میں وہ بلی کی مانند دور دور تک بخوبی دیکھ سکتا تھا اور اس وقت بھی اس کی نظریں عین سامنے کسی غیر مرئی شے کو گھور رہی تھیں جب کپتان اس کے پاس آن کھڑا ہوا اور اس سے پیشتر کہ کپتان منہ سے کوئی لفظ نکالے، ڈینیل فوس نے پرسکون لہجے میں کہا:

''ماسٹر' آپ دیکھتے ہیں کہ ہمارے سامنے ایک گلیشیر رکاوٹ بننے کی کوشش کر رہا ہے' کیا میں جہاز کا رخ موڑ لوں؟''

کپتان حیرت زدہ ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ دونوں کی نظریں ایک لمحے کے لیے ملیں۔

''تمہیں کیسے اندازہ ہوا کہ سامنے گلیشیر ہے؟'' کپتان نے پوچھا۔

ڈینیل فوس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور پھر سامنے دیکھنے لگا۔ اسے گلیشیر ایک پہاڑ کی مانند دور سمندر کے سینے پر تیرتا دکھائی دے رہا تھا اور یہ وہی پہاڑ تھا جسے کپتان نے اپنی دوربین سے دیکھا تھا۔ یقیناً ان کا جہاز موت کے منہ میں جا رہا تھا۔ کپتان جیمز نکول نے جہاز کے عرشے کا ایک چکر لگایا۔ برف تیزی سے جمتی جا رہی تھی اور جہاز زور زور سے ہچکولے کھا رہا تھا۔ آہستہ آہستہ عملے کے تمام لوگ عرشے پر نمودار ہونے لگے۔ وہ سب کے سب نامعلوم خوف کے زیر اثر بدحواس تھے۔ کپتان نے دوربین آنکھوں سے لگائی اور خوشی سے چلایا:

''گلیشیر ہمارے راستے سے ہٹ رہا ہے۔ اب ہم جہاز کو آسانی سے آگے لیجا سکتے ہیں۔''

یہ سن کر ڈینیل فوس زیر لب مسکرایا اور کپتان جیمز سے کہا:

''آپ کا اندازہ خوب ہے...... کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ مجھے اب ڈیوٹی سے ہٹا دیا جائے۔ سچ پوچھو تو سردی سے میرا خون جم گیا ہے۔''

کپتان نے فوس کو اپنے کیبن میں چلے جانے کی اجازت دے دی اور اس کی جگہ خود وہیل سنبھال لیا۔ دوسرے ملاح جو مضطرب سے ادھر ادھر پھر رہے تھے' آپس میں خوش گپیاں کرنے لگے۔ سمندری طوفان' ہواؤں کے جھکڑ' بارش اور برف باری ان کے لئے کوئی نئی بات نہ تھی۔ وہ صرف گلیشیر کو دیکھ کر خوف زدہ ہوئے تھے اور جونہی انہیں یہ معلوم ہوا کہ خطرہ راستے سے ہٹ گیا ہے' وہ مطمئن ہو گئے۔

ڈینیل فوس سات گھنٹے مسلسل ڈیوٹی دینے کے بعد اس قدر تھک گیا تھا کہ اپنے کیبن میں جاتے ہی آرام دہ گرم بستر پر جوتے اور کپڑے اتارے بغیر ہی دراز ہو گیا اور چند منٹوں میں وہ بے خبر سو رہا تھا۔ رات کے ٹھیک اڑھائی بجے تھے کہ ایک قیامت خیز دھماکے سے فوس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا سر بری طرح کیبن کی سخت دیوار سے ٹکرایا۔ چند لمحے تک اس کے کانوں میں شائیں شائیں کی آوازیں گونجتی رہیں۔ اس کے کیبن میں تاریکی تھی، لیکن وہ یہ محسوس کر سکتا تھا کہ ہر شے الٹ پلٹ ہو گئی ہے۔ اس کے جسم کے نیچے جہاز کا فرش زور زور سے جھٹکے کھا رہا تھا۔ پھر دفعتہً پانی کا ایک ریلا کیبن کے اندر گھس گیا اور ڈینیل فوس کو احساس ہوا کہ جہاز غرق ہو رہا ہے۔ وہ بمشکل اپنے کیبن سے باہر نکلا۔ باہر ملاحوں کے شور غل سے ایک ہنگامہ برپا تھا۔ جہاز ایک جانب جھک کر سمندر کے پانی میں غرق ہوتا جا رہا تھا۔ ڈینیل فوس نے دیکھا کہ جہاز گلیشیر سے ٹکرا گیا ہے اور اب اسے دنیا کی کوئی طاقت تباہ ہونے سے نہیں بچا سکتی تھی۔ وہ بے تحاشا لانگ بُوٹ کی جانب دوڑا جس میں سوار ہونے کے لئے ملاح ایک دوسرے کے اوپر گرے پڑتے تھے۔

لانگ بوٹ میں کودنے اور اسے پانی میں اتارنے کے بعد پانچ منٹ کے اندر اندر جہاز سمندر کے نیچے غائب ہو چکا تھا اور پچاس آدمیوں میں سے صرف بائیس اپنی جانیں بچا سکے تھے جن میں کپتان جیمز بھی شامل تھا۔ انہوں نے جان توڑ کوشش کے بعد کشتی کو پانی کے گرداب سے نکالا اور دور لے گئے۔ مشرق سے جب شفق کی سرخی نمودار ہوئی' تو ڈینیل فوس نے دیکھا کہ اس کے ساتھیوں میں سے اکثر ایسے ہیں جن کے بدن پر پورے کپڑے نہیں تھے اور وہ ننگے پیر تھے۔ سردی سے ان کے جسم کانپ رہے تھے اور دانت بجنے کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ ان کے چاروں طرف سمندر ہی سمندر تھا جس میں کہیں کہیں برف کے اونچے اونچے تودے تیرتے دکھائی دے رہے تھے۔ برف باری اگرچہ تھم چکی تھی، لیکن فضا میں شدید سردی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کے جسم اور چہرے سردی کی وجہ سے یخ ہو گئے۔ ڈینیل فوس دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ اس کے بدن پر پورے کپڑے اور پیروں میں چمڑے کے بوٹ تھے' ورنہ اس کا بھی یہی حشر ہوتا۔

کپتان جیمز نے یہ دور اندیشی کی تھی کہ لانگ بوٹ کے اندر پہلے ہی سے کھانے پینے کا کچھ سامان رکھوا دیا تھا۔ اب انہوں نے اس کا جائزہ لیا' ان کے پاس تقریباً پچاس پونڈ سوکھا گوشت اور پانی کے بھرے ہوئے دو ڈرم موجود تھے۔ کپتان نے سب کو مخاطب کر کے کہا:

"ہمارے پاس خوراک اور پانی کا بہت تھوڑا ذخیرہ ہے اور ہمیں ساحل تک پہنچنے سے پہلے اس پر گزارا کرنا ہے' اس لیے میں حکم دیتا ہوں کہ کوئی شخص میری اجازت کے بغیر گوشت کھائے گا اور نہ پانی پیے گا۔ ہمیں اس کے مساوی حصے کرنے ہوں گے...... ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ جنوب کی جانب کشتی کو لے چلیں' کیوں کہ ادھر کا موسم قدرے گرم ہوگا۔ اگر سردی کا یہی عالم رہا' تو ہم میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچ سکے گا۔

مجھے امید ہے کہ ہم سات ہفتوں تک سمندر کے گرم حصے میں پہنچ جائیں گے' اس لیے ہمت سے چپو چلاؤ' حوصلہ ہارنا ہماری شان کے خلاف ہے' خدا پر بھروسہ رکھو۔"

* * *

نیگوس ایٹر کو غرق ہوئے آٹھ ہفتے گزر چکے ہیں' جنوری کا نصف سے زائد مہینہ بیت چکا ہے اور لانگ بوٹ ابھی تک بیکراں سمندر کے نیلے پانی پر بھٹک رہی ہے۔ بائیس آدمیوں میں سے ایک ایک کر کے انیس آدمی سردی اور فاقوں کے باعث ایڑیاں رگڑ رگڑ کر موت کا شکار ہو چکے ہیں اور صرف تین آدمی' جن کی حالت مردوں سے بدتر ہے' کشتی میں پڑے ہوئے زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہے ہیں۔ یہ تین آدمی ڈینیل فوس' کپتان جیمز اور ڈاکٹر جونز ہیں جن کے چہروں پر ڈاڑھی اور مونچھیں اس قدر بڑھ گئی ہیں کہ وہ ایک دوسرے کی اصل شکل دیکھنے سے قاصر ہیں۔ ان کے سروں میں ہزارہا جوئیں پڑ چکی ہیں۔ ان کے قوی اور خوبصورت جسم' جن پر انہیں فخر تھا' اب ہڈیوں کے ڈھانچوں میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ وہ شب و روز کشتی کے اندر بے حس و حرکت پڑے رہتے ہیں۔ سورج نکلتا ہے اور غروب ہو جاتا ہے' طوفان آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں' شارک مچھلیاں ان کی کشتی کا تعاقب دور تک کرتی ہیں اور مایوس ہو کر لوٹ جاتی ہیں' وہ ان چیزوں سے قطعی بے نیاز ہیں۔ وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے گفتگو کرتے ہیں اور کسی خاص موقع ہی پر زبان کھولتے ہیں۔ ان کے پھیپھڑے اس قدر کمزور ہو چکے ہیں کہ بولیں تو جلد ہی سانس پھول جاتا ہے۔ ان کے پاس خوراک کا ذخیرہ بالکل ختم ہو چکا ہے' البتہ پانی کے چند گھونٹ محفوظ ہیں۔ ان تینوں زندہ لاشوں میں سے فوس کی حالت قدرے بہتر ہے' وہ کبھی کبھی سوچتا کہ بائیس آدمیوں میں سے ہم تینوں کا اب تک زندہ بچ رہنا ایک معجزہ ہے' لیکن ہمارے پاس کھانے کے لیے کچھ نہیں رہا اور پانی صرف دو روز کے لیے کافی ہوگا۔ اب کیا ہوگا؟ کیا یہ سمندر ہمیں نگل

لے گا؟ پھر وہ سوچتا کہ ہم تینوں میں سے پہلے کون مرے گا۔ کپتان جیمز کے بارے میں تو اسے یقین تھا کہ یہ شخص آسانی سے مرنے والا نہیں' اس کی بے مثال قوت برداشت پر اکثر حیران ہوتا۔ سچ تو یہ ہے کہ جہاز غرق ہونے کے بعد سے اب تک اس نے صحیح معنوں میں کچھ نہ کھایا تھا وہ صرف پانی پی کر گزارہ کر رہا تھا۔

ڈاکٹر جونز کی حالت بہت خراب تھی اور فوس کو شک تھا کہ یہ شخص بس ایک دو روز میں داغ مفارقت دینے ہی والا ہے' یہ سوچ کر اس کا چہرہ فرط غم سے پیلا پڑ جاتا اور وہ سر کو جھٹک کر کچھ اور سوچنے لگتا۔

دھوپ سے بچاؤ کا بھی ان کے پاس کوئی سامان نہیں تھا۔ سورج جب مشرق سے نکلتا' تو رات بھر کے ٹھٹھرے ہوئے جسموں میں جان سی پڑ جاتی، مگر جونہی وہ نصف النہار پر آتا' دھوپ کی حدت ناقابل برداشت ہو جاتی اور انہیں یوں محسوس ہوتا جیسے انہیں آگ کے اوپر سینکا جا رہا ہے۔ ان کے جسم دھوپ میں تپ تپ کر سیاہ پڑ چکے تھے اور جب وہ ایک دوسرے کے جسموں کو چھو کر دیکھتے' تو انہیں معلوم ہوتا کہ وہ روٹی کے سوکھے ہوئے ٹکڑوں پر ہاتھ پھیر رہے ہیں' سیاہ اور سکڑی ہوئی کھال کے نیچے ہڈیوں کی چبھن سخت تکلیف دہ تھی اور یہ عذاب وہ گزشتہ آٹھ ہفتوں سے مسلسل برداشت کر رہے تھے' لیکن کب تک؟

اگرچہ ان تینوں کی زندگی سمندر کے سینے پر ہی بسر ہوئی تھی' مگر اس وقت انہیں کچھ پتہ نہ تھا کہ وہ بحرالکاہل کے کس حصے میں بھٹک رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی کشتی کو موجوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ چپو چلانا تو ایک طرف' ان میں اتنی بھی طاقت نہ تھی کہ زیادہ دیر تک بیٹھ سکتے یا کھڑے رہتے۔ وہ تو پاس پاس پڑے رہتے اور آسمان کی طرف یاس بھری نظروں سے تکتے رہتے۔ کبھی کبھی وہ آپس میں باتیں بھی کرتے' تو تین چار فقروں ہی میں گفتگو ختم ہو جاتی۔ ان کی گفتگو کا موضوع ہمیشہ کوئی نہ کوئی جزیرہ ہوتا

جو بحرالکاہل میں کہیں موجود تھا اور جہاں ایک روز ان کی کشتی خود بخود پہنچ جائے گی۔ پھر ایسا ہوا کہ وہ اس نامعلوم جزیرے کا شدت سے انتظار کرنے لگے۔ ان کے دل کہتے کہ وہ ضرور کسی جزیرے پر صحیح سلامت پہنچ جائیں گے۔

پانچ دن اور پانچ راتیں گزر گئیں۔ انہیں کہیں زمین کے آثار دکھائی نہ دیئے، پیاس کے مارے ان کی زبانیں سوکھ گئی تھیں' ہونٹ خشک ہو کر سفید پڑ گئے تھے اور مسلسل فاقوں کے باعث پیٹ کمر سے جا لگے تھے۔ ان کی ویران آنکھوں میں موت کی زردی جھلکنے لگی۔ ڈینیل فوس نے اپنا چمڑے کا جوتا اٹھایا اور اسے سمندر کے پانی میں اچھی طرح تر کیا' پھر اس نے سارا دن چمڑے کے یہ ٹکڑے چبا چبا کر کھائے اور پیٹ کی تسکین حاصل کی۔ دو روز اور گزر گئے اور تیسرے روز جب کہ وہ تینوں فاقے کے ہاتھوں نڈھال ہو کر خودکشی کے امکانات پر غور کر رہے تھے' کپتان جیمز نے یکا یک ایک لرزہ خیز تجویز پیش کی۔

''میرے دوستو'' کپتان جیمز نے رک رک کر کہنا شروع کیا۔ ''اس صورت حال سے ہم زیادہ دیر تک عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ ہمارے انیس ساتھی ایک ایک کر کے موت سے ہم کنار ہو چکے ہیں اور اب وہی مرحلہ ہمیں درپیش ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اسی طرح بھوک اور پیاس کا سامنا کرنا پڑا' تو چند روز تک ہم بھی اپنے ساتھیوں سے جا ملیں گے۔ ہم میں سے بہرحال ایک نہ ایک آدمی کو ضرور زندہ رہنا ہے اور اس کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ایک آدمی جان کی قربانی پیش کرے۔''

ڈینیل فوس اور ڈاکٹر جونز اپنی ویران اور زرد آنکھوں سے اسے دیکھتے رہے۔ کچھ لمحوں کے بعد فوس نے زبان کھولی:

''ماسٹر' میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا' ذرا کھل کر بات کرو۔''

کپتان جیمز کی آنکھوں میں ایک ثانیے کے لیے عجیب سی وحشیانہ چمک نمودار ہوئی جسے دیکھ کر اس کے ساتھی ڈر گئے۔ پھر اس نے کہا:

"ہم میں سے ایک شخص اپنے آپ کو مار ڈالے تا کہ دوسرے دو آدمی اس کے گوشت اور خون پر گزارا کرسکیں۔"

یہ الفاظ نہیں تھے، بلکہ پگھلا ہوا سیسہ تھا جو ڈاکٹر جونز اور ڈینیل فوس کے کانوں میں اتر گیا۔ وہ دونوں دہشت سے تھر تھر کانپنے لگے اور ان کے سینے دھونکنی کی مانند حرکت کرنے لگے۔ فوس نے بے اختیار چلا کر کہا:

"ماسٹر جیمز' خدا رحم کرے' کیا تم دماغی توازن کھو چکے ہو؟"

"کاش ایسا ہوتا......" کپتان جیمز کی آواز بھرا گئی اور اس کی پلکوں پر آنسوؤں کے قطرے نمودار ہوئے۔ ڈینیل نے چند لمحے غور کرنے کے بعد فیصلہ کن لہجے میں کہا:

"ماسٹر جیمز' تمہاری بات بالکل ٹھیک ہے۔ ہم میں سے ایک آدمی کو دوسروں کی جانیں بچانے کے لیے ایسا ہی کرنا ہوگا......مگر میرا فیصلہ ہے کہ یہ قربانی تم خود ہی دو۔"

"ٹھہرو' ٹھہرو۔" ڈاکٹر جونز نے جس کا دم لبوں پر تھا' اپنے حلق سے کمزور سی آواز بلند کی۔ "میرے دوستو' میں تم دونوں سے زیادہ بوڑھا اور کمزور ہوں اور مجھے یقین ہے کہ میں ایک یا دو روز سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکوں گا۔ میں بخوشی تمہیں اجازت دیتا ہوں کہ مجھے ہلاک کر کے میرے گوشت اور خون سے اپنی بھوک پیاس بجھا لو' لیکن میں تمہیں ایک وصیت بھی کرنا چاہتا ہوں۔ تم دونوں عہد کرو کہ اگر تم میں سے کوئی بھی صحیح سلامت اپنے وطن پہنچنے میں کامیاب ہو جائے' تو وہ میری وصیت پر عمل کرے گا۔"

"ہم صدقِ دل سے عہد کرتے ہیں۔" جیمز اور فوس نے اپنے اپنے ہاتھ آسمان کی جانب اٹھا کر کہا۔ "تمہاری وصیت کیا ہے؟"

ڈاکٹر جونز نے کپکپاتے ہاتھوں اور تھرتھراتی ہوئی ٹانگوں کا سہارا لے کر کشتی میں کھڑے ہونے کی کوشش کی' مگر کمزوری کے باعث اوندھے منہ گر پڑا۔ اس کے دونوں ساتھیوں نے فوراً بھانپ لیا کہ وہ بس چند گھنٹوں کا مہمان ہے۔ تھوڑی دیر تک اپنا سانس درست کرنے کے بعد جونز نے کہا:

"میرے تین بچے اور بیوی نارفوک' ورجینیا میں رہتے ہیں۔ وعدہ کرو کہ تم ان کی حفاظت کرو گے...... اور جب میرے بچے جوان ہو جائیں' تو ان کے لیے مناسب روزگار مہیا کرو گے۔"

جیمز اور فوس نے خدا کی کتاب کی قسم کھا کر عہد کیا کہ ہم میں سے کوئی زندہ رہا' تو وہ اس وصیت کو ضرور پورا کرے گا۔

"اب میں سکون سے مر سکوں گا۔" جونز نے کہا۔ "میرے دوست فوس' اپنا چاقو سنبھالو اور میرے دائیں بازو کی رگ کاٹ دو۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے سامنے ہی تم دونوں اپنی پیاس بجھا لو۔"

فوس کا دل لرز گیا اور چاقو اٹھاتے وقت اس کے ہاتھ بری طرح کانپ رہے تھے۔ "نہیں......نہیں......' مجھ سے یہ نہ ہوگا۔" اس نے چاقو ایک طرف پھینک دیا اور دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ کر رونے لگا۔ ڈاکٹر جونز نے اب کپتان جیمز کی طرف دیکھا اور کہا:

"جلدی کرو' میرا بازو کاٹ دو' میں مر رہا ہوں......"

جیمز نے چاقو ہاتھ میں اٹھایا اور جونز کے پھیلے ہوئے بازو میں پوری قوت سے گھونپ دیا۔ جونز کے حلق سے ایک دردناک چیخ نکلی اور وہ اسی وقت بے ہوش ہو گیا۔ اس کے کٹے ہوئے بازو سے گاڑھا گاڑھا خون بہہ رہا تھا۔ کپتان جیمز ایک وحشی درندے کی مانند اس خون کو رغبت سے چاٹنے لگا اور اس وقت تک چاٹتا رہا جب تک زخم سے خون بہنا بند نہ ہو گیا۔ ایک گھنٹے بعد ڈاکٹر جونز کی روح قفسِ عنصری سے آزاد ہو چکی تھی۔

ڈینیل فوس دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا' اس کا بس چلتا' تو وہ کپتان جیمز کو کچا ہی چبا جاتا۔ اس نے اسے جس انداز میں اپنے پرانے دوست کا خون چوستے ہوئے

دیکھا تھا' اس کے تصور ہی سے اس کا ذہن ماؤف ہوا جاتا تھا اور اسے بار بار کراہت کی وجہ سے ابکائی سی آتی محسوس ہو رہی تھی۔ ادھر کپتان جیمز' خوشی خوشی ڈاکٹر جونز کی لاش کے ٹکڑے کرنے میں مشغول تھا۔ فوس نے دیکھا کہ وہ انسانی گوشت کے ٹکڑے کچے ہی چبا رہا ہے۔

بارہ روز تک ان دوستوں نے انسانی گوشت کے دھوپ میں سوکھے ہوئے ٹکڑے کھا کر گزارا کیا اور اسی دوران میں ایک روز زور کی بارش ہوئی جس نے ان کی پیاس بجھا دی اور ان کے مردہ جسموں میں زندگی کی لہر دوڑ گئی' لیکن جب خوراک کا یہ ذخیرہ بھی ختم ہو گیا' تو انہیں ایک بار پھر فاقہ کشی کے دور سے گزرنا پڑا اور ایک ہفتہ بغیر کچھ کھائے پیے بیت گیا۔ اب ان کو اپنی موت کا یقین ہو چلا تھا۔ انسانی گوشت نے انہیں کوئی جسمانی قوت بہم نہیں پہنچائی تھی اور یہ صرف بارش کے پانی کا کرشمہ تھا کہ وہ اپنے اندر توانائی محسوس کر رہے تھے۔ ان کی آنکھیں اندر کو دھنس چکی تھیں اور ٹانگیں سوکھ کر ناکارہ ہو گئی تھیں۔ وہ دل ہی دل میں خدا سے دعائیں مانگتے رہے' حتیٰ کہ ان پر غنودگی طاری ہو گئی۔

دوسرے روز دوپہر کے وقت جب ان کی نقاہت انتہا کو پہنچ چکی تھی اور رات بھر کی سردی کھائے ہوئے جسم بے جان سے تھے' سمندر کے جنوب مغربی افق پر انہیں ایک چھوٹی سی سیاہ لکیر دکھائی دی۔ حیرت انگیز طور پر ان کے جسم میں برقی رو دوڑ گئی۔ وہ اٹھ بیٹھے اور کمزوری کے باوجود چپو چلا کر کشتی کو اس لکیر کی جانب لے جانے کی کوشش کرنے لگے۔ زندگی نے ایک بار پھر انہیں بلا لیا تھا' مگر اس زندگی کو پانے کے لیے انہیں جاں کنی کے عالم سے گزرنا پڑا...... جزیرہ بہت دور تھا اور سمندر میں طوفانی لہریں مسلسل اٹھ رہی تھیں جو کشتی کو حقیر کھلونے کی مانند پرے دھکیل دیتیں۔ جلد ہی وہ دونوں ہانپنے لگے اور کپتان جیمز نے تو خون بھی تھوکا جسے دیکھ کر ڈینیل فوس کے چہرے پر زردی چھا گئی اور وہ بھی نڈھال ہو کر کشتی میں گر پڑا۔

شام کے وقت ہوا کا رخ یکا یک تبدیل ہوا اور' دیو پیکر موجوں کا شور آہستہ آہستہ کم ہونے لگا۔ ان کی کشتی جزیرے کی جانب ہچکولے کھاتی بڑھنے لگی۔ انہوں نے ہمت کر کے ایک بار پھر اپنے بیس بیس فٹ لمبے چپو سنبھالے اور کشتی کو تیزی سے ادھر لے جانے لگے۔ لیکن پندرہ منٹ بعد ہی وہ تھک کر چور ہو گئے اور کشتی کو سمندر کی موجوں کے حوالے کر دیا۔ ساری رات وہ سو نہ سکے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر جزیرے کی طرف دیکھتے رہے جو ستاروں کی مدھم روشنی میں انہیں صاف دکھائی دے رہا تھا۔

جب سمندر کے مشرقی کنارے سے سورج نے اپنا چمک دار چہرہ نکالا' تو دونوں دوست یہ دیکھ کر بے حد خوش ہوئے کہ جزیرہ ان سے قریباً دو میل دور رہ گیا ہے اور کشتی اسی جانب تیر رہی ہے' لیکن جب وہ جزیرے کے اور قریب ہوئے' تو یہ دیکھ کر ان پر ہیبت طاری ہو گئی کہ اس کے گرد بڑی بڑی چٹانیں ہیں اور وہاں بہت اونچی اونچی شوریدہ سر موجیں اٹھ رہی ہیں جو ان چٹانوں سے ٹکراتی ہیں' تو ایک مہیب شور پیدا ہوتا ہے اور اگر کشتی ان موجوں کی لپیٹ میں آ کر چٹانوں سے ٹکرا گئی' تو چند ثانیوں میں ان کے اعضاء فضا میں بکھر جائیں گے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ تیر کر جزیرے تک پہنچا جائے۔ دونوں نے اپنے اپنے چپو سنبھالے تاکہ ان کا سہارا لیا جا سکے اور ابھی وہ سمندر میں اپنے آپ کو گرا دینے کی تیاریاں ہی کر رہے تھے کہ عقب سے ایک زبردست لہر آئی جس کی اونچائی سات فٹ تھی۔ اس لہر نے کشتی کو پانی سے اوپر اٹھا کر ایک چٹان پر دے مارا اور دونوں آدمی سمندر کی لہروں میں گم ہو گئے۔ ڈینیل فوس ایک اچھا تیراک تھا۔ اس لیے وہ جلد ہی پانی کی سطح پر آ گیا اور یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ بیس فٹ لمبا چپو اس کے قریب ہی پڑا تھا' اس نے بڑی جدوجہد کے بعد چپو پکڑ لیا اور موجوں کے درمیان ڈوبتا' ابھرتا ایک ساحلی چٹان پر پناہ لینے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے بعد اس

نے زندگی بھر کپتان جیمز کو نہیں دیکھا' البتہ کشتی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اسے تیرتے دکھائی دیئے جو ایک لمحے میں نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

* * *

ڈینیل فوس نے جب جزیرے پر قدم رکھا تو سورج غروب ہونے میں آدھ گھنٹہ باقی تھا اور فضاء میں خنکی تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ فوس کا بھیگا ہوا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ رات کی تاریکی چھا جانے سے پہلے کوئی مناسب پناہ گاہ تلاش کر لینی چاہیے۔ وہ بمشکل لڑکھڑاتے قدموں سے ایک جانب چلنے لگا۔ اس کے چاروں طرف اونچی اور ویران چٹانیں اور ریتلی زمین پھیلی ہوئی تھی۔ کافی دیر تک ادھر ادھر پھرنے کے باوجود اس نے کوئی پودا یا پانی کا چشمہ نہیں پایا۔ لمحہ بہ لمحہ اس کی مایوسی اور خوف میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایسے جزیرے میں قید ہو چکا ہے جہاں پینے کے لیے پانی ہے اور نہ کھانے کے لیے کوئی قدرتی شے...... اور جہاں اس سے پہلے کسی انسان نے قدم نہیں رکھا۔ تقریباً آدھ میل لمبا اور چوتھائی میل چوڑا یہ جزیرہ بالکل ویران اور بے آب و گیاہ تھا۔ یہاں چاروں طرف برہنہ اور بدصورت چٹانیں سینہ تانے کھڑی تھیں جن کا رنگ ہزار ہا سال کی گردش لیل و نہار کے باعث گہرا سیاہ پڑ چکا تھا اور جنہیں دیکھ کر ہیبت طاری ہوتی تھی۔ ڈینیل فوس کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کی بے بسی پر یہ چٹانیں قہقہے لگا رہی ہوں۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ جزیرے پر کوئی جانور' کوئی پرندہ' حتیٰ کہ کیڑے مکوڑے بھی نہیں تھے۔ ایک مقام پر گہرے پتھریلے گڑھوں کے اندر فوس نے بارش کا بھرا ہوا پانی دیکھا' لیکن اس میں سے ناقابل برداشت بدبو اٹھ رہی تھی اور ویسے بھی اس میں ریت کی اتنی آمیزش تھی کہ فوس خواہش اور پیاس کے باوجود اسے چکھ نہ سکا۔ جب وہ گھومتے گھومتے تھک گیا اور اس کی رہی سہی طاقت نے جواب دے دیا' تو وہ غار نما چٹان کے اندر جا کر لیٹ گیا' اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کہاں ہے اور

کس طرح یہاں آ گیا۔ اس کا ذہن مسلسل حادثوں' بھوک پیاس اور تھکن کے باعث کام کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ سردی سے بچنے کا بھی اس کے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا۔ وہ بار بار سوچتا تھا کہ کیا یہ ایک ڈراؤنا خواب تو نہیں' مگر جب وہ اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیتا' تو اس کا شک و شبہ یقین میں بدل جاتا۔ پھر اسے نیگوسی ایٹر کا غرق ہونا اور کشتی میں بائیس آدمیوں کا سوار ہونا اور یکے بعد دیگرے سب کا ختم ہو جانا یاد آتا' تو فرطِ خوف سے اس کا کمزور جسم دیر تک کانپتا رہتا۔

رات بھر وہ وہاں پڑا رہا' اسے نیند کا بھی احساس نہیں ہوا' البتہ سورج کی پہلی کرن جزیرے پر جونہی نمودار ہوئی' وہ گھسٹتا ہوا غار کے کنارے تک آیا اور اپنی دھنسی ہوئی آنکھوں سے باہر کا منظر دیکھنے لگا۔ جزیرے کے ساحل پر اونچی اونچی طوفانی موجیں چٹانوں سے سر ٹکرا رہی تھیں اور سفید سفید جھاگ فضاء میں دور تک پھیل رہے تھے۔ وہ سوچنے لگا کہ سمندر کے اس حصے میں مچھلیوں کا زندہ رہنا ممکن نہیں' اس لیے یہاں سے خوراک حاصل نہیں کی جا سکتی۔ بس مجھے چپ چاپ اپنے آپ کو موت کے حوالے کر دینا چاہیے۔ دوپہر کو وہ غار سے باہر نکلا اور سوچا کہ پورے جزیرے کا چپہ چپہ دیکھنا چاہیے' شاید کھانے کے لیے کوئی شے مل جائے۔ وہ ایک جانب چل پڑا اور سہ پہر تک شمالاً جنوباً اور شرقاً غرباً اس کا گوشہ گوشہ دیکھ ڈالا' مگر وہاں تو تپتی ہوئی ریت اور ننگی چٹانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس کی مایوسی اب انتہا کو پہنچ گئی۔ اسے پہلی بار ان عجیب حالات میں اپنے اوپر ہنسی آئی۔ خدا کے کام بھی نرالے ہیں' بھلا اس ویران جزیرے پر مجھے بھیجنے اور موت کے فرشتے کو یہاں تکلیف دینے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا میری روح کسی اور جگہ قبض نہیں کی جا سکتی تھی۔

دو دن اور راتیں گزرنے کے بعد فوس کے بازوؤں اور ٹانگوں میں سے جان نکل گئی۔ اب وہ کھڑا ہو کر چلنے کے قابل نہ تھا اور بہت مشکل سے گھسٹ گھسٹ کر کچھ

فاصلہ طے کرسکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر جسم کو حرکت نہ دی' تو وہ نہایت بے کسی کی موت مرے گا اور اس کے لیے وہ تیار نہ تھا۔ اپنی بچی کھچی طاقت جمع کر کے وہ پھر جزیرے میں گھومنے کے لیے نکلا اور اس مرتبہ اسے ایک عجیب انکشاف کا سامنا کرنا پڑا۔ اس نے ایک چٹان کے نیچے مرا ہوا سمندری بچھڑا پایا جس میں سے بدبو کے بھبکے اٹھ رہے تھے' مگر ڈینیل فوس کے لیے یہ سڑا ہوا گوشت اتنا لذیذ اور مقوی ثابت ہوا کہ اس نے تھوڑی ہی دیر میں اپنا پیٹ بھر لیا اور وہیں پڑ کر سو گیا۔ جب وہ بیدار ہوا' تو چاروں طرف تاریکی تھی۔ اس نے اپنا بدن جلتا ہوا محسوس کیا۔ اسے بخار ہو گیا تھا اور ہونٹ سوج کر موٹے ہو چکے تھے۔ وہ سمجھ گیا کہ سمندری بچھڑے کے زہریلے گوشت نے یہ اثر کیا ہے' تاہم وہ بقایا گوشت اٹھا کر اسی غار میں لے گیا جہاں وہ دو دن بسر کر چکا تھا۔

آدھی رات کے وقت اس نے جزیرے پر عجیب سی آوازوں کا شور سنا اور وہ دل ہی دل میں سخت حیران ہوا کہ یہ شور کہاں سے بلند ہو رہا ہے۔ کتوں کے بھونکنے اور گیدڑوں کے چلانے کی سی ملتی جلتی آوازیں تھیں جو جزیرے میں پھیلے ہوئے ہولناک سناٹے کو چیرتی ہوئی ڈینیل فوس کے کانوں میں پہنچ رہی تھیں۔ وہ دیر تک ان آوازوں کو سنتا رہا۔ اسے خیال آیا کہ سب اس کے وہم کا کرشمہ ہے۔

صبح کو جب اس کی آنکھ کھلی' تو بخار اتر چکا تھا۔ سوجے ہوئے ہونٹ بھی اپنی پہلی حالت پر آ گئے تھے' مگر گلے میں تیز خراشیں سی پڑی ہوئی محسوس ہوئیں۔ وہ غار کے اندر لیٹا ہوا گزشتہ رات سنی ہوئی پراسرار آوازوں کے بارے میں سوچنے لگا۔ پھر کسی فوری قوت کے زیر اثر وہاں سے گھسٹتا ہوا باہر نکلا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

اس نے جونہی باہر جھانکا' فرطِ حیرت اور مسرت سے اس کا دل زور سے دھڑکا۔ اب آوازوں کا راز اس کی سمجھ میں آ چکا تھا۔ اردگرد کی چٹانوں اور جزیرے کے ساحل پر جہاں تک اس کی نظر کام کرتی تھی' چھوٹے چھوٹے ہزار ہا سمندری بچھڑے دھوپ سینکتے

ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ جلدی سے غار میں گیا اور چاقو کے علاوہ اپنا دوسرا ہتھیار...... لکڑی کا بیس فٹ لمبا چپو اٹھا لایا...... اس وقت اس میں نہ جانے کہاں سے اتنی قوت آ گئی تھی کہ وہی چپو جو تھوڑی دیر پہلے اس سے اٹھایا بھی نہ جاتا' اب آسانی سے جنبش میں آ گیا تھا۔ وہ دیوانوں کی طرح وحشیانہ انداز میں ان ہزار ہا سمندری بچھڑوں کے اندر گھس گیا اور انہیں چپو مار مار کر ہلاک کرنے لگا۔ سمندر بچھڑوں نے حیرت سے اسے دیکھا اور اس سے پیشتر کہ معصوم جانور کچھ سمجھیں' ڈینیل فوس نے بہت سے بچھڑوں کو مار ڈالا۔ اس کے بعد وہ تھک کر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب اسے ہوش آیا' تو اس نے اپنے اردگرد سینکڑوں سمندری بچھڑوں کی لاشیں پائیں۔ اتنی دیر میں زندہ بچ جانے والے بچھڑے اس سے ڈر کر سمندر میں غائب ہو چکے تھے۔

اب اس نے اپنا چاقو استعمال کیا اور بچھڑوں کا گوشت کاٹ کاٹ کر ڈھیر کرنے لگا۔ تازہ گوشت کھا کر اس کی جان میں جان آئی اور وہ بڑی سرگرمی سے گوشت کا یہ بڑا ذخیرہ اٹھا اٹھا کر اپنے غار کے قریب لے جانے لگا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ دھوپ میں سکھا لینے کے بعد اس گوشت سے کئی ماہ تک پیٹ کی آگ بجھائی جا سکتی ہے۔ سمندری بچھڑوں کا گوشت ٹکڑے ٹکڑے کرنے اور انہیں دھوپ میں سکھانے کا کام کئی ہفتوں تک جاری رہا اور اس دوران میں ڈینیل فوس کی زائل شدہ جسمانی قوت آہستہ آہستہ بحال ہوتی چلی گئی۔ ابتدائی چند ہفتے تو وہ بے حد مطمئن اور آسودہ رہا' مگر تنہائی اسے ڈسنے لگی' لیکن تنہائی دور کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ گھنٹوں ریت پر لیٹا چمکیلے آسمان کو دیکھتا رہتا اور سوچتا کہ کیا اسے اس جزیرے سے کبھی نکلنا نصیب ہو گا؟ یہ جزیرہ یقیناً جہازوں کے عام سمندری راستوں سے بہت ہٹ کر واقع ہے اور اسی لیے یہاں کبھی انسان نے قدم نہیں رکھا۔ عین ممکن ہے کہ کسی وقت کوئی بھولا بھٹکا جہاز یہاں آ نکلے اور اسے اپنے ساتھ لے جائے......

خوراک کا مسئلہ تو حل ہو گیا تھا' مگر پینے کے لیے پانی کہاں سے آئے؟ یہ سوال بار بار اسے پریشان کرتا' اس نے پیاس سے مجبور ہو کر ایک دو مرتبہ سمندری بچھڑوں کا رقیق بدبودار خون بھی پیا' لیکن تشفی نہ ہوئی' بلکہ پیاس اور بھی بڑھ گئی۔ اس کے کپڑے تار تار ہو چکے تھے جنہیں بدن پر لپیٹے رکھنا فضول تھا' البتہ اس کی جیکٹ اب بھی کہیں کہیں سے سلامت تھی۔ اس نے ان کپڑوں کو ایک جگہ حفاظت سے رکھ دیا اور خود برہنہ جسم جزیرے پر پھرنے لگا۔ سمندری بچھڑوں کے علاوہ یہاں اسے دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔

اس نے دور اندیشی کا ثبوت دیتے ہوئے جزیرے کی ریتلی زمین پر اپنے چپو سے کئی گڑھے کھود لیے تھے اور ان گڑھوں کی تہہ میں اور دیواروں کے ساتھ پتھر چن لیے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ ان میں بارش کا پانی عرصے تک محفوظ کیا جا سکتا ہے' لیکن بارش کب ہو گی؟ یہ سوال خاصا پریشان کن تھا' آسمان پر سیاہ بادلوں کے آوارہ ٹکڑے نمودار ہوتے اور ڈینیل فوس کی بے بسی کا مذاق اڑاتے ہوئے دور نکل جاتے۔ اس نے کئی بار محسوس کیا کہ بارش جزیرے پر ہونے کے بجائے دور سمندر پر ہو رہی ہے۔ ایک رات جب وہ اپنے غار کے ایک گوشے میں بے خبر سو رہا تھا' ایک گرجدار آواز سن کر اس کی آنکھ کھل گئی۔ یکایک بجلی کوندی اور جزیرہ روشن ہو گیا۔ آسمان پر بادل گرج رہے تھے اور باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ ڈینیل فوس جوش مسرت میں باہر نکلا اور ریت پر لیٹ کر منہ کھول دیا۔ چند ہی منٹ میں بارش کے پانی نے اس کے تن مردہ میں جان ڈال دی' بلکہ اس کے بنائے ہوئے گڑھے بھی پانی سے پر ہو گئے اور فوس نے جلدی سے بڑے بڑے پتھر اٹھا کر ان کے منہ ڈھانپ دیے تاکہ دن کے وقت سورج کی گرمی سے یہ پانی بھاپ بن کر نہ اڑ سکے۔

بارش تین گھنٹے تک مسلسل ہوتی رہی اور ڈینیل فوس اتنی ہی دیر بارش میں نہاتا رہا۔ سمندر میں بھی بڑی بڑی لہریں اٹھنے لگی تھیں۔ بجلی کڑک رہی تھی اور بادلوں کی گرج سے

ایک شور قیامت بپا تھا' مگر ڈینیل فوس عناصر فطرت کی اس برہمی سے بے پروا ہرن کی طرح چوکڑیاں بھر رہا تھا۔ اس نے جزیرے کے کئی چکر لگائے اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے یہ جزیرہ صدیوں سے اس کا مسکن ہے۔

خوراک اور پانی کا مسئلہ حل ہونے کے بعد اسے جس احساس نے بہت پریشان کیا' وہ احساس تنہائی تھا۔ وہ سوچتا کہ فرض کیجیے' مجھے زندگی کا بقیہ حصہ اسی جزیرے پر بسر کرنا پڑے اور یہاں سے نکلنے کی ساری امیدیں منقطع ہو جائیں' تو پھر کیا ہو گا؟ کیا میں پاگل نہ ہو جاؤں گا؟ کاش کپتان جیمز اور ڈاکٹر جونز زندہ سلامت رہتے اور ہم تینوں یہاں آ جاتے' تو کم از کم اس تنہائی سے تو نجات مل جاتی۔ اے خدا! میری حالت پر رحم کر۔ یہ سوچتے سوچتے وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا' لیکن اس کی حالت دیکھنے والا وہاں کوئی نہ تھا۔ دور...... ایک چٹان کے زیرِ سایہ آپس میں شوخیاں کرتے سمندر بچھڑوں نے پانی سے سر نکال کر اس کی جانب دیکھا اور پھر غائب ہو گئے۔

رو دھو کر اس نے اپنی طبیعت کچھ ہلکی محسوس کی جیسے دل میں بھرا ہوا رنج و غم کا غبار ڈھل گیا ہو۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اپنے آپ کو کسی نہ کسی کام میں ہر وقت مصروف رکھنا چاہیے۔ تنہائی سے بچنے کی یہی ایک تدبیر ہے' لیکن یہاں کام کیا ہو؟ ان برہنہ چٹانوں سے سر پھوڑا جائے؟ آخر اس نے چھوٹے چھوٹے چٹانی پتھروں سے اپنے لیے مکان تعمیر کرنے کا ارادہ کیا۔ ساحل سے گیلی ریت اور مٹی لا لا کر وہ جزیرے کے سب سے اونچے مقام پر جمع کرتا رہا۔ کئی روز تک وہ اس کام میں مصروف رہا۔ پھر وہ بڑے بڑے اور چھوٹے چھوٹے پتھر دور دور سے لاتا رہا۔ سخت مشقت سے اسے دو فائدے پہنچے۔ ایک تو اس کی مصروفیت کا بہانہ نکل آیا اور دوسرے اس نے اپنے بدن میں پہلے سے کہیں زیادہ چستی اور قوت محسوس کی۔ چار ہفتے تک وہ سورج کی تپتی اور جھلسا دینے والی دھوپ میں پتھر ایک دوسرے پر رکھ کر مکان تعمیر کرتا رہا اور آخر کار اس نے بارش اور

دھوپ سے بچنے کے لیے خاصا بڑا' لیکن بھدا سا کمرہ تیار کرلیا جس کے اوپر ایک بڑی چٹان نے سایہ ڈال رکھا تھا۔ یہاں کھڑے ہو کر وہ میلوں تک سمندر کا بخوبی نظارہ کرسکتا تھا' لیکن افسوس کہ اتنے عرصے تک کوئی جہاز اسے دکھائی نہیں دیا۔ اس نے لکڑی کے لمبے چپو کے سرے پر اپنی جیکٹ کا پھریرا بنا کر باندھا اور پھر اس کو ایک جانب گاڑ دیا۔ اسے امید تھی کہ شاید کبھی کوئی جہاز یہ جھنڈا لہراتا دیکھ کر اس طرف آ نکلے اور اسے اپنے ساتھ لے جائے۔

ایک روز جب وہ چٹان پر بیٹھا سمندر میں ڈوبتے سورج کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا' اسے ایک اور خیال آیا۔ وہ سوچنے لگا مجھے یہاں آئے ہوئے بہت دن گزر چکے ہیں۔ عین ممکن ہے مجھے یہاں کئی سال لگ جائیں۔ مجھے دنوں کا حساب ضرور رکھنا چاہیے' مگر یہ حساب کیسے رکھا جائے؟ میرے پاس کاغذ ہے نہ قلم اور نہ روشنائی۔ اس نے بے خیالی میں اپنے سر پر ہاتھ پھیرا اور ایک دم اس کے جسم میں جیسے تھرتھری سی چھوٹ گئی۔ وہ دوڑتا ہوا پانی کے ایک گڑھے کے پاس گیا' اس کے منہ پر سے پتھر اٹھایا اور ساکن پانی میں اپنی صورت دیکھنے لگا۔ اس کے سر کے الجھے ہوئے بال بری طرح بڑھ گئے تھے۔ ڈاڑھی سات انچ سے بھی زائد فاصلہ طے کر چکی تھی اور مونچھیں بے ترتیبی سے ڈاڑھی کے بالوں میں گم ہو گئی تھیں۔ اس کے سارے جسم پر گھنے بال اگ رہے تھے۔ اس نے اپنا عکس پانی میں دیکھ کر خیال کیا کہ مجھے کوئی اس حالت میں دیکھے تو کبھی نہ سمجھے کہ میں انسان ہوں' بلکہ وہ مجھے بھوت پریت سمجھ کر ضرور ڈر جائے گا...... مجھے ان بالوں سے نجات پانے کے لیے بھی کچھ کرنا چاہیے۔

اگلے روز علی الصبح اس نے اپنا کند چاقو اٹھایا اور ایک پتھر پر اس کا پھل رگڑ کر تیز کرنے لگا۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کی دھار خاصی تیز ہو گئی ہے' تو اس نے اپنے بال اور ڈاڑھی مونڈنا شروع کر دی۔ ابتداء میں تو بالوں کے گچھے آسانی سے اترتے

رہے' لیکن تین چار ہاتھ چلانے کے بعد ہی دھار نے جواب دے دیا اور اس کوشش میں ڈینیل فوس نے اپنی کھوپڑی اور چہرہ لہولہان کرلیا۔ ہر تازہ زخم پر اس کے جنون میں اضافہ ہو جاتا اور وہ پہلے سے بھی زیادہ بے رحمی کے ساتھ چاقو سے بال مونڈنے کی کوشش کرنے لگتا۔ ایک دو مرتبہ اسے خیال آیا کہ اپنا گلا کاٹ کر اس مصیبت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نجات حاصل کر لی جائے' لیکن کسی نادیدہ قوت نے اسے اس مہلک حرکت سے روک دیا۔

دن آہستہ آہستہ گزرتے چلے گئے' یہاں تک کہ اسے اس جزیرے کو آباد کیے ہوئے پورا ایک برس گزر گیا۔ دنوں کا شمار کرنے کے لیے اس نے یہ تدبیر اختیار کی کہ لکڑی کے چپو پر ہر ساتویں دن وہ چاقو سے ایک نشان لگا دیتا۔ سمندری بچھڑوں کا کچا گوشت کھاتے کھاتے وہ اکتا گیا' لیکن اس کے سوا اور چارہ بھی کیا تھا۔

پہلے سال کے اختتام پر اس نے فیصلہ کیا کہ جزیرے کے سب سے اونچے مقام پر پتھروں کا ایک بلند مینار تعمیر کرنا چاہیے۔ عین ممکن ہے کہ جزیرے کے قریب سے گزرتا ہوا کوئی جہاز اسے دیکھ کر آ نکلے۔ ایک سال میں اس نے سمندر کے اس حصے میں کوئی جہاز نہیں دیکھا' اس لیے وہ مایوس بھی تھا' تاہم اسے موہوم سی امید تھی کہ کوئی نہ کوئی جہاز ادھر سے ضرور گزرے گا۔ وہ ایک بار پھر عزم کے ساتھ اپنے کام میں لگ گیا اور چھوٹے بڑے پتھر جمع کر کے ایک بلند چٹان پر پہنچاتا رہا۔ سارا سارا دن وہ تیز دھوپ میں کام کرتا اور پسینے میں اس کا بدن تر ہو جاتا' مگر وہ سورج غروب ہونے تک کام میں جتا رہتا۔ رات کو تھک ہار کر جب وہ اپنی پناہ گاہ میں پتھروں کے بنے ہوئے بستر پر آرام کرتا' تو آسمان پر چمکتے ہوئے ستاروں کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے' عالم تصور میں وہ اپنی بیوی اور دو معصوم بچوں کو دیکھتا جو اس کی گمشدگی پر پریشان اور مغموم تھے۔ اس عالم میں اسے بچپن میں پڑھی ہوئی ایک مناجات یاد آ جاتی جسے وہ بھرائی ہوئی

آواز میں گانے لگتا اور پھر اسی عالم میں اسے نیند آ جاتی۔ صبح اٹھتے ہی وہ پھر مینار کی تعمیر میں لگ جاتا۔ کئی ہفتوں کی جاں کاہ مشقت کے بعد اس نے تیس فٹ اونچا مینار تعمیر کر لیا اور جان پر کھیل کر وہ اس پر چڑھا اور اپنی جیکٹ اس کے اوپر باندھ دی۔

دوسرا سال بھی بیت گیا۔ کوئی جہاز ادھر سے نہیں گزرا۔ اب وہ پنجرے میں قید وحشی درندے کی طرح جزیرے پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک بے چینی کی حالت میں پھرتا رہتا' اس کی نگاہیں افق پر کسی جہاز کو تلاش کرتیں' مگر ناکام لوٹ آتیں۔ وہ تنہائی کے احساس کو زائل کرنے کے لیے گھنٹوں اپنے آپ سے باتیں کرتا۔ اپنی زندگی کے مختلف واقعات' مہمات اور حادثوں کو اس انداز میں بیان کرتا جیسے کسی دوست سے مخاطب ہے۔ جب وہ بولتے بولتے تھک جاتا' تو پھر خاموشی سے افق کو گھورنے لگتا۔

تیسرے سال کے درمیانی مہینے میں اس نے سمندر میں ایک جہاز دیکھا جو کھلونے کی مانند نظر آ رہا تھا۔ اگرچہ یہ جہاز جزیرے سے بہت فاصلے پر تھا اور ڈینیل فوس کے پاس اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا' تاہم وہ اپنی مسرت کو دبا نہ سکا اور کسی غیبی آواز نے اس کے کان میں کہا: ''گھبرا مت' تو یہاں سے ایک روز آزاد ہو جائے گا۔'' وہ حسرت بھری نظروں سے جہاز کو دیکھتا رہا جو چند لمحے بعد نظروں سے غائب ہو گیا۔ چوتھے سال مارچ کے مہینے کی ایک تاریک رات کو جب کہ ڈینیل فوس اپنی پناہ گاہ میں آرام کر رہا تھا' جزیرے پر باد و باراں کا ایک قیامت خیز طوفان نازل ہوا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے پورا جزیرہ خشک پتے کی مانند لرز رہا ہے۔ آسمان پر بادل گرج رہے تھے۔ بجلی کی کڑک چمک اپنے عروج پر تھی اور سمندر میں طوفان کا شور ان سب آوازوں پر چھا جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ڈینیل فوس نے اپنی زندگی میں بہت سے طوفان دیکھے تھے' لیکن بحرالکاہل کے اس بے آباد اور گمنام جزیرے پر اندھیری

رات میں آنے والا یہ طوفان ان سب سے بڑھ کر ثابت ہوا۔ تھوڑی دیر بعد بڑی بڑی چٹانیں ہولناک آوازوں کے ساتھ ٹوٹ ٹوٹ کر سمندر میں گرنے لگیں اور ڈینیل فوس فرطِ دہشت سے اوندھے منہ گر پڑا اور گڑگڑا کر خدا کے حضور میں جان کی سلامتی کے لیے دعائیں مانگنے لگا۔

صبح تک طوفان کی یہی کیفیت رہی اور جب کانپتے ہوئے سورج نے سمندر کے مشرقی گوشے سے اپنا سر نکالا' تو ڈینیل فوس بھی اپنی پناہ گاہ سے لرزتا کانپتا باہر آیا۔ ایک رات کے اندر جزیرے پر کتنا عظیم انقلاب رونما ہو چکا تھا۔ جگہ جگہ ٹوٹی ہوئی چٹانیں بکھری ہوئی تھیں' یہاں ہزاروں مچھلیاں اور سمندری بچھڑے مرے ہوئے تھے۔ جب وہ گھومتا ہوا جزیرے کے جنوب مغربی حصے میں پہنچا تو یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہاں ایک بہت بڑی وہیل مچھلی مردہ پڑی ہوئی تھی جس کے جسم میں کئی ہارپون گڑے ہوئے تھے۔ ہارپون نیزے کی مانند ایک لمبا ہتھیار ہے جس سے زمانۂ قدیم میں اور اب بھی بہت سے ملاح سمندروں میں وہیل کا شکار کرتے ہیں۔ وہ دیر تک ان ہارپونوں کو دیکھتا رہا۔ اسے معلوم ہو گیا کہ سمندری شکاریوں کا کوئی جہاز قریب ہی سمندر میں گھوم رہا ہے اور یہ وہیل مچھلی اس بات کا ثبوت ہے جو طوفانی لہروں میں بہتی ہوئی اس جزیرے تک آ گئی ہے۔ اس کا تعمیر کردہ پتھروں کا تیس فٹ اونچا مینار طوفان کی نذر ہو چکا تھا اور اس کی جیکٹ کا پھریرا نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا' تاہم وہ ایک اور بلند چٹان پر چڑھ کر سمندر کی جانب دیکھنے لگا کہ شاید وہ جہاز دکھائی دے' مگر افسوس کہ جہاں تک اس کی نظر کام کرتی تھی' سمندر کی مضطرب اور جوش میں بھری ہوئی اونچی اونچی موجوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

چوتھا سال بھی بیت گیا اور پانچواں سال شروع ہوا۔ ڈینیل فوس کے بیس فٹ لمبے چپو پر چاقو کے اب اتنے نشان پڑ چکے تھے کہ اس میں دنوں کا شمار کرنے کے لیے اب

کوئی جگہ باقی نہ تھی۔ اس نے مایوس ہو کر چپو ایک طرف پھینک دیا اور افق کی طرف دیکھنے لگا۔ دن آہستہ آہستہ گزرتے رہے۔ ڈینیل فوس کے جسم پر اب بہت بڑے بڑے بال اگ آئے تھے اور وہ پانی میں جب اپنا عکس دیکھتا' تو اسے ریچھ کی شکل و صورت اور جسامت کا ایک آدمی نظر آتا۔ وہ سوچتا کہ کیا میں واقعی انسان سے حیوان ہوتا جا رہا ہوں۔ اس کے ذہن میں اس طرح کے پریشان کن خیالات چکر لگاتے اور پھر اس کے سر میں شدت کا درد اٹھتا اور وہ اپنی پناہ گاہ میں جا کر رونے لگتا۔

پانچویں سال کے اختتام پر وہ سخت بیمار پڑ گیا۔ بخار بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ وہ چلنے پھرنے سے بھی معذور ہو گیا۔ اسے اب اپنی موت کا پورا یقین ہو چکا تھا۔ اس پر ہذیان کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ اپنے دوستوں اور رشتے داروں کو پکارتا رہا' کبھی قہقہے لگاتا اور کبھی رونے لگتا۔ بیمار ہونے کے ایک ہفتے بعد اس نے جب محسوس کیا کہ بخار کچھ کم ہے' تو اس نے اپنے جسم کو حرکت دی اور کسی غیبی طاقت کے سہارے اپنی پناہ گاہ سے باہر نکلا اور فوراً ہی عادت کے مطابق اس کی نظر سمندر کے افقی حصے پر کسی جہاز کی تلاش میں بھٹکنے لگی اور پھر جیسے اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا' اس کی نظروں کے عین سامنے جزیرے سے ایک میل کے فاصلے پر ایک بڑا بحری جہاز لنگر انداز تھا جس کا سرخ پھریرا تیز ہوا میں لہرا رہا تھا اور اس پر انگلینڈ کے جھنڈے کی تصویر تھی۔ جہاز کو دیکھتے ہی ڈینیل فوس کی حالت میں ایک عظیم تغیر رونما ہوا۔ وہ اپنی بیماری اور نقاہت سب بھول گیا اور بے تحاشا کنارے کی طرف دوڑا اور اپنے دونوں بازو اوپر اٹھا کر پوری قوت سے چیخنے لگا۔ اسے جہاز کے عرشے پر ادھر ادھر پھرتے ہوئے بہت سے آدمی دکھائی دے رہے تھے۔ ڈینیل فوس کی چیخوں نے جلد ہی جہاز والوں کو اس کی طرف متوجہ کر لیا۔ چند منٹ بعد ہی اس نے ایک کشتی جزیرے کی طرف آتے دیکھی جسے پانچ ملاح چلا رہے

تھے۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ انہیں دیکھتا رہا اور پھر تاخیر سے گھبرا کر اس نے سمندر میں چھلانگ لگا دی اور لہروں سے لڑتا بھڑتا کشتی تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔

جب اسے ہوش آیا' تو اس نے اپنے آپ کو ایک سجے سجائے کیبن میں لیٹے ہوئے پایا۔ بہت سے چہرے اس پر جھکے ہوئے تھے۔ یہ جہاز نیپچون تھا جو بے ٹیویا سے نیو بیڈ فورڈ جا رہا تھا اور جس کا کپتان کیپٹن سیل تھا۔ کیپٹن سیل کو جب اس نے اپنی دکھ بھری داستان سنائی اور یہ بتایا کہ وہ اس ویران جزیرے میں پانچ سال سے قید ہے' تو کسی نے اس کی کہانی پر یقین نہ کیا' بلکہ پاگل سمجھ کر اسے تسلیاں دینے لگے۔ آخر ڈینیل فوس نے ان سے کہا کہ جزیرے پر پڑا ہوا وہ چپو اور اس کی پناہ گاہ دیکھی جائے جس پر وہ دنوں کا شمار کرتا رہا ہے۔ اس کا چپو تلاش کیا گیا اور تب کہیں ان کو ڈینیل فوس کی کہانی پر یقین آیا۔ کپتان سیل نے اس کی بے مثال جرات و ہمت پر آفرین کہی اور اپنے جہاز میں نائب کپتان کا عہدہ پیش کیا اور کہا:

"میرے دوست' تم قسمت کے دھنی ہو۔ بحر الکاہل کا یہ ویران جزیرہ کسی نقشے پر موجود نہیں اور نہ یہ جہازوں کے بحری راستے پر واقع ہے۔ گزشتہ رات ایک طوفان کے باعث ہمارا جہاز راستے سے بھٹک گیا اور ادھر آ نکلا۔ اگر تم ہمیں خبردار کرنے میں دس منٹ کی بھی تاخیر کرتے' تو ہم جہاز کا لنگر اٹھا چکے تھے۔ تمہیں اس نئی زندگی پر خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔"

ڈینیل فوس کی آنکھیں پر آب ہو گئیں اور اس نے آگے بڑھ کر کپتان کے قدم تھام لیے۔

* * *

ایک ہزار میل

ہمارا طیارہ بردار عظیم جنگی جہاز بحرالکاہل کی بیکراں وسعتوں میں جنوب کی طرف آہستہ آہستہ سفر کر رہا تھا۔ میں ابتدا ہی سے نہایت وہمی اور کمزور عقیدہ رکھنے والا آدمی ہوں۔ اگرچہ میں ایک ماہر ہواباز ہوں اور برسوں سے نیوی کے محکمے کے مختلف طیارہ بردار جہازوں میں ہواباز کے فرائض سرانجام دے رہا ہوں' لیکن اپنی فطرت کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ میں خیال کرتا ہوں کہ میری چھٹی حس غیر معمولی طور پر قوی ہے جو مجھے آنے والی مصیبتوں اور پریشانیوں سے پہلے ہی آگاہ کر دیتی ہے۔

12 جنوری 43ء کا ذکر ہے۔ اس روز علی الصبح میرا دل آپ ہی آپ بیٹھا جا رہا تھا۔ ایک نامعلوم سا اضطراب مجھ پر طاری تھا۔ میں نے اپنے آپ کو دوسرے کاموں میں مصروف رکھ کر اس اضطراب سے نجات پانے کی سعی کی' مگر ناکام رہا۔ ہر لمحے یہی احساس ہوتا کہ آج کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے......کوئی غیر معمولی حادثہ...... یہ حادثہ کب اور کس طرح نمودار ہوگا' یہ مجھے معلوم نہ تھا۔ دوپہر تک اضطراب کی یہ کیفیت بڑھتے بڑھتے ایک شدید بے چینی اور پھر نہایت تکلیف دہ خوف کی شکل اختیار کر گئی۔ میرے ساتھی میرے اس پرانے مرض سے بخوبی آگاہ تھے۔ جب انہوں نے مجھے چپ چاپ دیکھا' تو چھیڑنے لگے:

''خدا خیر کرے' آج ڈِکی (میرا پیار کا نام) پر پھر دورہ پڑا ہے۔''

''یارو' اپنی خیر مناؤ......جانتے نہیں جب ڈِکی پریشان ہوتا ہے' تو ضرور کوئی آفت نازل ہوتی ہے۔''

اسی قسم کے طنزیہ جملے تھے جو بار بار میرے کانوں سے ٹکراتے تھے۔ میں مصنوعی انداز میں مسکراتا اور کوئی جواب نہ دیتا۔ کھانے کے وقت جب میں سب کے ساتھ میز پر بیٹھا' تو کسی نادیدہ قوت نے میرے کان میں کہا:

''خوب پیٹ بھر کر کھا لو......ممکن ہے تمہیں اس کے بعد دیر تک کھانا نصیب نہ ہو۔''

میں بیٹھے بیٹھے چونک پڑا...... بخدا یہ پُراسرار آواز میں نے بہ ہوش و حواس خود اپنے کانوں میں گونجتی ہوئی محسوس کی......اس قدر گھبراہٹ اور خوف مجھ پر طاری ہوا کہ میں دو تین لقموں سے زیادہ نہ کھا سکا اور وہاں سے اٹھ کر اپنے کیبن کی طرف چلا گیا۔ جہاز کے ہسپتال کے قریب سے گزرا' تو وہاں کوئی شخص حلق پھاڑ پھاڑ کر چلّا رہا تھا۔ میں نے کمرے میں جھانکا' تو دو تین ڈاکٹر اور دوسرے ملازم ایک شخص کو میز پر لٹا کر اس کے ہاتھ پیر باندھ رہے تھے اور چیخنے والا شخص میرا ایک عزیز ترین دوست تھا جس پر حسب معمول پھر مرگی کا دورہ پڑ گیا تھا۔ لمبی میز پر لیٹا ہوا وہ پاگلوں کی طرح ہاتھ پیر چلا رہا تھا......ایک ثانیے کے لیے مجھے محسوس ہا کہ میں خود اس میز پر لیٹا یہ مجنونانہ حرکات کر رہا ہوں......اپنے کیبن میں پہنچ کر میں دھڑام سے بستر پر گر پڑا اور سسکیاں لے لے کر رونے لگا۔

دفعتہً میرے سرہانے لگی ہوئی گھنٹی بجی اور سُرخ بلب بار بار جلنے بجھنے لگا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے قضا کی گھڑی نزدیک آ گئی ہے۔ یہ ایڈمرل کی جانب سے ڈیوٹی پر فوراً حاضر ہونے کا اشارہ تھا۔ میں نے قریب پڑا ہوا فون اٹھایا اور جواب دیا کہ میں چند منٹ میں آ رہا ہوں......دھڑکتے دل کے ساتھ میں نے وردی پہنی' بیوی اور بچوں کی

تصویر پر الوداعی نظر ڈالی اور کیبن سے نکل کر ایڈمرل کے کمرے کی طرف دوڑا' لیکن وہ مجھے عرشے پر ہی مل گیا جہاں ایک لمبی قطار کی صورت میں چھوٹے چھوٹے نہایت طاقت ور بمبار طیارے پرواز کے لیے مستعد کھڑے تھے۔

''مسٹر ڈکسن......'' ایڈمرل نے بھاری لہجے میں کہا' ''آپ کو فوراً اگشت کے لیے روانہ ہو جانا چاہیے۔ مجھے ابھی ابھی وائرلیس پر اطلاع ملی ہے کہ ایک جاپانی جنگی جہاز ہمارے تعاقب میں روانہ کر دیا گیا ہے۔ آپ معلوم کیجیے کہ دشمن کا جہاز کس مقام پر ہے۔''

میں نے سر کے اشارے سے حکم کی تعمیل بجا لانے کا اقرار کیا اور جہاز میں سوار ہو گیا۔ ایک منٹ بعد میرے دونوں مددگار بھی جہاز میں چڑھ گئے۔ بحری جہاز کے لمبے رَن وے پر ایک زناٹے دار آواز کے ساتھ دوڑتا ہوا ہمارا بمبار طیارا فضا میں بلند ہو گیا۔ میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی' شام کے چار بجے تھے اور سورج کی آب و تاب آہستہ آہستہ غائب ہوتی جا رہی تھی۔ بحرالکاہل میں زبردست طوفان کی پُرشور آواز اس بلندی پر ہم بخوبی سن سکتے تھے۔ جوں جوں سورج مغرب میں جھک رہا تھا پانی کا رنگ سیاہ ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے اندازاً پچاس میل کا چکر لگایا' مگر جاپانی جنگی جہاز کا کہیں پتہ نہ تھا...... اب ہمارا جہاز مغرب کی سمت میں پرواز کر رہا تھا۔ یکا یک میں نے اپنے سامنے دیکھا کہ سیاہ بادلوں کا لامتناہی سلسلہ سمندر کے آخری کنارے سے نمودار ہو کر آسمان کو اپنی آغوش میں لینے کے لیے بے پناہ رفتار کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔ مخالف ہوا کا ایک زبردست طوفان اس کے جلو میں ہے۔ میں نے فوراً جہاز کا رخ بدل دیا اور اسے بادلوں سے اوپر لے گیا...... میرے ساتھیوں نے کہا کہ واپس چلنا چاہیے' طوفان شدید ہے اور ایسا نہ ہو کہ ہم اس میں گِھر جائیں' لیکن میں خاموش تھا کہ ہم آسانی سے اپنے جہاز تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ خطرے کی گھڑی لمحہ بہ لمحہ قریب آ رہی تھی......

دفعتہً میرا ساتھی ٹونی پاسٹولا بھرآئی ہوئی آواز میں بولا:

''چیف' جلدی کرو' گیس ختم ہونے والی ہے۔''

میں نے گھبرا کر گیس میٹر کا معائنہ کیا اور جسم ایک دم جیسے سُن ہو گیا۔ ایندھن قریب الختم تھا' ہم زیادہ سے زیادہ بیس میل اور پرواز کر سکتے تھے اور بیس میل کی اس پرواز میں صرف پانچ منٹ اور تھے۔ پانچ منٹ...... اگر اس حقیر عرصے میں ہم اپنے جہاز کو ڈھونڈ لیں' تو جان بچ سکتی ہے ورنہ...... میرا دوسرا ساتھی' جینی آلرچ بار بار وائرلیس پر جہاز سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کر رہا تھا' مگر جواب میں ہلکی سی ٹِک ٹِک اور سائیں سائیں کی آواز کے سوا کچھ اور سنائی نہ دیتا تھا۔ میں نے طیارے کو کافی نیچے اُتار لیا' تاکہ تیز ہوا اسے اپنے ساتھ نہ لے جائے۔ اب ہم سمندر کی سطح سے صرف سات سو فٹ کی بلندی پر اُڑ رہے تھے۔ نیچے بحرالکاہل کا پانی بھی طوفان کی آمد آمد سے مضطرب ہو کر جوش میں آ چکا تھا اور اس میں اونچی اونچی لہریں اٹھ رہی تھیں جیسے ہمیں پکڑنا چاہتی ہوں...... آسمان گہرے بادلوں میں چھپ چکا تھا' پھر فوراً ہی تیز بارش شروع ہو گئی۔

''تیار ہو جاؤ...... میں جہاز کو سمندر میں اتار رہا ہوں......'' میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا جن کے چہروں پر موت کے خوف سے ہوائیاں اُڑ رہی تھیں...... بپھری ہوئی لہروں کی آغوش میں پہنچتے پہنچتے ایندھن کی ٹنکی بالکل خالی ہو چکی تھی...... ایک دھماکے کے ساتھ جہاز کا نچلا حصہ پانی سے ٹکرایا اور دائیں جانب اُلٹ گیا۔

''لائف بوٹ فوراً پانی میں پھینک دو۔'' آلرچ نے ٹونی سے کہا' ''ورنہ ہم سب مچھلیوں کا کھاجا بن جائیں گے۔''

مجھے یقین نہیں تھا کہ جہاز اتنی سرعت سے غرق ہو جائے گا۔ کاربن ڈائی اکسائڈ چیمبر میں لگی ہوئی لائف بوٹ نکالنے تک جہاز کا آدھا حصہ پانی میں ڈوب چکا تھا۔ لائف بوٹ مضبوط پتلے ربڑ اور فیبرک کی بنی ہوئی تھی۔ چیمبر کا خول کھلتے ہی اس میں

خود بخود ہوا بھر گئی اور پھر ہم نے اسے پانی میں پھینک دیا اور پھر فوراً ہی کود گئے...... یہ سارا حادثہ اتنی تیزی سے پیش آیا کہ ہم ضرورت کی کوئی چیز حتیٰ کہ پانی کی بوتلیں بھی ساتھ نہ لے سکے......چشم زدن میں سمندر کی موجیں آٹھ فٹ لمبی چار فٹ چوڑی لائف بوٹ کو دھکیل کر جہاز سے دور لے گئیں...... میں نے دیکھا کہ ڈوبتے ہوئے طیارے کی بڑی بتیاں ابھی تک روشن ہیں اور پانی کے نیچے ان کی روشنی کی لکیر دور تک پھیلتی چلی گئی ہے۔ یہ بھی قدرت کا ایک معجزہ تھا کہ جہاز کی بتیاں جلتی رہ گئیں' ورنہ وہ بڑی بڑی خونخوار شارک مچھلیاں' جو تازہ شکار سمجھ کر طیارے کے گرد منڈلا رہی تھیں' اس طرف متوجہ نہ ہوتیں اور ہماری جانب لپکتیں......لیکن اتنی دیر میں ہم ان کے مہیب جبڑوں کی زد سے محفوظ ہو چکے تھے۔

اب ہم تین آدمی ربڑ کی اس پتلی سی کشتی میں دبکے بیٹھے ہوئے سمندر کی لہروں کے رحم و کرم پر تھے۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا تھا اور آسمان پر سیاہ بادل اُمڈ اُمڈ کر آ رہے تھے۔ بجلی چمکتی' تو دور دور تک سمندر کی دیوپیکر موجیں آپس میں ٹکراتی ہوئی دکھائی دیتیں اور ان کے زبردست شور سے کانوں کے پردے پھٹے جا رہے تھے۔ ہم تینوں لائف بوٹ کے اندر ایک دوسرے کے ساتھ چمٹے ہوئے تھے۔ زندگی میں بعض حادثے اور مصیبتیں ایسی آتی ہیں جب ہمیں اپنی موت کا پورا یقین ہو جاتا ہے اور ایسے حادثوں سے کس کی زندگی خالی ہے؟ اس رات کم از کم مجھے تو یہی دکھائی دے رہا تھا کہ موت ہمارے تعاقب میں ہے۔ اس وقت میں نے اپنے دل میں کسی قدر سکون محسوس کیا۔ طبیعت پر صبح سے جو اضطراب اور خوف چھایا ہوا تھا' وہ اب آخری شکل میں میرے سامنے آ چکا تھا اور غالباً یہی وجہ تھی کہ میں اطمینان سے مرنے کے لیے تیار تھا' البتہ میرے ساتھیوں کی حالت نہایت ابتر تھی۔ میں نے سنا کہ ٹونی پاسٹولا گڑگڑا کر خدا سے دعا مانگ رہا ہے۔ جینی آلرچ کے حلق سے بھی گھٹی گھٹی چیخیں نکل رہی ہیں۔ مجھے

یاد نہیں کہ کتنی دیر تک ان دونوں پر یہی کیفیت طاری رہی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یک لخت ہمیں کسی اور ہی دنیا میں پھینک دیا گیا ہے۔ لائف بوٹ سمندر کی خوفناک موجوں میں تنکے کی مانند اُچھلتی' کودتی اور ہچکولے کھاتی ہر لمحہ موت سے ہمکنار ہونے کے لیے آگے بڑھ رہی تھی۔

ساری رات یہ لرزہ خیز سفر جاری رہا۔ ہم نے اپنے آپ کو قدرت کے حوالے کر دیا تھا۔ رات کے آخری حصے میں بارش تھمی' بادل چھٹ گئے اور سیاہ آسمان پر اِکا دُکا تارے ہماری بے بسی پر مسکراتے دکھائی دیئے۔ صبح ہوتے ہوتے مہیب لہریں پُرسکون ہو چکی تھیں اور ہماری لائف بوٹ تیز رفتاری سے ہچکولے کھاتی کسی نامعلوم منزل کی جانب بڑھی جا رہی تھی۔ میں اپنے چہرے کی کیفیت خود بتانے سے قاصر ہوں' البتہ ساتھیوں کے چہرے میرے سامنے تھے۔ صرف ایک رات میں ایک ایسا عظیم انقلاب میں نمودار ہو چکا تھا کہ میں حیرت زدہ رہ گیا۔ موت کے خوف سے ان کے چہرے زرد اور آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ ہم سب خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ آخر ٹونی پاسٹولا نے کہا:

"کیا ایڈمرل ہماری تلاش میں کسی کو بھیجے گا؟"

اس کے ان الفاظ میں مجھے پہلی مرتبہ زندگی کی کرن چمکتی نظر آئی۔ آہ...... کیا واقعی یہ ممکن ہے۔ ایڈمرل ضرور کوئی نہ کوئی طیارہ اب تک ہماری تلاش میں روانہ کر چکا ہوگا......لیکن......کیا معلوم گزشتہ چودہ گھنٹوں میں ہم کہاں سے کہاں پہنچ چکے ہیں؟ اگر ہم اس وقت سمندر کے اس حصے میں ہیں جو دشمن کے قبضے میں ہے' تو پھر مدد کی توقع فضول ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے پاس یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا کہ ہم اپنے جہاز سے کتنی دور اور کس سمت میں سفر کر رہے ہیں۔ ساڑھے آٹھ بجے ہوں گے کہ افق پر ایک دھبہ سا نمودار ہوا جو آہستہ آہستہ قریب آ رہا تھا۔ ہم نے فوراً پہچان لیا کہ وہ

ہمارے ہی جہاز سے چلا ہوا ایک طیارہ تھا جو یقیناً ہمیں ڈھونڈ رہا تھا۔ جینی آرچ اور ٹونی کے اداس چہرے طیارے کو دیکھتے ہی خوشی سے دمکنے لگے۔ وہ جوش کی حالت میں کھڑے ہوگئے اور جلدی سے اپنی نیلی قمیصیں اتار کر زور زور سے ہوا میں ہلانے لگے' لیکن اگلے ہی لمحے ان کا سارا جوش وخروش کافور ہوگیا۔ طیارہ اچانک جنوب کی طرف مڑ گیا اور چند منٹ بعد نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ زندگی کی وہ کرن جو تھوڑی دیر پیشتر میری نظروں کے سامنے چمکی تھی' گھپ اندھیرے میں بدل گئی۔ طیارہ جوں ہی نگاہ کے دائرے سے باہر ہوا' میرا دل آپ ہی آپ بیٹھنے لگا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ان نازک حالات میں' جب کہ جنگ اپنے عروج پر ہے' جاپانی جنگی جہاز اور بمبار طیارے ہمارے تعاقب میں ہیں' ایڈمرل نکلی محض ہم تین آدمیوں کو بچانے کے لیے اپنے پورے جہاز اور اتنے بڑے عملے کو کبھی خطرے میں نہیں ڈالے گا۔ پھر میں دل ہی دل میں اس پر غور کرنے لگا کہ ہمارے بچاؤ کی آخر کیا صورت ہوگی۔ میں نے محسوس کیا کہ میرا ذہن اس وقت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ مغرب میں جتنے جزیرے ہیں' سب کے سب جاپانیوں کے قبضے میں ہیں اور آج کل یہ جاپانی قیدیوں سے اچھا سلوک کرنے کے موڈ میں نہیں...... سیسے کی تین گولیاں فوراً ہماری کھوپڑیوں میں سوراخ کرتی ہوئی نکل جائیں گی۔ مشرق کی طرف غیر آباد اور ویران جزیرے ہیں جن پر پہنچنا ویسے بھی آسان نہیں' کیوں کہ ادھر سمندر کی حالت زیادہ اچھی نہیں...... ہر وقت طوفانوں کی آمد آمد رہتی ہے۔ لے دے کر جنوب اور جنوب مغربی جزائر ہمارے لیے بہترین پناہ گاہ ثابت ہوسکتے ہیں جو اتحادیوں کے دوستوں کے قبضے میں ہیں' لیکن میرے حساب کے مطابق یہ جزیرے کم از کم پانچ سو میل کے فاصلے پر واقع تھے اور اتنا طویل فاصلہ دنیا کے سب سے بڑے سمندر میں ربڑ کی ایک معمولی سی کشتی کے ذریعے خیریت سے طے کرنا قدرت کا ایک یادگار معجزہ ہی ہوگا۔ اگر یہی بات چند روز پہلے میں جہاز پر کسی

ساتھی یا افسر اعلیٰ سے کہتا' تو وہ مجھے ضرور ملازمت سے برخاست کر کے پاگل خانے بھیج دینے کی سفارش کرتا۔

میں نے اپنے ساتھیوں کو ان تمام باتوں سے آگاہ کیا اور کہا کہ مدد کی توقع چھوڑ دو۔ اپنے دست و بازو اور خدا کی مدد پر بھروسہ کر کے ایسی تدبیریں سوچو کہ جانیں بچ جائیں۔ ٹونی پاسٹولا کے لبوں پر پھیکی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے گردن کو جھٹکا دیا اور کہنے لگا:

''چیف' اِن حالات میں جب کہ ہم قطعی بے یارومددگار ہیں' ہمارے پاس بچاؤ کا کوئی سامان نہیں' ہم کیا کریں گے؟ کم از کم میرا ذہن تو بے کار ہے۔ میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ جلد یا بدیر ہم ان بے رحم مچھلیوں کی خوراک بن جائیں گے۔''

یہ کہہ کر اس نے انگلی سے پانی کی طرف اشارہ کیا اور یہ دیکھ کر وحشت سے میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ بڑی بڑی سینکڑوں شارک مچھلیاں اپنے خوفناک جبڑے کھولے لائف بوٹ کے چاروں طرف تیر رہی تھیں۔ وہ بار بار کشتی کی طرف جھپٹتیں اور مایوس ہو کر لوٹ جاتیں۔ دوپہر تک وہ ہماری کشتی کا تعاقب کرتی رہیں۔ آہستہ آہستہ ان کی تعداد کم ہونے لگی۔ غالباً سمندر کا وہ حصہ جو ہم عبور کر رہے تھے' وہاں ان مچھلیوں کی ایک پوری بستی آباد تھی۔ شاید اکثر لوگوں کو یہ بات معلوم نہ ہو کہ بڑے بڑے سمندروں میں رہنے والی شارک مچھلیوں کے بھی بہت سے ''قبیلے'' ہیں۔ اگر کوئی مچھلی اپنی حد سے نکل کر دوسری مچھلیوں کی سرحد میں داخل ہوجائے' تو خود اس کی جان خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ دوسرے قبیلے کی شارک مچھلیاں اسے فوراً چٹ کر جاتی ہیں۔

مجھے معلوم تھا کہ اب ہمیں جلد ہی ان مچھلیوں کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ پچاس ساٹھ میل کے بعد ہی شارک مچھلیوں کی کوئی اور قسم سمندر میں ملے گی۔

سب سے پہلے یہ معلوم کرنا تھا کہ ہماری لائف بوٹ کس رفتار سے سفر کر رہی ہے۔

اس معاملے میں ہمارا بڑا انحصار سمندری ہوا پر تھا جو کبھی تیز چلنے لگتی اور کبھی آہستہ......ہوا کے بعد دوسرا بڑا مسئلہ لہروں کے اتار چڑھاؤ کا تھا۔ اگر یہ دونوں ہمارے موافق ہوں' تب ہم سلامتی کی امید رکھ سکتے تھے......لائف بوٹ چوں کہ ہلکی تھی' اس لیے زیادہ آسانی سے پانی کی لہروں پر بہتی چلی جا رہی تھی۔ ہوا کا تیز جھونکا آتا تو اس کی رفتار بڑھ جاتی۔ اس اعتبار سے سچ پوچھیے تو ہماری زندگیوں کا انحصار محض ہوا کے گھٹنے بڑھنے اور صحیح سمت میں چلنے پر تھا۔ اگر ہوا شمال مشرق کی طرف سے چلتی تو یہ ہمارے لیے اطمینان کا باعث ہوتا۔ اگر اس کا رُخ بدلتا' تو ہمارے چہرے اُتر جاتے' کیوں کہ اس جانب سفر کرنے میں ہم یقیناً موت یا تباہی کے منہ میں جا گرتے۔ میں نے لائف بوٹ کو غلط رخ پر جانے سے روکنے کے لیے ایک تدبیر سوچی اور یہ کسی حد تک کارگر ثابت ہوئی۔

لائف بوٹ کے چاروں طرف کنارے کے ساتھ ساتھ ریشم کی ایک پتلی' لیکن بے حد مضبوط ڈوری بندھی تھی۔ میں نے جھٹ پٹ یہ ڈوری کھولی' بوٹ کے ایک جانب لگے ہوئے گیس انڈیکیٹر کی نلکی نکال کر رسّی کے ایک سرے سے باندھی' وزن پھر بھی زیادہ نہ ہوا۔ مجبوراً اپنی جیکٹ بدن سے اتار کر باندھی۔ گویا یہ ایک قسم کا لنگر تیار ہو گیا۔ سمندری ہوا کا رُخ جوں ہی مخالف ہوا' میں نے یہ "لنگر" پانی میں پھینک دیا اور یہ معلوم کر کے دلی خوشی ہوئی کہ لائف بوٹ کی تیز رفتار فوراً ہلکی ہو گئی۔

اس روز سارا دن اسی قسم کی جدوجہد میں بیت گیا۔ سورج سمندر میں غروب ہوا اور آسمان پر تارے جھلملانے لگے۔ ہوا ایک بار پھر ہماری معاونت کے لیے سلامتی کی جانب جا رہی تھی۔ اب ہمیں پہلی بار احساس ہوا کہ اس ہولناک سفر کے لیے ہمارے پاس زادِراہ بالکل نہیں ہے۔ ہمارا طیارہ توقع کے خلاف اس سرعت سے غرق ہوا کہ کھانے پینے کا سامان نکالنا تو ایک طرف' ہم بمشکل اپنی جانیں بچا سکے تھے۔ جس حال میں طیارے پر سوار تھے' اسی حال میں باہر کود گئے تھے۔ اب ہم نے اپنی اپنی جامہ تلاشی

لی' تو معلوم ہوا کہ ہمارے پاس دو لائف جیکٹ' ایک جیبی پستول' ایک چھوٹا چاقو' چند اوزاروں اور چمڑے کے جیبی بٹوؤں کے سوا اور کوئی شے نہیں ہے۔ پینے کا پانی نہ کھانے کے لیے خوراک۔

پانچ روز اسی طرح سمندر میں گزر گئے۔ ہوا کا رخ جنوب ہی کی طرف تھا۔ پانچ روز کے مسلسل فاقے اور پیاس نے ہمیں نڈھال کر دیا تھا۔ لائف بوٹ میں ایک دوسرے کے قریب لاشوں کی طرح پڑے ہوئے ہم آسمان کو دیکھتے رہتے کہ شاید بادل آئیں' بارش ہو اور ہم حلق تر کر سکیں۔ بعض اوقات مجھے محسوس ہوتا کہ زبان پر کانٹے پڑے ہوئے ہیں۔ جب میں تکلیف کی شدت میں منہ کھولتا' تو تالو چٹخنے لگتا۔ چھٹے روز افق پر سیاہ بادلوں کے چند آوارہ ٹکڑے دکھائی دیے جن کی تعداد آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔ ہم نہایت بے صبری اور اشتیاق سے ان کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگے' لیکن افسوس کہ پانی کا ایک قطرہ برسائے بغیر یہ بادل ہمارے سروں پر سے گزر گئے۔ سارا دن سورج آسمان پر پوری آب و تاب سے چمکتا اور ہمارے بدن دھوپ میں جھلس جاتے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہمارے جسموں پر چیونٹیاں سی رینگتی ہیں اور کبھی سوئیاں سی چبھتی محسوس ہوتیں۔ سہ پہر کے بعد یہ عذاب دور ہوتا' تو ایک نئی مصیبت سامنے آتی۔ بحری یخ بستہ ہوائیں تیزی سے چلنے لگتیں اور ہم تھر تھر کانپنے لگتے۔ حرارت کے لیے ایک دوسرے سے لپٹ کر لائف بوٹ کے ایک گوشے میں پڑے رہتے اور ساری رات اسی طرح گزر جاتی۔ اس دوران میں سمندر کا پانی تیز بوچھاڑ کی صورت میں مسلسل ہم پر برستا رہتا۔

آٹھویں روز لائف بوٹ ایک بار پھر شارک مچھلیوں کے نرغے میں گھر چکی تھی۔ یہ مچھلیاں اگرچہ زیادہ بڑی نہیں تھیں' لیکن ان کے دانت نہایت نوکیلے اور بڑے تھے اور شکل ایسی ڈراؤنی تھی کہ دیکھ کر خون خشک ہوتا تھا۔ ہم ان کے ڈر سے فوراً بوٹ کے اندر لیٹ گئے' کیوں کہ اگر وہ ہمیں دیکھ لیتیں' تو دور تک تعاقب کرتیں۔

سورج جب عین سر پر آیا' تو گرمی سے ہمارے جسم پھر جھلسنے لگے۔ دھوپ کی یہ تپش ہمارے لیے اب ناقابل برداشت ہوتی جارہی تھی۔ ٹونی پاسٹولا کی حالت تو بہت ہی ابتر تھی۔ وہ بار بار بڑبڑاتا: ''میں مر جاؤں گا...... میں مر جاؤں گا۔'' ...... ایک مرتبہ اس نے یہ بھی کہا: ''میں سمندر میں کود جاؤں گا......'' میں نے اُسے تسلی دی اور کہا: ''گھبراؤ نہیں...... قدرت ہمارا امتحان لے رہی ہے۔ ہمیں اس آزمائش میں پورا اترنا چاہیے...... لاؤ اپنی جیکٹ میرے حوالے کرو......'' ٹونی نے جیکٹ میرے حوالے کی۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کی جیکٹ سمندری پانی میں ڈبوئی اور اس کے بدن پر رکھ دی۔ اس طرح تپتے ہوئے بدن نے کچھ ٹھنڈک پائی...... پھر تو جینی آلرچ اور میں نے بھی یہی کیا۔ پانی میں جیکٹ ڈبو ڈبو کر جسم تر کرتے رہے' لیکن پیاس بجھانے کا اب کوئی ذریعہ نہ تھا۔ ہماری دھنسی ہوئی بے نور آنکھیں بادلوں کا کوئی ٹکڑا دیکھنے کے لیے بار بار آسمان کی طرف اٹھتیں' لیکن ناکام لوٹتیں۔ ہلکی سی بارش بھی ہو جائے' تو ہمارے مُردہ جسموں میں جان پڑ سکتی تھی۔ کاش...... حقیقت یہ ہے کہ پیاس کے ہاتھوں خدا دشمن کو بھی موت نہ دے...... یہ جان کنی اور عذاب کی آخری شکل ہے۔

یکایک آلرچ کہنے لگا:

''آؤ' ہم سب خدا کے آگے گڑگڑا کر دعا کریں کہ بارش ہو جائے۔''

سچ ہے مصیبت میں انسان کو خدا ہی یاد آتا ہے۔ اگرچہ مجھے گزشتہ آٹھ روز سے خدا یاد آ رہا تھا اور میں خود چاہتا تھا کہ اس سے مدد مانگی جائے' لیکن نہ جانے کیوں یہ تجویز پیش کرتے ہوئے مجھے شرم سی آتی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے اپنے ساتھیوں اور دوستوں میں ''خدا پرست'' نہیں سمجھا جاتا تھا۔ مجھے مذہب سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور میں ان لوگوں کا ہمیشہ تمسخر اڑاتا تھا جن کے دلوں میں مذہب کا احترام تھا' لیکن اب ...... موت ہمارے تعاقب میں تھی' میں بے تامّل خدا کے آگے سر جھکانے کو تیار ہو گیا۔

مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ میری طرح خود جینی آلرچ بھی مذہب سے شغف نہ رکھنے

کے باوجود یہ تجویز پیش کر رہا تھا' البتہ ٹونی پاسٹولا رومن کیتھولک عقیدہ رکھتا تھا اور مذہب کے معاملے میں نہایت انتہا پسند آدمی تھا۔ پس اس ہولناک ماحول میں' جب کہ سورج ہمیں جھلس رہا تھا' شارک مچھلیاں ہڑپ کر لینے کے لیے مسلسل بوٹ کے گرد چکر لگا رہی تھیں' سمندر کی بپھری ہوئی موجیں ہمیں کسی نامعلوم منزل کی طرف لیے جاتی تھیں' فاقہ زدہ اور پیاس کے باعث جاں بلب تین آدمی خدا کے آگے دعا کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ہم دیر تک سر جھکائے نہایت عاجزی سے آہستہ آہستہ دعا مانگتے رہے۔ ہماری آوازیں جذبات کی شدت سے بھرّا رہی تھیں اور خشک آنکھوں سے نہ جانے کس طرح آنسوؤں کے قطرے نکل کر ہمارے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔ اس روز خدا کی عظمت و ہیبت کا صحیح احساس میرے دل میں پیدا ہوا۔ آپ شاید یقین نہ کریں' لیکن اسی خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ ابھی ہم دعا مانگ کر فارغ ہی ہوئے تھے کہ مغرب کی جانب سے سیاہ گھٹا جھومتی ہوئی نمودار ہوئی جس نے چشم زدن میں آسمان کو ڈھانپ لیا اور پھر گرج چمک کے ساتھ باران رحمت کا نزول شروع ہو گیا۔ بارش کا ہر قطرہ ہمارے تن مردہ میں زندگی کی نئی لہر دوڑانے لگا اور ایک بار پھر ہمیں احساس ہوا کہ خدا ہمارے ساتھ ہے۔ نہ صرف ہماری پیاس بجھ گئی' بلکہ بارش کا پانی ''آبِ حیات'' بن گیا۔ اس نے ہمیں جسمانی قوت بھی پہنچائی اور بھوک کی شدت قدرے کم ہو گئی۔

تین روز اور گزر گئے۔ چوتھے روز ہم نے انتہائی نقاہت محسوس کی۔ ٹونی پاسٹولا کی حالت اب اس قدر ابتر ہو چکی تھی کہ وہ چند گھنٹوں کا مہمان نظر آتا تھا۔ اس کا خوب صورت جسم' جس پر اسے کبھی ناز تھا' سوکھ کر کانٹا ہو چکا تھا۔ جسم کی ایک ایک ہڈی پسلی بخوبی گنی جاسکتی تھی۔ آنکھیں زرد اور رخساروں کی ہڈیاں اُبھر آئی تھیں۔ پورے گیارہ روز کی بے ترتیب ڈاڑھی نے تو حُلیہ اور بگاڑ دیا تھا۔ اس میں اب ہلنے جلنے کی سکت نہ تھی' نہ وہ بول سکتا تھا۔ بس ہر وقت ایک غشی کی سی حالت اس پر طاری رہتی۔

چناں چہ ایک بار پھر ہم نے خداوند کے حضور میں نہایت عاجزی سے مدد کے لیے دعا کی...... مجھے یقین تھا کہ خدا کی رحمت دوبارہ جوش میں آئے گی۔ اب ہمیں پینے کے لیے پانی اور کھانے کے لیے کسی غذا کی ضرورت تھی جس کا اہتمام کرنا انسانی طاقت سے باہر تھا اور ہمیں صرف قدرت کے دست غیب ہی سے ان چیزوں کے ملنے کی توقع تھی۔ دوسرے روز بالکل اتفاقیہ طور پر ہم نے ایک مچھلی پکڑی۔ اب ہم شارک مچھلیوں کے نرغے سے آزاد ہو کر سمندر کے اس حصے میں آ گئے تھے جہاں بے ضرر مچھلیاں آباد تھیں۔ وہ نارنجی رنگ کی لائف بوٹ کو عجیب چیز سمجھ کر اسے دیکھنے کے لیے ہزارہا کی تعداد میں پانی کی سطح پر تیر رہی تھیں۔ کبھی کبھی وہ بوٹ کے عین کنارے پر آ جاتیں' ہمیں چمکتی آنکھوں سے دیکھتیں اور پھر ڈر کر دور ہٹ جاتیں...... یکایک جینی آلرچ نے وہی چھوٹا سا جیبی چاقو اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑ لیا اور آہستہ سے ہاتھ پانی میں ڈال کر ایک مچھلی پر وار کیا۔ چاقو کی نوک مچھلی کے کھلے منہ میں پیوست ہو گئی۔ آلرچ نے جلدی سے ہاتھ کھینچ لیا اور تڑپتی ہوئی مچھلی کو گھبراہٹ میں ٹونی پاسٹولا کے اوپر پھینک دیا جو آنکھیں بند کیے بے حس و حرکت پڑا تھا۔ ٹونی نے فوراً آنکھیں کھول دیں اور حیرت انگیز پھرتی کے ساتھ مچھلی کو اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا اور اس وقت تک پکڑے رکھا جب تک مچھلی کی جان نہ نکل گئی...... ہم دونوں حیرت سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے اور ہمیں تعجب تھا کہ ٹونی کے سوکھے جسم میں اتنی قوت یکدم کہاں سے آ گئی...... یہ معما کبھی حل نہ ہوا۔

مچھلی خاصی بڑی اور وزنی تھی' لیکن ہم اسے یوں دیکھ رہے تھے جیسے مچھلی دیکھنے کا پہلے کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ آلرچ نے اسی چاقو سے بمشکل مچھلی کے ٹکڑے کیے۔ کچی مچھلی ہم میں سے پہلے کبھی کسی نے نہیں کھائی تھی اور ہمارے لیے یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ اس وقت ندیدوں کی طرح ہم نے اپنے دانتوں سے یہ کچا'

بدبودار اور سخت گوشت یوں مزے لے لے کر کھایا جیسے پشت ہا پشت سے ہم اسی طرح کھاتے چلے آئے ہیں۔ بچا کھچا گوشت سنبھال کر ایک طرف رکھ دیا گیا۔ اس روز دوپہر کو ایک بار پھر بادل اُمڈ کر آئے اور ہلکی سی بارش ہوئی جس نے ہماری پیاس بھی بجھا دی...... ہم نے بار بار خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے ہماری التجا سن لی تھی۔

اتفاق کی بات اسی روز' جو مجھے ساری عمر یاد رہے گا' ایک بہت پرانا گیت میرے حافظے کی لوح پر اچانک یوں ابھر آیا جیسے اندھیرے میں روشنی کی کرن...... میری عمر ان دنوں سات آٹھ سال سے زیادہ نہیں ہوگی۔ میں سکول میں پڑھتا تھا۔ ہماری کتاب میں ایک مختصر سی بڑی پیاری نظم تھی جو ہم سب بچے مل کر گایا کرتے تھے۔ اس میں ایک خوبصورت بحری پرندے البٹروز کا ذکر تھا جس کے پر سیاہ اور سفید تھے اور جو مچھلیاں پکڑ پکڑ کر کھایا کرتا تھا۔ ان دنوں میں اس پرندے کے بارے میں سوچا کرتا تھا کہ کاش میں اسے دیکھ سکوں...... مگر میری خواہش پورے تیس سال بعد پوری ہوئی اور یہ وہی دن تھا جب آلرچ نے مچھلی کا شکار کیا تھا۔ اس غیبی مدد پر ہم بہت مسرور تھے۔ مچھلی کا کچا گوشت کھا کر اور بارش کے پانی سے سیراب ہو کر ہم تینوں کشتی میں لیٹے تھے' سورج سمندر کے سینے میں اترنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ میں دل ہی دل میں اندازہ لگا رہا تھا کہ ہم اب تک دو سو میل سے زیادہ سفر طے کر چکے ہیں کہ دفعتہً میرے کان کے قریب ایک دھماکہ سا ہوا اور پھر جینی آلرچ چلّایا...... "پکڑو پکڑو۔" میں بوکھلا کر اٹھا' اتنے میں جینی نے پانی میں بے تابانہ ہاتھ ڈال کر ایک پھڑپھڑاتا ہوا زخمی پرندہ باہر نکال کر بوٹ کے اندر پھینک دیا۔ اس پرندے کا جسم سرمئی رنگ کا اور پر سیاہ و سفید تھے۔ میرے دیکھتے دیکھتے اس کے ننھے ننھے پنجے تھرتھرائے اور اس نے دم توڑ دیا...... معلوم ہوا کہ یہ بحری پرندہ اڑتا ہوا آیا اور بوٹ کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ جینی نے فوراً پستول سے اس پر فائر کر دیا۔ اتفاق کی بات کہ نشانہ خطا نہ گیا اور البٹروز زخمی ہو کر پانی میں گر پڑا۔

ہم نے جلد جلد پرندے کی کھال اُتاری' گوشت کے ٹکڑے کیے' اس کا دل اور پھیپھڑا ہڑپ کیا اور بقیہ گوشت چند چیتھڑوں میں لپیٹ کر بچی ہوئی مچھلی کے ساتھ رکھ دیا ہمیں اطمینان تھا کہ یہ خوراک چند روز تک بخوبی سہارا دے سکے گی' لیکن اسی رات ایک عجیب چیز ہم نے دیکھی۔ میرے دونوں ساتھی آرام کی نیند سو رہے تھے اور میں ''پہرے'' کے لیے جاگ رہا تھا۔ رات آہستہ آہستہ بھیگ رہی تھی' سمندر کی لہریں بھی نیند کی آغوش میں پہنچ چکی تھیں' لائف بوٹ کسی رکاوٹ کے بغیر تیزی سے تیر رہی تھی۔

میں سوچ رہا تھا کہ البٹروز پرندے کا آنا اس بات کی علامت تو نہیں کہ کوئی جزیرہ اب نزدیک ہی ہے۔ یکا یک میں نے محسوس کیا کہ بوٹ کے اندر ہلکے نیلے رنگ کی روشنی پھیل رہی ہے۔ پہلے میں نے اسے اپنا واہمہ سمجھا' لیکن جب یہ روشنی اور تیز ہوگئی' تو مجھے ڈر لگنے لگا۔ میں نے فوراً اپنے ساتھیوں کو بیدار کیا۔ وہ بھی روشنی دیکھ کر دہشت زدہ ہوگئے۔ خوب غور سے دیکھنے پر پتہ چلا کہ روشنی کا منبع دراصل وہ چیتھڑے ہیں جن میں پرندے اور مچھلی کا گوشت لپیٹ کر رکھا ہے۔ میں نے نہایت احتیاط سے یہ چیتھڑے الگ کیے' تو روشنی اور تیز ہوگئی۔ کیا دیکھتے ہیں کہ البٹروز پرندے کا جسم بجلی کے ایک قمقمے کی مانند روشن ہے۔ خاص طور پر دُم میں سے تو نور کی شعاعیں پھوٹتی نظر آتی تھیں۔ دیر تک ہم یہ حیرت انگیز تماشا دیکھتے رہے۔ آخر یہی وجہ سمجھ میں آئی کہ البٹروز پرندے نے ضرور ایسی شئے کھائی ہے جس میں فاسفورس کی بڑی مقدار تھی۔ بہرحال یہ گوشت کھانے کے قابل نہیں رہا۔ پس ہم نے سارا گوشت مچھلی سمیت سمندر میں پھینک دیا۔

دوسرے روز جب سورج طلوع ہوا' تو ہم نے دیکھا کہ فضا میں بے شمار پرندے اُڑ رہے ہیں۔ پرندے دیکھ کر ٹونی کی جان میں جان آئی۔ ''ضرور کوئی جزیرہ قریب ہے۔'' اس نے کہا اور آنکھیں بند کر لیں۔ دوپہر تک یہ پرندے فضا میں اڑتے رہے۔ وہ پانی میں اترنے کی کوشش یوں نہیں کرتے تھے کہ شارک مچھلیاں بھی تیر رہی تھیں۔ ان

مچھلیوں کی لمبائی چار فٹ اور رنگ زردی مائل بھورا تھا۔ نارنجی رنگ کی بوٹ کو ایک نئی چیز سمجھتے ہوئے وہ بڑی تعداد میں جمع ہو رہی تھیں' لیکن قریب آ کر جب ہمیں دیکھتیں' تو ڈر کر دور ہو جاتیں' مگر جلد ہی انہوں نے بھانپ لیا کہ ہم تینوں انہیں نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ اب وہ بار بار اچھل کر بوٹ میں آنے کی کوشش کرنے لگیں۔ یہ دیکھ کر ہمارے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ خدا کی پناہ...... ہزار مچھلیاں تھیں۔ آج بھی ان کے کھلے جبڑے اور لمبے لمبے دانت یاد آتے ہیں' تو خوف سے کانپ جاتا ہوں۔ اس روز خدا نے ان آدم خور مچھلیوں سے ہمیں بال بال بچایا۔ مچھلیوں کی اُچھل پھاند سے سمندر میں تلاطم کی سی کیفیت پیدا ہو چکی تھی اور لائف بوٹ بُری طرح ہچکولے کھا رہی تھی۔ ہم نے بمشکل اس کا توازن قائم رکھا' لیکن مچھلیوں سے پیچھا چھڑانے کی کوئی تدبیر ذہن میں نہ آتی تھی۔

جینی آلرچ کہنے لگا: ''چیف' اس وقت زندگی اور موت کا معاملہ ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ان کی تعداد لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی ہے۔ اگر وہ اسی طرح اچھل پھاند کر قوی لہریں پیدا کرتی رہیں' تو بوٹ لازماً الٹ جائے گی۔ اب بچنے کی ایک ہی تدبیر ہے۔''

''وہ کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''میں اپنے چاقو سے ایک مچھلی کو ہلاک کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اگرچہ اس میں جان کا خطرہ ہے' مگر مرنا بہرحال ہے۔ پھر کیوں نہ دل کا ارمان نکال لیا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ہم ایک مچھلی کو مارنے میں کامیاب ہوگئے' تو یہ سب ڈر کر بھاگ جائیں گی۔''

میں دم بخود اس شخص کی طرف تکتا رہا۔ ''نہیں......نہیں......'' ٹونی نے مری ہوئی آواز میں کہا' ''لاؤ چاقو مجھے دو...... میں تم دونوں سے پہلے مروں گا۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھا'

مگر ہم نے اسے پھر بوٹ میں لٹا دیا۔ ابھی ہم اسی فکر میں گم تھے کہ کیا کیا جائے کہ دفعتہً ایک شارک مچھلی نے اُچھل کر جینی کا وہ ہاتھ منہ میں دبانے کی کوشش کی جس میں چاقو تھا۔ جینی نے پھرتی سے چاقو اس کے گلپھڑوں میں بھونک دیا اور پوری قوت سے مچھلی کو اٹھا کر بوٹ میں پھینک دیا۔ یہ کارنامہ اس سرعت سے سامنے آیا کہ عقل دنگ رہ گئی۔ بعدازاں خود جینی کہتا تھا کہ یہ چاقو اس نے نہیں بھونکا' بلکہ کسی نادیدہ قوت نے اسے ایسا کرنے پر مجبور کیا تھا اور یقین کیجیے کہ چار فٹ لمبی مچھلی کا وزن ہمارے اندازے کے مطابق پندرہ سیر سے کسی طرح کم نہ تھا اور جینی اس کمزور حالت میں اکیلا اسے اٹھانے کے قابل نہ تھا۔ ہمارے سر ایک بار پھر خدا کے سامنے عاجزی سے جھک گئے۔

شارک مچھلی کشتی میں بڑی تڑپ رہی تھی' لیکن اب کسی میں ہمت نہ تھی کہ اس کے قریب جاتا۔ چاقو کا پھل اس کے حلق تک اُتر گیا تھا اور رقیق خون کی بڑی مقدار مسلسل بہہ رہی تھی...... چند منٹ بعد وہ تڑپ تڑپ کر مر گئی۔ اس کا جبڑا بھیانک انداز میں کھلا ہوا تھا جس میں اوپر نیچے نوکیلے اور اُسترے کی مانند تیز دانتوں کی قطاریں دکھائی دیتی تھیں۔ ہم تینوں نے بڑی مشقت کے بعد اس کا چکنا جسم ہاتھوں پر اٹھایا اور بوٹ میں کھڑے ہو گئے اور وہی دل چسپ تماشا دیکھا جس کی توقع تھی۔ شارک مچھلیوں کی کثیر تعداد اپنی ہم جنس کو مرے ہوئے دیکھ کر فوراً پرے ہٹ گئی۔ آدھ گھنٹے کے بعد بوٹ کے قریب کوئی مچھلی موجود نہ تھی۔

اب ہم اطمینان سے مچھلی کی تکا بوٹی کرنے لگے۔ سب سے پہلے اس کا کلیجہ نکالا گیا۔ اس کے تین حصے کیے اور ہڑپ کر گئے۔ پھر معدے کو چیرا' تو اس میں سے چھ انچ کی دو سارڈینز مچھلیاں برآمد ہوئیں جو شارک نے تھوڑی دیر پہلے ہی نگلی ہوں گی۔ ان میں سے ایک مچھلی تو جینی آلرچ کو انعام کے طور پر پیش کی گئی اور دوسری میرے اور ٹونی کے حصے میں آئی۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ اس روز ان ننھی ننھی مچھلیوں کے گوشت

نے ہمیں کیا مزا دیا' حالانکہ وہ کچا تھا' صاف بھی نہیں کیا گیا تھا' اس میں بساند بھی اٹھ رہی تھی' لیکن سچ تو یہ ہے کہ ایسا لذیذ گوشت پھر عمر بھر نصیب نہیں ہوا۔ اس کی لذت آج تک زبان پر محسوس کرتا ہوں۔

شارک کے جسم میں رقیق خون کی بڑی مقدار تھی۔ میں نے سوچا اسے پیاس بجھانے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ممکن ہے عام حالات میں اگر کوئی ہم سے مچھلی کا یہ خون پینے کے لیے کہتا' تو ہم خود کہنے والے کا خون پی جاتے۔ لیکن اس مصیبت میں یہ انتہائی بدبودار خون بھی ہمارے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ تھا۔ چلو بھر بھر کر ہم تینوں نے یہ خون پیا۔ اس کے بعد جی بھر کر شارک کا یہ گوشت کھایا' لیکن اب بھی کافی گوشت بچ گیا۔ ہم نے اسے ایک جانب رکھ دیا اور بوٹ میں آرام سے لیٹ گئے۔ جب پیٹ بھرا ہوا ہو' تو خود بخود نیند آ جاتی ہے' چناں چہ تھوڑی دیر بعد ہم اس طرح آنکھیں بند کیے پڑے تھے جیسے اپنے اپنے گھروں میں آرام دہ بستر پر سو رہے ہوں۔ اس روز دھوپ نے ہم پر کچھ اثر کیا نہ سمندر کے پانی کی بوچھاڑ سے ہم پریشان ہوئے۔ رات بھی آرام سے کٹی۔ ہوا کئی روز سے ہماری منشاء کے مطابق چل رہی تھی اور سمندر میں طوفان کے آثار بھی نہ تھے۔ دوسرے روز صبح جب ہم نے گوشت کو چکھا' تو وہ پہلے سے بھی زیادہ لذیذ اور خستہ ہو چکا تھا۔ دراصل سمندری پانی میں ملے ہوئے نمک اور سورج کی گرمی نے اسے پکا دیا تھا۔ اس گوشت سے یہ فائدہ پہنچا کہ ہماری گم شدہ جسمانی قوت بحال ہو گئی اور حقیقت یہ ہے کہ بحرالکاہل میں کامل چونتیس روز بھٹکنے کے دوران میں اگر شارک مچھلی کا یہ گوشت ہمیں نہ ملتا' تو ہم کبھی زندوں کی دنیا میں واپس نہ آ سکتے تھے۔

اس سے اگلے روز رات کو ایک دردناک حادثہ اچانک پیش آیا۔ جینی آلرچ "پہرے" پر تھا۔ میں اور ٹونی پاستولا اونگھ رہے تھے کہ دفعتہً ایک بھیانک چیخ کے ساتھ جینی آلرچ سمندر میں گر پڑا۔ عین اُسی لمحے اگر میں جھپٹ کر اس کی ٹانگ نہ پکڑ لیتا' تو وہ مہیب شارک مچھلی اسے گھسیٹ کر لے ہی گئی تھی۔ میں نے اور ٹونی نے بے ہوش آلرچ کو بمشکل پانی سے نکالا اور بوٹ میں لٹا دیا۔ اس کا دایاں ہاتھ خون سے تر تھا اور جب ہم نے غور سے معائنہ کیا' تو یہ دیکھ کر پسینے چھوٹ گئے کہ اس کی چار انگلیاں نصف ہتھیلی سمیت غائب تھیں۔ خون مسلسل بہہ رہا تھا۔ میرے پاس اتفاق سے رومال موجود تھا۔ میں نے کس کر اس کی کلائی پر باندھ دیا۔ خدا خدا کر کے خون بند ہوا۔ آلرچ کا چہرہ زرد اور نبض کی رفتار سست تھی۔ اسے ہوش میں لانے کی جو تدبیریں اس وقت کی جاسکتی تھیں' کی گئیں' مگر سب بے سود...... مجھے خوف تھا کہ وہ اسی حالت میں مر جائے گا......رات کا بقیہ حصہ ہم نے خدا کے حضور میں رو رو کر آلرچ کے بچ جانے کی دعا مانگتے ہوئے گزار دیا۔ اس کی کٹی ہوئی ہتھیلی پر جب بھی نظر پڑتی' دہشت سے بدن کا رواں رواں کھڑا ہو جاتا۔

صبح ہوئی' لیکن آلرچ کی وہی حالت تھی۔ دوپہر کو آسمان پر سیاہ بادلوں کا ایک آوارہ قافلہ دکھائی دیا جس میں بجلی کوند رہی تھی۔ کامل تین گھنٹے بعد ان بادلوں نے ہمارے سر پر سایہ کیا اور بارش ہوئی۔ بارش کا پانی آلرچ کے جسم پر پڑا' تو اس نے آنکھیں کھول دیں' لیکن دہشت اور نقاہت کے باعث وہ بول بھی نہیں سکتا تھا۔ رات تک اس کی حالت بہتر ہوگئی۔

شارک مچھلی کا گوشت چھ روز تک ہم استعمال کرتے رہے۔ اس دوران میں کوشش کے باوجود کوئی اور مچھلی نہ پکڑی جاسکی۔ سورج سارا سارا دن آگ برساتا

اور رات کو یخ بستہ ہوائیں شدت سے چلتیں۔ آلرچ اور ٹونی کی حالت پھر بگڑنے لگی۔ سمندر کا نمکین پانی اب اپنا اثر دکھانے لگا۔ ہمارے جسموں پر چمٹے ہوئے نمک کے ذرّات دھوپ میں چمکتے اور جب ہم ان ذرات کو صاف کرنا چاہتے' تو درد کی ناقابل برداشت ٹیسیں اٹھنے لگتیں۔

ہمیں سمندر میں بھٹکتے ہوئے اٹھائیس روز گزر چکے تھے۔ اب ہم میں سے کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ لائف بوٹ کو غلط سمت میں جانے سے روکتا۔ دوپہر کا وقت تھا کہ بوٹ سے کچھ فاصلے پر پانی میں سیاہ رنگ کے دو بڑے بڑے ناریل بہتے دکھائی دیے۔ پہلی نظر میں وہ سمندری سیل کے سر معلوم ہوتے تھے۔ چند منٹ بعد بہتے بہتے وہ بوٹ کے قریب آ گئے اور ہم نے ہاتھ بڑھا کر انہیں اٹھا لیا۔ اس وقت فرطِ مسرت سے ہماری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ یہ ناریل اس بات کی نشانی تھے کہ کوئی جزیرہ بالکل قریب ہے۔ ناریل کے گودے اور پانی نے ہمیں خاصی قوت بہم پہنچائی اور اس کے سہارے ہم نے چار روز اور گزار دیے۔ تینتیسویں روز دفعتہً سمندر میں ایک زبردست طوفان کے آثار نمودار ہوئے۔ بڑی بڑی موجیں اٹھنے لگیں' ہوا تیز ہوگئی اور آسمان بادلوں میں چھپ گیا۔ اس روز جس موسلا دھار بارش اور سمندری طوفان سے ہمیں سابقہ پڑا' وہ ساری عمر یاد رہے گا۔ ہم خدا سے اپنے اپنے گناہوں کی معافی کے خواستگار ہوئے۔ اپنے عزیزوں اور رشتے داروں کی سلامتی کے لیے دعا کی اور بوٹ میں لیٹ گئے۔ خیال تھا کہ اس طوفان سے ہم نہ بچ سکیں گے۔ اس کے بعد ہمیں کچھ ہوش نہ رہا۔

آنکھ کھلی تو اپنے آپ کو ایک جزیرے کے ساحل پر پڑا ہوا پایا' ہم بالکل برہنہ تھے......سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا اور ہمارے کمزور بدن اس کی حدت

سے جھلسے جا رہے تھے۔ ہم نے اٹھنا چاہا' مگر ہاتھ پیروں میں جان ہی نہ تھی۔ سہ پہر تک اسی طرح پڑے رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ جزیرہ ویران اور بے آباد ہے ورنہ کسی نہ کسی آدمی کی شکل تو دکھائی دیتی۔ سورج غروب ہوتے ہوتے ہم ایک دوسرے کو سہارا دیتے ہوئے جزیرے کی طرف روانہ ہوئے۔ ذرا خیال کیجیے کہ 34 دن کی ڈاڑھیاں بڑھی ہوئیں' آنکھیں زرد اور بے نور' جسم ہڈیوں کے ڈھانچے اور بالکل برہنہ...... اس وقت اگر کوئی ہماری حالت دیکھتا' تو یقیناً بھوت پریت سمجھ کر ڈر جاتا۔ ہمیں پتہ چل گیا کہ جزیرہ ویران نہیں ہے' اس پر آدمی موجود ہیں' لیکن کیا وہ جاپانی ہیں یا اتحادیوں کے دوست؟ اب ہمیں یہ سوچنے کی ضرورت نہ تھی۔ ہم بے دھڑک آگے بڑھتے گئے۔ ہم اس زندگی سے اب عاجز آ چکے تھے اور یہ بلاشبہ اچھا ہی ہوتا اگر جاپانیوں کی رائفلوں کا نشانہ بن جاتے۔

دور سے ہمیں چند مقامی باشندوں نے دیکھا اور وحشت سے چیختے چلاتے بھاگ کھڑے ہوئے۔ میں نے انہیں آواز دے کر روکنا چاہا' مگر صرف ہانپ کر رہ گیا۔ تھوڑا سا فاصلہ طے کر کے ہی ہم بے دم ہو کر ایک جگہ لیٹ گئے۔ تھوڑی دیر بعد ہم نے بہت سے آدمیوں کے قدموں کی چاپ سنی۔ شاید وہ ہمیں ڈھونڈ رہے تھے۔ ہم دھڑکتے دل سے یہ آوازیں سنتے رہے۔ پھر کسی نے شستہ انگریزی لہجے میں پکار کر کہا:

''تم کون ہو؟''

ہم خاموش رہے۔ جواب کیا دیتے' بولنے کی طاقت ہی کہاں تھی۔ پھر ایسا معلوم ہوا کہ وہ لوگ ہمارے اردگرد کھڑے ہیں۔ وہ حیرت سے نہ معلوم کیا کہہ رہے تھے۔ اس کے بعد چند آدمیوں نے آگے بڑھ کر چادریں ہمارے برہنہ جسموں پر ڈال دیں اور کندھوں پر لاد کر آبادی کی طرف لے چلے...... شام تک ہمیں اچھی طرح ہوش آ چکا

تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ جزیرہ اتحادیوں کے قبضے میں ہے۔ ہم نے ایک بار پھر شکرانے کے لیے اپنی پیشانیاں خدائے لایزال کے سامنے جھکا دیں۔

میرے دونوں عزیز ترین دوست اور ساتھی ٹونی پاسٹولا اور جینی آلرچ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ صرف میں زندگی کی ٹھوکریں کھانے کے لیے باقی رہ گیا ہوں۔ بحرالکاہل کے اس بھیانک سفر کو اگرچہ بائیس برس گزر چکے ہیں' مگر بعض اوقات سوچتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک ڈراؤنا خواب تھا جو ہم تین آدمیوں نے بیک وقت دیکھا' ورنہ یہ بات یقین کرنے کے قابل نہیں ہے کہ ربڑ کی ایک معمولی لائف بوٹ میں تین آدمی بغیر خوراک اور پانی کے ایک ہزار میل کا سفر طے کریں اور پھر زندہ بچ جائیں۔

* * *

فرار ہونے کے بعد

دوسری جنگ عظیم میں دو برطانوی فوجی افسروں کیپٹن ایرک پٹرولیم اور کیپٹن جان کلنٹن کو جرمن نازی جاسوسوں نے گرفتار کر لیا تھا اور دوسرے جنگی قیدیوں کے ساتھ ان دونوں کو بھی ''ساگان'' (برلن) کے قیدی کیمپ میں رکھا گیا جہاں دو سال تک نہایت پرصعوبت اور با مشقت زندگی گزارنے کے بعد وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔کیمپ کے اندر وہ ساڑھے چار ماہ تک زمین میں سرنگ کھودتے رہے اور جب سرنگ کیمپ سے باہر جا نکلی تو ایک روز انہوں نے بھاگنے کا فیصلہ کر لیا۔کیمپ سے فرار ہونے کے بعد ان دونوں انگریز افسروں پر کیا بیتی؟ ان پر کیا کیا مصیبتیں نازل ہوئیں؟ کتنی مرتبہ وہ موت کے منہ سے بال بال بچے؟ اور پھر کس قدر جرأت و ہمت سے کام لیتے ہوئے آخرکار وہ اپنے وطن پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ان صفحات میں آپ یہی دلچسپ' حقیقی اور ڈرامائی داستان پڑھیں گے۔

پیٹر نے دھڑکتے دل کے ساتھ خدا کا نام لے کر سرنگ میں چھلانگ لگا دی۔اس کا سر ایک دم ریت کے ڈھیر سے ٹکرایا جو سرنگ کھودتے وقت انہوں نے ایک طرف ہٹا دی تھی۔اپنے ہاتھوں پاؤں کے بل رینگتا ہوا بالکل مگرمچھ کی طرح وہ آہستہ آہستہ اس قبر نما تاریک سرنگ میں آگے بڑھا جو اس نے جان سے مل کر ساڑھے چار ماہ کی انتہائی

جانفشانی اور موت سے بے پروا ہو کر کھودی تھی۔آخرکار وہ وقت بھی آیا' جب ان کی محنت کارگر ہوئی اور وہ رات کی تاریکی میں اس جہنم نما کیمپ سے بھاگ نکلنے کے لیے تیار ہو گئے۔

پیٹر کے پاس برقی ٹارچ موجود تھی جو اس نے بڑی کوشش سے کیمپ کے جرمن سپاہی سے حاصل کی تھی۔دو تھیلوں میں اس نے ضرورت کی تمام چیزیں ساتھ لے لی تھیں۔ایک ایک انچ کے حساب سے رینگتا ہوا وہ جب سرنگ میں ذرا دور تک نکل آیا تو اس نے ٹارچ روشن کی اور آہستہ سے اپنے شریک کار جان کو آواز دی جو اس سے پہلے سرنگ میں داخل ہو چکا تھا۔اس نے ایک دو مرتبہ ذرا اونچی آواز سے جان کو پکارا مگر کوئی جواب نہ آیا۔البتہ اوپر سے کسی کے بھاری جوتوں کی آواز سنائی دی۔پیٹر کا دل دہل گیا......اس نے سوچا کہ یہ تو اس سپاہی کے قدموں کی چاپ ہے' جو کیمپ کی آخری سرحد پر خاردار لوہے کی تاروں کے باہر گشت کیا کرتا ہے۔اف خدایا! اب کیا ہو گا؟ اگر سپاہی نے سرنگ سے نکلتے دیکھ لیا تو بغیر کسی تحقیق کے گولی مار دے گا...... اور یہ جان کدھر غائب ہو گیا؟

پیٹر چند گز اور آگے بڑھا......سرنگ صرف دو فٹ چوڑی تھی جس میں سے گزرنا سخت مشکل تھا۔اس نے محسوس کیا کہ گھٹنے اور کہنیاں بری طرح چھل گئی ہیں۔اس نے پھر ہولے سے جان کو پکارا اور اس مرتبہ پیٹر نے جواب میں جان کی آواز سنی۔ٹارچ کی روشنی میں اس نے دیکھا کہ وہ سرنگ میں ریت کے اوپر بیٹھا ہے۔اس کا سارا جسم پسینے سے تر اور چہرہ زرد ہے اور وہ زور زور سے سانس لے رہا ہے۔پیٹر کو دیکھتے ہی اس نے پوچھا:

''تم کہاں رہ گئے تھے' اتنی دیر لگا دی؟''

''ابھی تو ساڑھے چار بجے ہیں۔'' پیٹر نے جواب دیا۔

"میں سمجھ رہا تھا کہ شاید چھ بج چکے ہوں گے...... خدا کی پناہ! اس سرنگ میں کس قدر حبس ہے۔ میری تو جان نکلی جا رہی ہے...... خدا کے واسطے ذرا ایک سوراخ تو کرو تاکہ تازہ ہوا اندر آ سکے۔"

لمبے خنجر کی مدد سے پیٹر نے نرم زمین کھود کر ایک بڑا سوراخ کیا جس میں سے باہر کا منظر بخوبی دیکھ سکتے تھے۔ سیاہ آسمان پر تاروں کی قندیلیں روشن تھیں اور گشت کرنے والے سپاہی کے بھاری جوتوں کی آواز دور سے آ رہی تھی۔

"اب ہمیں کتنی دور اور جانا پڑے گا۔" پیٹر نے سرگوشی کے لہجے میں اپنے ساتھی سے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ بیس پچیس فٹ کا فاصلہ اور ہے۔ پھر ہم کیمپ سے باہر ہوں گے۔ آؤ اب ہم آگے بڑھیں۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے پاس پڑی ہوئی کدال اٹھائی اور سرنگ کھودنے لگا۔ زمین نرم اور ریتلی تھی۔ اس لیے سرنگ آسانی سے کھد رہی تھی۔ پیٹر کھدی ہوئی مٹی اور ریت کو پیچھے ڈھیر کرتا جا رہا تھا۔ ان کو یہ خدشہ تھا کہ اگر صبح ہونے سے پہلے وہ یہاں سے فرار نہ ہو سکے تو اس سرنگ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دفن ہو جائیں گے۔ کیونکہ اب وہ جس راستے پر سرنگ کھود رہے تھے' وہاں سے روزانہ بھاری ٹرک اور جیپ گاڑیاں گزرا کرتی تھیں اور ظاہر ہے کہ سرنگ ان کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتی تھی' وہ یقیناً بیٹھ جاتی۔

ایک گھنٹے تک وہ دونوں نہایت سرگرمی اور جوش سے سرنگ کھودتے رہے۔ حتیٰ کہ ان کا سانس پھول گیا اور پیٹ دھونکنی کی مانند حرکت کرنے لگا۔

"ساڑھے پانچ بج رہے ہیں......" پیٹر نے بھی گھڑی نکال کر وقت دیکھا۔ "ہمارے پاس ابھی آدھ گھنٹہ اور ہے۔ جلدی کرو' اگر کوئی ہماری بیرک میں آ گیا تو بس زندگی کا خاتمہ ہے۔"

چھ بجے تک وہ سرنگ کھود کھود کر آگے بڑھتے رہے اور پھر انہوں نے اوپر ایک بڑا سوراخ کیا اور باہر جھانکا۔ یہ دیکھ کر ان کا دل مسرت سے جھوم اٹھا کہ وہ کیمپ سے باہر نکل آئے تھے۔ انہوں نے کیمپ کے اندر بگل بجنے کی آواز سنی۔ یہ قیدیوں کو بیدار کرنے اور ان سے کام لینے کے وقت کا اعلان تھا۔ اگرچہ چھ بج گئے تھے' لیکن ابھی کیمپ کے اندر کافی اندھیرا تھا۔ البتہ پہریدار سنتریوں کی کوٹھڑیوں میں سرخ رنگ کی بتیاں جل رہی تھیں۔

جان نے سب سے پہلے سامان اور کپڑوں سے بھرے ہوئے تھیلے باہر پھینکے' پھر اس نے اپنا سر نکال کر چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ پہلے اس کا آدھا دھڑ سرنگ سے باہر نکلا اور پھر ٹانگیں...... اس کے بعد پیٹر بھی نکل آیا۔

اب وہ دونوں زمین پر لیٹے خوفزدہ نظروں سے کیمپ کی جانب دیکھ رہے تھے۔ یہ موقع ایسا نازک تھا کہ ذرا سی بے احتیاطی انہیں موت کے منہ میں پہنچا سکتی تھی۔ کیمپ کے چاروں طرف ایسی الماری نما کوٹھڑیوں میں جرمن سپاہی ساری رات پہرہ دیا کرتے تھے۔ ان کی عقابی نظروں سے بچ کر نکلنا ایک معجزہ ہی تھا۔ کئی قیدیوں نے بھاگنے کی کوشش کی مگر پہریداروں کی رائفلوں نے ان بدنصیبوں کی کھوپڑیوں میں کئی کئی سوراخ کر دیے تھے۔ انہیں نازی افسروں کا حکم تھا کہ مقررہ اوقات کے سوا جس شخص کو بھی کیمپ سے باہر دیکھو' اسے بے دریغ گولی سے اڑا دو۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کتنے ہی قیدی ذرا سے شبے پر شوٹ کیے جا چکے تھے۔ اس وقت بھی زمین پر اوندھے منہ لیٹے ہوئے وہ دونوں اس خیال سے لرز رہے تھے کہ ابھی کوئی لمحہ جاتا ہے جب گولیاں سنسناتی ہوئی آئیں گی اور ان کو وہیں ڈھیر کر دیں گی۔

کیمپ کے ساتھ ساتھ سڑک کے دائیں ہاتھ ایک جنگل تھا جس میں صنوبر اور اناس کے درخت کثرت سے تھے۔ وہ سوچنے لگے اگر ہم جنگل میں پہنچ جائیں تو پھر ہمیں کوئی

آسانی سے تلاش نہیں کر سکے گا۔ پس وہ آہستہ آہستہ سڑک کی طرف رینگنے لگے' کیمپ میں قیدیوں کے بیدار ہونے اور جرمن سپاہیوں اور افسروں کے باتیں کرنے کی اونچی اونچی آوازیں ان کے کانوں میں آ رہی تھیں۔ شاید انہیں اب تک پتہ نہیں چلا کہ دو انگریز قیدی فرار ہو چکے ہیں...... پیٹر نے جان سے کہا۔ "اگر ہم اسی طرح مرنے کے خوف سے رینگ رینگ کر آگے بڑھتے رہے تو ضرور پکڑے جائیں گے۔ اٹھو اور خطرے کی پروا کیے بغیر بھاگ چلو۔" یہ وقت تھا جب چند منٹ کے لیے پہریداروں کی ڈیوٹیاں تبدیل ہوتی تھیں۔ رات کے پہریدار ناشتہ کرنے اور نیند پوری کرنے کے لیے اپنے اپنے کوارٹروں میں چلے جاتے تھے اور دن کو ڈیوٹی دینے والے ناشتے سے فارغ ہو کر آتے تھے...... وہ پہرے دار جو رات بھر گشت کر کر کے تھک چکے تھے' نہایت بے چینی سے اپنی چھٹی کا انتظار کر رہے تھے۔ جان اور پیٹر نے جب اچھی طرح اطمینان کر لیا کہ کوئی انہیں نہیں دیکھ رہا تو اٹھے اور اندھا دھند جنگل کی طرف بھاگے اور جب تک وہ جنگل کے درمیان میں نہ پہنچ گئے' ان کا دل برابر دھڑکتا رہا۔ جنگل میں پہنچ کر وہ ایک گڑھے میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ ان کے پھٹے ہوئے کپڑے پسینے اور مٹی سے لت پت منہ اور ہاتھ پیروں پر خراشوں اور خون کے دھبوں کے نشانات اور الجھے بالوں سے کسی کے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل نہ تھا کہ وہ مفرور قیدی ہیں۔ اب سب سے پہلا کام یہ تھا کہ وہ قیدیوں والا لباس اتار کر دوسرے کپڑے پہن لیں تا کہ کوئی انہیں دیکھ بھی لے تو شک نہ کرے۔ اس کے بعد دوسرا مرحلہ اسٹیشن پہنچ کر ٹرین پکڑنے کا تھا...... انہوں نے جلد جلد وہ لباس اتارا' اسے تھیلوں میں رکھا اور دوسرے کپڑے پہنے۔ پھر جنگل کے اندر جا کر پانی کے پائپ سے انہوں نے ہاتھ منہ اور پاؤں صاف کیے۔ اب سوال یہ تھا کہ قید کی وردی کہاں چھپائی جائے؟ اگر وہ اسے یہیں جنگل میں پھینک دیتے ہیں تو ضرور جلد یا بدیر پتہ چل جائے گا کہ یہ کن قیدیوں کی وردی ہے۔ کیونکہ ان پر موٹے موٹے حرفوں میں سینے اور پشت پر نمبر درج ہوتے ہیں۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ کپڑے ساتھ

ہی لے چلیں اور اسٹیشن پر کسی جگہ چھپا دیں گے...... وہ حیران تھے کہ کیمپ کے چوکیدار سپاہیوں کو ابھی تک ان کے فرار کا علم نہیں ہو سکا ورنہ آناً فاناً سارا کیمپ سائرن کی بھیانک آوازوں سے کانپ اٹھتا۔ انہوں نے جنگل میں بھاگنا شروع کر دیا۔ میلوں تک پھیلا ہوا یہ جنگل مشرق میں یوگوسلاویہ کی سرحد تک چلا گیا تھا۔ صنوبر کا جنگل...... خاموش اور اداس...... کہیں کوئی آدمی نہ دکھائی دیتا تھا اور سردیوں کے اس موسم میں جبکہ یخ بستہ طوفانی ہوائیں دن رات چلتی ہیں' اس وسیع جنگل میں کون جاتا؟ وہ شمال کی طرف جا رہے تھے جدھر ایک ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا ریلوے سٹیشن تھا۔ ذرا ادھر انہوں نے قیدیوں کی وردی ایک گڑھے میں پھینک دی اور جلدی سے آگے بڑھ گئے۔ لوہے کا پل عبور کر کے وہ پلیٹ فارم میں پہنچے۔ بہت سے لوگ ریل گاڑی کے انتظار میں ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ انہیں یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ کسی شخص نے ان کی طرف توجہ نہیں دی۔ ایک گوشے میں بیٹھ کر انہوں نے آہستہ آہستہ بات چیت شروع کی۔ پیٹر نے جان سے کہا: "خدا کا شکر ہے ہم اس منحوس کیمپ سے نکل آئے' مگر خطرہ ابھی تک نہیں ٹلا۔ انہیں عنقریب ہمارے فرار ہونے کا علم ہو جائے گا اور پھر تمام ریلوے سٹیشن کو خبردار کر دیا جائے گا اور نازی جاسوس کتوں کی مانند ہمارے تعاقب میں روانہ ہو جائیں گے۔

"ہاں...... عین ممکن ہے۔" جان نے کہا اور دزدیدہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا۔ "اگر یہیں کسی نے پہچان لیا تو غضب ہو جائے گا۔ اس کے بعد تو سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ ہمیں زندہ چھوڑ دیا جائے گا۔ مناسب یہ ہے کہ ہم ذرا الگ الگ رہیں۔ بے شک وہ اتنے بڑے ہجوم میں گولی چلانے کا خطرہ ہرگز مول نہیں لیں گے۔ اگر خدانخواستہ ایسا موقع آ جائے تو تم میری فکر کیے بغیر اپنی جان بچا کر بھاگ نکلنا۔ میں تمہیں اسی جنگل میں واٹر ٹاور کے پاس مل جاؤں گا۔"

"گاڑی کے آنے میں شاید ابھی کچھ دیر ہے۔ تاہم ہمیں ٹکٹ خرید لینے چاہئیں۔"

وہ دونوں ذرا فاصلہ رکھ کر بے پروائی سے ٹہلتے ہوئے سٹیشن کے بکنگ آفس کی طرف گئے۔ جہاں پہلے ہی سے ٹکٹ خریدنے والوں کی ایک لمبی قطار لگی تھی۔ وہ چاہتے تو ٹکٹ خریدے بغیر بھی سفر کر سکتے تھے' لیکن ایسا کرنا گویا اپنے آپ کو موت کے منہ میں ڈال دینا تھا۔ چیکر آتا اور وہ پکڑے جاتے...... مگر اب ٹکٹ خریدنا اس سے بھی زیادہ خطرے کی بات تھی۔ کیونکہ ہر مسافر سے پوچھ گچھ کے بعد پوری تسلی کر کے ٹکٹ فروخت کیے جاتے تھے۔ جان نے پیٹر کو ٹھہرنے کا اشارہ دیا اور خود دھڑکتے دل کے ساتھ قطار میں کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنا چہرہ جھکا رکھا تھا اور بار بار اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتا تھا۔ اسے یہ اطمینان ضرور تھا کہ لوگ اتنی جلدی نہ پہچان سکیں گے۔ چہرے مہرے سے وہ فرانسیسی معلوم ہوتا تھا اور یہی وہ اپنی خوش نصیبی سمجھتا تھا۔ پیٹر دور ایک گوشے میں کھڑا ہوا اپنے دوست کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا اور دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ خدا کرے بکنگ کلرک کسی شک وشبے کے بغیر جان کو ٹکٹ دے دے۔

اتنے میں بکنگ آفس کی کھڑکی ایک زوردار آواز کے ساتھ کھلی اور لوہے کی موٹی جالی کے پیچھے ایک خوبصورت جرمن لڑکی کا چہرہ دکھائی دیا۔ پیٹر اور جان نے اسے دیکھ کر اپنے اپنے دل میں کچھ سکون محسوس کیا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ نوعمر جرمن لڑکی شاید سختی سے پوچھ گچھ نہ کرے۔ باری باری ہر شخص ٹکٹ خریدتا اور پرے ہٹ جاتا۔ لڑکی مسکرا کر کبھی کبھی کسی سے کوئی سوال پوچھ لیتی اور ٹکٹ اس کے حوالے کر دیتی۔ لیکن ایک مرتبہ جب اس نے مسافروں میں سے کسی سے شناختی کارڈ کا مطالبہ کیا تو قطار میں کھڑے ہوئے جان کے پسینے چھوٹ گئے اور خوف سے اس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ مگر اس کی بے چینی کو کسی نے نہ دیکھا' کیونکہ قطار میں کھڑا ہوا ہر شخص اپنی اپنی فکر میں گم تھا۔ کسی کو کیا پڑی تھی کہ خواہ مخواہ دوسرے کی طرف دیکھتا اور اپنا ذہن پراگندہ کرتا؟ جان نے فوراً ہی اپنے حواس پر قابو پا لیا۔ پہلے تو اس نے سوچا کہ قطار میں سے نکل جائے اور شاید وہ

نکل بھی جاتا' مگر دوسرے ہی لمحے اس کے آگے کھڑا ہوا آدمی ٹکٹ خرید چکا تھا اور اب جان کی باری تھی...... ادھر پیٹر کا دل خوف سے کانپنے لگا۔ اس نے بھاگنے کے لیے جو راستہ سوچا تھا' وہ ادھر دیکھنے لگا کہ ذرا گڑبڑ ہو اور وہ ادھر روپوش ہو جائے۔ جان نے جبری مسکراہٹ کے ساتھ ٹکٹ دینے والی لڑکی کی طرف دیکھا جیب سے ریزگاری نکال کر اس کے سامنے رکھ دی اور مسخروں کے سے انداز میں بولا:

''دو ٹکٹ عنایت فرما دیجئے' تا زندگی احسان مند رہوں گا۔ ارے ہاں...... شناختی کارڈ تو دکھانا بھول ہی گیا......''

لڑکی نے بھی مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور جلدی سے دو ٹکٹ اس کے سامنے رکھتے ہوئی بولی۔ ''کارڈ کی ضرورت نہیں۔ آپ لیجئے اور راستہ ناپئے۔'' بعد میں اس نے سوچا یہ فرانسیسی نوجوان بھی کیسے ذلیل ہیں۔ کم بخت ہر ایک سے دل لگی کرتے ہیں...... انہیں یقین نہ تھا کہ ٹکٹ اتنی آسانی سے مل جائیں گے۔ قسمت مہربان نظر آتی تھی۔ یکایک ریل گاڑی کی سیٹی سنائی دی اور وہ دونوں چونک پڑے۔ ریل کی آمد کے ساتھ ہی اسٹیشن پر ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا۔ یہاں اترنے والے مسافر ایک ایک کر کے باہر آنے لگے۔ پیٹر اور جان علیحدہ کھڑے ہر شخص کو غور سے دیکھتے جاتے تھے۔ انہیں خدشہ تھا کہ اب بھی کسی نے پہچان لیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ مسافر یکے بعد دیگرے لوہے کے دروازے سے باہر آتے رہے۔ دفعتہً پیٹر کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ بھاگنا چاہتا تھا لیکن اسے یوں محسوس ہوا جیسے زمین نے اس کے پاؤں سختی سے جکڑ لیے ہیں۔ سامنے دروازے سے جو شخص اس کے سامنے باہر آیا وہ ایک جرمن ڈاکٹر تھا۔ جو کیمپ کے ہسپتال میں کئی مرتبہ اس کا علاج کر چکا تھا اور اسے اچھی طرح جانتا تھا اس نے فوراً اپنا منہ جان کے پیچھے چھپا لیا اور پھر اسے یاد آیا کہ رات کیمپ سے فرار ہوتے وقت ان دونوں نے اپنی داڑھیاں مونڈھ ڈالی تھیں تا کہ کوئی دیکھ بھی لے تو پہلی

نظر میں شناخت نہ کر سکے...... جرمن ڈاکٹر ان کے قریب آیا اور اسی لمحے پیٹر نے اپنا سوٹ کیس اٹھایا اور آگے بڑھ کر اس طرح لڑکھڑایا جیسے ٹھوکر لگی ہو۔ جان نے فوراً اسے سنبھال لیا اور دونوں جلدی جلدی دروازے میں داخل ہو کر ریل کی طرف بڑھ گئے۔

جرمن ڈاکٹر نے اچٹتی سی نگاہ ان پر ضرور ڈالی تھی مگر وہ انہیں پہچان نہ سکا...... چھوٹی سی ریل گاڑی اور ہجوم کا یہ عالم تھا کہ لوگ ایک دوسرے پر گر رہے تھے ہر شخص اس پر یوں سوار ہونے کی کوشش کر رہا تھا جیسے اس کے پیچھے کوئی بندوق لیے کھڑا ہے اور اگر وہ گاڑی میں نہ بیٹھ سکا تو اسے گولی مار دی جائے گی...... پلیٹ فارم کی طویل راہداری میں اب بھی ہلکا ہلکا اندھیرا تھا۔ پیٹر اور جان انجن کے پاس کھڑے پریشان مسافروں کے اس ہجوم کو دیکھ رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کس طرح ریل میں سوار ہوں۔ وہ دونوں چاہتے تھے کہ انہیں ایک ہی ڈبے میں جگہ ملے اتنے میں انہوں نے ایک جرمن سپاہی کو ایک بوڑھی عورت سے باتیں کرتے ہوئے دیکھا۔ وہ ٹہلتے ہوئے انہی کی طرف آ رہے تھے۔

"مارے گئے۔" پیٹر کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ "چلو جلدی کرو کسی نہ کسی طرح اس ڈبے میں گھس جاؤ۔"

وہ دونوں بیک وقت دوڑے اور دھکا پیل کر کے گاڑی میں سوار ہو گئے۔ وہ مختصر سا ڈبہ...... آدمیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اگرچہ انہیں کھڑے ہونے ہی کی جگہ ملی تھی مگر پھر بھی وہ اسی پر شاکر تھے۔ اتنے میں جان نے پیٹر کے کان میں کہا:

"اگر ریل گاڑی میں ہمارے کاغذات چیک کیے گئے تو......؟"

اس سوال پر ایک لمحے کے لیے پیٹر بوکھلا گیا۔ واقعی یہ بہت بڑا خطرہ تھا۔ کاغذات ان کے پاس موجود ضرور تھے لیکن انہیں ظاہر کرنے کا مطلب یہ تھا کہ...... اس سے آگے وہ کچھ سوچ ہی نہ سکا...... اس نے پیٹر سے کہا۔ "چپ چاپ اپنی جگہ کھڑے رہو۔

ہمیں خدا نے کیمپ سے نکال کر یہاں تک خیریت سے پہنچا دیا ہے' وہی ہماری حفاظت کا انتظام بھی کرے گا۔"

اس فقرے سے ان دونوں کو کچھ سکون حاصل ہوا اور وہ آنے والے حالات سے قطعاً بے پروا ہو کر آئندہ کے پروگرام پر غور کرنے لگے۔ ان کی منزل فرینکفرٹ تھی اور ٹائم ٹیبل کے مطابق گاڑی ساڑھے دس بجے وہاں پہنچنے والی تھی۔ گاڑی کے درمیانی راستے کا دروازہ جب بھی کھلتا' وہ دونوں چونک کر اس طرف دیکھتے کہ شاید چیکنگ آفیسر آ گیا مگر وہ اور شخص ہوتا۔ اتفاق کی بات کہ سارے سفر کے دوران میں کوئی بھی ان کے کاغذات تو درکنار ٹکٹ تک دیکھنے نہیں آیا۔

فرینکفرٹ کے سٹیشن پر گاڑی صرف پانچ منٹ کے لیے رکی۔ وہ دونوں فوراً باہر نکلے اور تیزی سے بیرونی دروازے کی طرف چلے۔ جہاں ایک لمبا تڑنگا جرمن ریلوے آفیسر دو فوجی افسروں کے ساتھ کھڑا ہر مسافر کے ٹکٹ کا معائنہ کر کے مختلف قسم کے سوالات پوچھ کر انہیں جانے کی اجازت دے رہا تھا۔ ان دونوں کی سٹی ایک مرتبہ پھر گم ہوئی اور وہ حیرت وخوف کے ملے جلے جذبات کے ساتھ ایک دوسرے کی طرف تکنے لگے۔ پیٹر نے اپنا قدم ادھر بڑھایا ہی تھا کہ جان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر پیچھے گھسیٹ لیا۔

"کیا غضب کرتے ہو؟ پاگل ہوئے ہو؟" اس نے چپکے سے کہا: "وہ راستہ تو صرف جرمن سپاہیوں کے لیے ہے جو رخصت پر یہاں آئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ عام مسافروں کے لیے وہ سامنے والا دروازہ ہے' آؤ ادھر چلتے ہیں۔"

دوسرے دروازے پر بھی ایک جرمن افسر موجود تھا' لیکن وہ صرف ہر مسافر کا ٹکٹ بغور دیکھ کر دروازے سے گزر کر جانے کی اجازت دے دیتا تھا۔ پیٹر اور جان باہر نکلنے والوں کی قطار میں ایک دوسرے سے ذرا فاصلے پر کھڑے ہو گئے۔ اپنے ٹکٹ انہوں نے ہاتھوں میں پکڑ لیے اور دل میں خدا کو یاد کرتے ہوئے آگے بڑھے۔ پولیس افسر

نے گھورتی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھا اور ٹکٹ دیکھ کر باہر نکل جانے کا اشارہ کیا۔ وہ دونوں تیز تیز چلتے ہوئے شہر میں داخل ہوئے اور گلیوں میں آوارہ پھرنے لگے۔ انہیں شعوری طور پر اپنی اجنبیت کا احساس شدت سے ہو رہا تھا۔ وہ ہر شخص سے آنکھیں چار کرتے ہوئے کتراتے تھے۔ دوکانوں پر لگے ہوئے سائن بورڈ اور گلیوں کے نام ان کے لیے بیکار تھے کیونکہ وہ جرمن زبان نہیں جانتے تھے۔ وہ ساری رات کے جاگے ہوئے تھے جس کا بڑا حصہ سرنگ کھودتے ہوئے گزر گیا تھا۔ ان کے بدن کا جوڑ جوڑ درد اور تھکن سے ٹوٹ رہا تھا۔ آنکھیں نیند سے بوجھل اور چال میں لڑکھڑاہٹ کے آثار نمایاں تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ وہیں کسی گلی کے فرش یا کسی مکان کے برآمدے میں پڑ کر بے خبر سو جائیں۔ مگر ان کے لیے اس بھرے شہر میں کوئی ایسی جگہ نہ تھی۔ وہ دونوں گمشدہ مویشیوں کی طرح اس گلی سے اس گلی میں اور اس بازار سے اس بازار میں مارے مارے پھر رہے تھے کسی سے بات کرنا چاہتے مگر کیا بات کرتے؟ ان کو ہر شخص نازی جاسوس نظر آتا تھا اور ان کا جانی دشمن۔ اسی طرح آوارہ پھرتے ہوئے دوپہر، سہ پہر میں تبدیل ہوگئی۔ اور سہ پہر شام کے دھندلکوں میں گم ہوگئی لیکن ان دو مفرور قیدیوں کو پناہ کی کوئی جگہ نہ ملی۔ بھوک اور تھکن کے ہاتھوں دونوں ہی جاں بلب ہو چکے تھے۔ آخر انہیں ایک باغ دکھائی دیا جہاں لوگوں کے آرام کرنے اور بیٹھنے کے لیے بینچیں بچھی ہوئی تھیں باغ میں اس وقت زندگی سے بیزار دو ایک بڈھوں اور چند نوجوان جوڑوں کے سوا کوئی نہ تھا۔ جب وہ باغ میں داخل ہوئے تو انہوں نے سہمی ہوئی نظروں سے ہر ایک فرد کا جائزہ لیا کہ ان میں کوئی نازی جاسوس تو نہیں اور جب انہیں کامل اطمینان ہو گیا تو وہ وہیں گھاس پر لیٹ گئے نہ معلوم وہ کتنی دیر سوئے ہوں گے کہ دفعتہً کسی کے جھنجھوڑنے پر وہ جاگے۔ ان کے سامنے باغ کا چوکیدار کھڑا تھا۔ وہ کرخت جرمن لہجے میں بولا "تم کون ہو؟" جان اور پیٹر ہڑبڑا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ چوکیدار عجیب سی نگاہوں سے

انہیں دیکھ رہا تھا۔ اس سے پیشتر کہ وہ جواب دیں چوکیدار نے خود ہی کہا: "تم فرانسیسی ہو؟" مزدور ہو؟" ان دونوں نے فوراً اثبات میں گردن ہلائی اور ٹوٹے پھوٹے جرمن لہجے میں کہا: "ہم جنگی قیدی نہیں ہیں...... فرانسیسی کارکن ہیں محنت مزدوری کرتے ہیں۔ کیا تم ہمیں ایسی جگہ بتا سکتے ہو جہاں ہم رات کے لیے ٹھہر سکیں اور سستا کھانا بھی مل جائے۔"

"تم کسی ہوٹل میں کیوں نہیں چلے جاتے؟" چوکیدار نے کہا: "تمہارے لیے یہی بہتر ہوگا ورنہ کسی مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔ تم فرانسیسی لوگ سخت بیوقوف ہوتے ہو۔ یہ کوئی سونے کی جگہ ہے۔"

وہ دونوں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ ایک جگہ سے انہوں نے ابلے ہوئے چاول خرید کر کھائے اور پھر ہوٹل کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ جرمن چوکیدار سے انہیں ایک قیمتی بات یہ معلوم ہوگئی تھی کہ اس شہر میں فرانسیسی مزدوروں پر زیادہ شک نہیں کیا جاتا۔ اور انہیں "بیوقوف" ہونے کے باعث آسانی سے جگہ مل جاتی ہے لیکن...... وہ فرانسیسی تو نہیں ہیں۔ اگر کسی نے پہچان لیا کہ وہ دونوں انگریز ہیں تو پھر کیا ہوگا......؟ یہ سوچ کر ہی ان کے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ وہ ہمت کر کے ایک بڑے ہوٹل میں گئے۔ جان نے باہر کھڑے ہوئے دربان سے نہایت خوشامدانہ لہجے میں پوچھا:

"کیا ہمیں یہاں ایک رات کے لیے کمرہ مل سکے گا؟"

دربان نے انہیں اوپر سے نیچے تک دیکھا گویا حلیے سے ان کی پوزیشن کا اندازہ کر رہا ہو۔ پھر زور سے نفی میں گردن کو حرکت دی اور ہوٹل کا دروازہ بند کر دیا۔ یہ دونوں منہ لٹکائے واپس چلے آئے۔ اب کیا کریں؟ کدھر جائیں؟ رات تیزی سے گزر رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد پولیس کے گشتی دستے سڑکوں پر نمودار ہو جائیں گے۔ اس وقت ان کی

نگاہوں سے محفوظ رہنا بڑا مشکل ہوگا۔ یکا یک انہیں خیال آیا کہ سٹیشن پر ہی جانا چاہئے کیونکہ وہاں کئی چھوٹے اور سستے ہوٹل انہوں نے دیکھے تھے اور عین ممکن ہے کہ وہاں بھی ان کی طرح کچھ اور مفرور فرانسیسی یا انگریز قیدی ٹھہرے ہوئے ہوں۔ یہ خیال نہایت خوش کن تھا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے سٹیشن کی طرف روانہ ہوئے لیکن جس ہوٹل میں بھی جاتے یہی جواب ملتا کہ کوئی کمرہ خالی نہیں ہے۔ انہوں نے چار پانچ ہوٹلوں میں معلوم کیا مگر ہر جگہ انکار تھا اور وہ انتہائی مایوسی اور خوف کے عالم میں سوچنے لگے کہ اب کیا کرنا چاہئے۔

''خدا کی پناہ...... یہاں تو لندن سے بھی بدتر صورت حال ہے۔ سر چھپانے کی کوئی جگہ نہیں ملتی۔'' پیٹر نے جھلا کر کہا: ''آؤ اب پھر شہر کی طرف چلتے ہیں یہاں سٹیشن پر ٹھہرنا خطرناک ہے۔ کوئی خندق یا کھائی ہی مل جاتی تو اس میں پڑ رہتے۔''

''بھئی مجھ سے تو اب چلا نہیں جاتا۔'' جان نے کہا: ''چل چل کر میری ہڈیاں بھی چیخ گئی ہیں۔''

مرتا کیا نہ کرتا...... وہ پناہ گاہ کی تلاش میں ایک بار پھر سٹیشن سے شہر کی طرف چلے اور دو گھنٹے تک مارے مارے پھرتے رہے۔ رات کے دو بجے وہ گشت کرنے والے سپاہیوں کی نظروں سے بچتے بچاتے آوارہ کتوں سے خوف کھاتے ہوئے شہر کی دوسری جانب پہنچ گئے۔ اس سے آگے میلوں تک کھیت ہی کھیت پھیلے ہوئے تھے اور یہاں ایک بار پھر جان کی ہمت نے جواب دے دیا۔

''میں اس سے ایک قدم بھی آگے نہیں جاؤں گا' خواہ مروں یا زندہ رہوں۔'' یہ کہہ کر وہ وہیں کھلے میدان میں لیٹ گیا۔ اپنے ساتھی کو یوں ہمت ہارتے دیکھ کر اگرچہ پیٹر کے حواس بھی جواب دے گئے تھے لیکن وہ ذرا مضبوط دل گردے کا آدمی تھا۔ اس نے جان کو غیرت دلائی۔ ''اگر تم اتنے ہی کمزور تھے تو تمہیں کیمپ سے فرار ہونے کی کیا

ضرورت تھی؟ اپنے ساتھ تم اب مجھے بھی مصیبت میں پھنسوانا چاہتے ہو۔ خدا کے واسطے یہاں سے اٹھو۔ یہ کوئی آرام کرنے کی جگہ ہے؟''

یہ ڈانٹ ڈپٹ کام کر گئی۔ بیچارہ جان اٹھا اس کے پیروں میں لغزش تھی اور جسم بار بار ایک جانب جھکا جا رہا تھا۔ اس طرح گرتے پڑتے وہ ایک میل اور چلے۔ نیند کے مارے ان کا یہ حال تھا کہ اگر اس وقت کوئی تنگ و تاریک قبر بھی انہیں مل جاتی تو وہ اس میں سونے کے لیے تیار تھے۔ شدید پیاس سے ان کے حلق سوکھ گئے تھے اور زبان پر جیسے کانٹے اگ آئے تھے۔ آخر انہیں ایک بڑی سی عمارت کے آثار دکھائی دیئے۔ راستے میں انہیں ایک چھوٹی سی نہر ملی جو کھیتوں کو سیراب کرتی تھی۔ وہاں جی بھر کر پانی پیا۔ پانی پی کر ذرا ہوش ٹھکانے آئے تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ اسی عمارت میں پناہ لینی چاہیے۔ عمارت کا دروازہ بند تھا اور گھر کی تاریکی نے اسے ہر طرف سے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ دروازے کے قریب لکڑی کا ایک بورڈ دکھائی دیا جس پر صلیب کا نشان بنا ہوا تھا اور نیچے جرمن زبان میں چند حروف درج تھے۔

''آہ...... یہ تو کانونٹ کی عمارت ہے۔'' جان نے بورڈ پڑھا اور خوش ہو کر کہا: ''میں دروازہ کھلواتا ہوں۔ یہاں ہمیں آرام مل جائے گا۔'' وہ دروازے پر دستک دینے ہی والا تھا کہ پیٹر نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''تمہارا دماغ تو بالکل ہی خراب ہو گیا ہے۔ بندہ خدا یہ برطانیہ، ہالینڈ، فرانس نہیں' جرمنی ہے جرمنی کیا سمجھے؟ یہاں کسی گرجے یا کانونٹ میں بھی پناہ نہ ملے گی۔ اگر جرمن پادری کو ذرا شک ہو گیا کہ ہم کون ہیں تو وہ مذہب اور اخلاق سب کو بالائے طاق رکھ کر فوراً پولیس کو فون کر دے گا۔ یہ لوگ جرمنی کے لیے ہر شے قربان کرنے کے لیے تیار ہیں۔''

بات معقول تھی اس لیے جان کی سمجھ میں آ گئی اور وہ دونوں وہاں سے آگے چل پڑے۔ قدرت کو ان کی بیکسی و بیچارگی پر رحم آ ہی گیا اور آخر انہیں ایک ایسی جگہ مل گئی

جہاں وہ اطمینان سے سو سکتے تھے اور کوئی انہیں نہ دیکھتا' یہ کنکریٹ کا بنا ہوا ایک سرنگ نما زمین دوز راستہ تھا جو سڑک کے نیچے بنایا گیا تھا یا شاید یہ پناہ گاہ تھی جو ہوائی حملے سے بچنے کے لیے تعمیر کی گئی ہو گی۔ بہر حال جان اور پیٹر کے لیے اس وقت یہ ایک سجے سجائے آرام دہ گھر کی نسبت کہیں زیادہ قیمتی تھی۔ اس کے اندر اگرچہ اندھیرا تھا مگر انہوں نے کوئی پروا نہ کی۔ ٹارچ کی روشنی میں خوب دیکھ بھال کر وہ وہیں ایک دوسرے کے قریب لیٹ گئے۔ اپنے اپنے سفری تھیلے انہوں نے سروں کے نیچے رکھ لیے اور تھوڑی ہی دیر میں دنیا اور مافیہا سے بے خبر خراٹے لینے لگے۔ عین ممکن تھا کہ وہ بہت دیر تک سوئے رہتے' لیکن صبح کے وقت سردی اتنی شدید ہو گئی کہ ان کے جسم کانپنے لگے اور ان کی آنکھ کھل گئی۔ وہ فوراً یہاں سے باہر نکل آئے۔ ہر طرف ابھی اندھیرا تھا۔ پو پھٹنے میں کافی دیر تھی۔ وہ واپس شہر کی طرف چل پڑے۔ اب وہ اپنے آپ کو چست اور تازہ دم محسوس کر رہے تھے۔

فرینکفرٹ کے بازاروں اور گلیوں میں ابھی تک اندھیرا تھا' لیکن جرمن مزدور اور دوسرے پیشہ ور لوگ گھروں سے نکل آئے تھے اور ہر شخص تیزی سے قدم بڑھائے اپنے کام پر جا رہا تھا۔ ریلوے سٹیشن تک پہنچتے پہنچتے دن خاصا چڑھ آیا۔ ٹکٹ گھر کے آگے مسافروں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ انہوں نے اس بورڈ کو دیکھا جس پر ریلوں کے اوقات درج تھے۔

"ایک گھنٹے تک کسٹرین کو جانے والی گاڑی مل سکے گی۔" جان نے چپکے سے کہا: "ہمیں اب یہاں سے چل دینا چاہیے۔" "بے شک یہی مناسب ہے۔" پیٹر نے جواب دیا۔ "آؤ اب کہیں سے ایک ایک پیالہ قہوہ پی لیں تاکہ سردی تو دور ہو۔"

"کہیں ایسا نہ ہو کہ قہوہ بھی یہاں راشن سے مل رہا ہو؟ جنگ کا زمانہ ہے۔" جان کہنے لگا۔

"اگر واقعی ایسا ہے تب تو بڑی مصیبت ہے۔" وہ دونوں وہاں سے ٹہلتے ہوئے ویٹنگ روم کی طرف آئے جہاں بہت سے لوگ بنچوں اور کرسیوں پر بیٹھے گاڑی کا انتظار کر رہے تھے۔ ان میں سے بعض لوگوں نے وردیاں پہنی ہوئی تھیں۔ یہ دونوں فرانسیسی مزدور بھی ایک گوشے میں جا کر خاموش بیٹھ گئے اور انہیں یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ کسی شخص نے بھی ان کی طرف توجہ نہ دی۔ بہت سے لوگ کافی پینے اور سینڈوچ کھانے میں مصروف تھے۔ پیٹر نے دیکھا کہ یہاں کوئی بیرا نہیں ہے۔ ہر شخص "اپنی مدد آپ" کے اصول پر عمل پیرا ہے۔ کاؤنٹر پر جاتا ہے اور اپنی پسند کی چیز لے آتا ہے۔ جان کی پیٹھ کاؤنٹر کی طرف تھی۔ اس لیے وہ نہیں دیکھ سکتا تھا کہ کافی یا سینڈوچ لینے کا یہاں کیا طریقہ ہے۔ پیٹر نے میز کے نیچے سے اپنا پیر جان کے پیر پر رکھ کر اسے متوجہ کرنے کی کوشش کی مگر جان صرف مسکرا کر رہ گیا۔ آخر پیٹر نے قریب کی کرسی پر رکھا ہوا جرمن زبان کا اخبار اٹھایا اور اسے یوں دیکھنے لگا جیسے پڑھ رہا ہو۔ حالانکہ وہ جرمن زبان کا ایک حرف بھی نہ جانتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے جیب سے پنسل نکالی اور اخبار کے ایک کونے پر لکھا: "یہاں کوئی بیرا نہیں' اپنی مدد آپ کے اصول پر عمل کرو۔" جان نے یہ فقرہ پڑھا اور پھر اخبار میں سے اتنا ٹکڑا پھاڑ کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔ تب ایک لمحہ انتظار کے بعد جان نے گھڑی میں وقت دیکھا' نہایت بے پروائی سے منہ کھول کر ایک سرد آہ بھری' پھر انگڑائی لے کر اپنی جگہ سے اٹھا اور کاؤنٹر کی طرف بڑھا۔ قہوہ اور سینڈوچ حاصل کرنے میں اسے کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ اس نے محض اشارے سے یہ چیزیں لے لیں اور ان کی قیمت ادا کر دی۔ پھر وہ اطمینان سے کھا پی کر باہر نکلے۔ ٹکٹ خریدنے والوں کی لمبی قطار لگی ہوئی تھی۔ اس مرتبہ بھی ٹکٹ خریدنے کا قرعہ جان ہی کے نام پڑا۔ کیونکہ وہ جرمن زبان کے چند الفاظ ضرورت پڑنے پر بول سکتا تھا۔ اپنی باری پر اس نے دو ٹکٹ بھی آسانی سے خریدے اور وہ آپس میں بات چیت کیے بغیر

پلیٹ فارم کی طرف چل پڑے۔ پل کے قریب پہنچ کر انہوں نے کلکٹر کے ہاتھ میں تھما دیئے۔ کلکٹر نے ایک نظر ٹکٹوں پر ڈالی اور پھر غصے سے چلا کر دونوں ٹکٹ جان کے ہاتھ میں پکڑا دیے۔ وہ دونوں سہم کر اسے دیکھنے لگے۔ بھاگنے کا تو موقع ہی نہ تھا۔ جان نے ہمت کر کے جرمن زبان میں کلکٹر سے پوچھا کہ کیا معاملہ ہے تو اس نے ہاتھ سے ایک بورڈ کی جانب اشارہ کیا جس پر موٹے حروفوں میں ''کرسٹین'' لکھا تھا۔ پھر اس نے بڑبڑا کر ایک دو فقرے کہے۔ جان پیچھے ہٹ گیا اور پیٹر کو ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ ایک علیحدہ جگہ پر پیٹر نے اس سے پوچھا: ''کیا بات تھی؟''

''بات یہ ہوئی کہ اس بدبخت بکنگ کلرک نے مجھے برلن جانے کے دو ٹکٹ دے دیے ہیں۔ کلکٹر کہہ رہا تھا کہ گاڑی کرسٹین جا رہی ہے اور تم بیوقوف برلن کے ٹکٹ لے آئے ہو۔ تم یہیں ٹھہرو میں ٹکٹ بدل کر لاتا ہوں۔''

''خبردار اب وہاں نہ جانا۔'' اگر بکنگ کلرک نے تفتیش شروع کر دی تو سارا کھیل بگڑ جائے گا۔ تم دو اور ٹکٹ خرید لو۔ روپیہ تو تمہارے پاس موجود ہی ہے۔''

''ہاں یہی مناسب ہے۔ مجھے خود یہ فکر تھی کہ اگر ٹکٹ بدلوائے تو بکنگ کلرک کو شبہ ضرور ہوگا۔''

ایک بار پھر وہ ٹکٹ گھر کی طرف گیا اور کرسٹین جانے کے دو ٹکٹ خریدے۔ ٹکٹ کلکٹر اب کسی اور پر برس رہا تھا۔ شاید اس شخص کو بھی غلطی سے برلن کا ٹکٹ...... دے دیا گیا تھا۔ بہرحال اس نے پیٹر اور جان کو گزر جانے کی اجازت دے دی۔

''کسی ایسے ڈبے میں سوار ہونا چاہیے جو خوب کھچا کھچ بھرا ہو۔'' پیٹر نے کہا: ''تاکہ لوگ ایک دوسرے کی طرف متوجہ نہ ہوں۔'' وہ تیسرے درجے کے ایک ڈبے میں گھس گئے۔ یہ ریل کے ڈبے کی بجائے کوئی مویشی گھر معلوم ہوتا تھا۔ اس میں مسافر ایک دوسرے کے اوپر تلے سوار تھے۔ ابھی انہیں ڈبے میں سوار ہوئے چند ہی

منٹ گزرے تھے کہ دروازہ کھلا اور ایک جرمن سپاہی اندر آیا۔ اس نے آتے ہی لوگوں کو گالیاں دے کر باہر نکالنا شروع کر دیا اور پھر گھونسے مارنے اور دھکے دینے لگا۔ اس نے جان اور پیٹر کو بھی دھکے دے کر باہر نکال دیا۔

''اب کیا مصیبت آئی۔'' پیٹر نے کہا: ''یہ ڈبہ کیوں خالی کرایا جا رہا ہے؟''

جان نے ایک سرد آہ بھری اور کہا: ''اس ڈبے کے باہر ایک نوٹس لگا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں روس کے جنگی قیدیوں کو لے جایا جائے گا۔'' وہ دونوں تیسرے درجے کے ایک اور ڈبے میں سوار ہوئے جس میں پہلے ڈبے سے بھی زیادہ لوگ بھرے ہوئے تھے۔ لیکن سب کے سب شہری تھے۔ ان میں کوئی فوجی نہ تھا۔ پیٹر اور جان یوں منہ پھیرے کھڑے رہے۔ جیسے ایک دوسرے سے قطعی ناآشنا ہوں۔ ٹرین چل پڑی۔ وہ ہر پانچ منٹ بعد کسی سٹیشن پر رکتی تھی' ہر سٹیشن پر جب ٹرین رکتی' ان دونوں کے دل تیزی سے دھڑکنے لگتے کہ اب گسٹاپو کا کوئی افسر آتا ہے اور انہیں پکڑ کر لے جاتا ہے۔ سارے راستے ان کی یہی کیفیت رہی اور ریل گاڑی کا یہ عالم تھا کہ ہر چھوٹے بڑے سٹیشن پر ٹھہر جاتی تھی۔ کرسٹین کا سٹیشن آنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ کھڑے کھڑے بیچاروں کی ٹانگیں سن ہو گئیں۔

دس بج رہے تھے کہ گاڑی کرسٹین پہنچی' شناختی کارڈ دکھانے کا جھنجھٹ یہاں نہ تھا' اس لیے وہ آسانی سے گیٹ سے باہر نکل گئے۔ کرسٹین ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ فرینکفرٹ سے بھی چھوٹا اور یہی چیز ان کے لیے پریشانی کا باعث تھی۔ بڑے اور زیادہ گنجان آبادی کے شہر میں دو آدمیوں کا گم ہو جانا آسان ہوتا ہے لیکن چھوٹے شہر میں انہیں آسانی سے تلاش کیا جا سکتا ہے۔ پیٹر اور جان اس سے پہلے بھی ایک مرتبہ یہاں آ چکے تھے۔ لیکن اب دو سال تک ساگان کے جنگی کیمپ میں قید کاٹنے کے بعد ان کے اعصاب اس قدر کمزور ہو گئے تھے کہ وہ قدم قدم پر بدکتے تھے۔ ہر شخص گسٹاپو کا رکن دکھائی دیتا تھا' وہ

اس شہر کی زبان بھی نہ جانتے تھے اور کوئی شخص یہاں ان کا ہمدرد اور دوست بھی نہ تھا بس قسمت کا ایک نادیدہ ہاتھ انہیں کشاں کشاں ایک طرف لیے جاتا تھا۔ خدا جانے کہاں...... زندگی کی طرف یا موت کے منہ میں۔

انہوں نے شہر کی بڑی سڑک عبور کی جس کے دونوں طرف چھوٹی بڑی دکانیں تھیں۔ اس سڑک کے بعد انہیں ایک نہر دکھائی دی جس کے پار جانے کے لیے پل بنا ہوا تھا اور پل کے درمیان ایک فوجی سپاہی ہاتھ میں رائفل لیے پہرہ دے رہا تھا۔ وہ دونوں نہر سے پچاس ساٹھ گز دور ہی رک گئے اور سوچنے لگے کہ اب کیا کرنا چاہئے انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ آجکل کے حالات میں ہر شخص کو پل عبور کرنے کی اجازت نہیں۔

''یہ خطرہ مول لینا کسی طرح صحیح نہیں ہوگا۔ آؤ واپس چلیں۔ ممکن ہے نہر کو پار کرنے کا کوئی اور راستہ بھی ہو۔'' پیٹر نے کہا۔ وہ واپس ہوئے اور ایک دوسری سڑک پر چلنے لگے جو ایک پبلک پارک پر جا کر ختم ہوگئی۔ ''آؤ یہاں بیٹھ کر کچھ کھا پی لیں۔'' جان نے تجویز پیش کی۔ انہوں نے وہاں بیٹھ کر کچھ بسکٹ تھیلے میں سے نکال کر کھائے' برش سے اپنے اپنے کپڑے صاف کیے' جوتے چمکائے اور بالوں میں کنگھی کی۔ پیٹر کا ارادہ شیو کرنے کا تھا' مگر جان نے اسے روک دیا۔

''ریزر بلیڈ آجکل بہت قیمتی شے ہے۔ کسی نے تمہارے پاس دیکھ لیا تو یہی سمجھے گا کہ ضرور کوئی معاملہ ہے۔ ویسے بھی ڈاڑھی سے تم اصلی فرانسیسی معلوم ہوتے ہو۔''

''ہمیں کیمپ سے فرار ہوئے اب تک سترہ گھنٹے گزر چکے ہیں اور انہیں اب تک یقیناً ہمارے فرار کا پتہ چل گیا ہوگا۔''

''اور اب تک وہ تمام ریلوے سٹیشنوں کو خبردار کر چکے ہوں گے۔ مگر حیرت ہے کہ کسی نے ہماری طرف توجہ نہیں کی۔''

تھوڑی دیر تک وہ دونوں خاموش بیٹھے ایک دوسرے کی صورت دیکھتے رہے۔ آخر جان نے کہا:

''چلو' جب اوکھلی میں سر دیا تو موسلوں کا کیا ڈر۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ آؤ اب چلتے ہیں۔''

''ذرا دیکھنا وہ سامنے ایک سپاہی چلا آتا ہے۔'' پیٹر نے کہا اور جان نے چونک کر ادھر دیکھا۔ واقعی سامنے سڑک پر ایک باوردی سپاہی آہستہ آہستہ انہی کی طرف آ رہا تھا۔ جان نے پیٹر کو فوراً اُٹھنے کا اشارہ کیا اور وہ دونوں بغیر کسی گھبراہٹ اور پریشانی کے اٹھے اور اسی طرف چلے جدھر سے سپاہی آ رہا تھا۔ ''جب قریب پہنچو تو فرانسیسی زبان میں بولنا شروع کر دینا۔'' جان نے چپکے سے کہا...... اور انہوں نے ایسا ہی کیا۔ جونہی سپاہی ان کے قریب آیا' پیٹر فرانسیسی میں اوٹ پٹانگ فقرے بولنے لگا۔ سپاہی ایک لمحے کے لیے رکا۔ ان کی طرف مڑ کر دیکھا اور پھر آگے چل دیا۔ یہ دونوں تھوڑی دور تک اسی طرح فرانسیسی بولتے ہوئے چلتے رہے۔

''خدا کا شکر ہے کہ یہ بلا آسانی سے ٹلی۔'' پیٹر نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب وہ جس مقام پر کھڑے تھے' وہاں ایک چھوٹا سا کیفے دکھائی دیا جس پر لکھا تھا ''سٹیچی گریمی۔ جان کو جیسے کچھ یاد آ گیا۔'' آؤ' اس کیفے میں چلیں۔ میں پہلے بھی یہاں آ چکا ہوں۔ یہاں زیادہ بھیڑ نہیں ہوتی۔'' وہ دونوں کیفے میں داخل ہوئے۔ ایک وسیع و عریض کمرے میں لکڑی کی پرانی کرسیاں اور میزیں رکھی تھیں اور کھڑکی کے نزدیک ایک میز کے گرد صرف چار آدمی بیٹھے تھے۔ پیٹر اور جان کمرے کے آخری گوشے میں جا کر بیٹھ گئے۔ ان کے بیٹھتے ہی ایک نوجوان ویٹرس آئی۔ جان نے جرمن زبان میں اس سے کچھ کہا اور وہ مسکراتی ہوئی چلی گئی اور چند ہی منٹ بعد دودھ سے بھرے ہوئے دو گلاس لے آئی۔ جان نے جیب سے چند سکے نکال کر اسے دیے۔ ویٹرس نے لے کر اپنی جیب میں رکھ لیے۔ دوسری میز پر بیٹھے ہوئے چاروں آدمی گفتگو ترک کر کے ان دو اجنبیوں کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ پھر انہوں نے آپس میں کھسر پھسر کی۔ یہ حرکت جان

اور پیٹر کے حواس باختہ کر دینے کے لیے کافی تھی۔ انہوں نے جلد جلد دودھ پیا اور کیفے سے نکل بھاگے اور کافی دور جا کر بھی پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتے رہے کہ کوئی ان کے تعاقب میں تو نہیں آ رہا۔

''اب کیا کریں' کدھر جائیں؟'' یہ سوال بار بار ان کے ذہن میں آتا تھا۔ پیٹر نے کہا کہ یہاں سے کسی اور شہر کی طرف چلیں' مگر جان نے یہ تجویز رد کر دی۔

''دن کے بجائے رات کو سفر کرنا زیادہ اچھا ہے۔ اس نے کہا: ''فرض کرو اگر ہم اپنے وطن میں ہوتے اور فالتو وقت کہیں گزارنا چاہتے تو بتاؤ اس وقت ہم بھلا کیا کرتے؟''

''کسی پارک میں چلے جاتے۔ یا کسی ہوٹل میں' پیٹر نے کہا: ''ہاں عجائب گھر یا لائبریری بھی اچھی جگہیں ہیں۔''

''اور سینما؟'' جان نے لقمہ دیا۔ پیٹر اچھل پڑا۔ ''واہ' واہ کیا لا جواب ترکیب سوچی ہے۔ اب تمہارا ذہن خوب کام کر رہا ہے۔'' یہ سن کر جان کے لبوں پر پہلی دفعہ سچی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ پھر ہنستے ہوئے کہنے لگا۔ ''وقت کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ کل ہی دشمنوں کے کیمپ سے فرار ہوئے ہیں اور اب جان ہتھیلی پر رکھے پھر رہے ہیں اور پروگرام بن رہا ہے فلم دیکھنے کا۔''

وہ ایک قریبی سینما میں گھس گئے۔ ہال میں بچوں اور عورتوں کی تعداد زیادہ تھی۔ وہ دونوں پچھلی نشستوں پر اطمینان سے سو گئے اور جب ان کی آنکھ کھلی تو وہ ایک دوسرے سے پوچھنے لگے ''فلم کیسی تھی؟''

جب وہ ہال سے باہر نکلے تو سورج آہستہ آہستہ مغرب کی طرف جھک رہا تھا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ سٹیٹن کی طرف چلنا چاہیے۔ سٹیٹن بحیرہ بالٹک کی ایک چھوٹی لیکن اہم بندرگاہ تھی اور ان دنوں وہاں جانے والے ہر مسافر کی سختی سے جانچ پڑتال کی جا

رہی تھی۔ ان دونوں کے سامنے وہاں جانے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ انہیں جس بات کا ڈر تھا وہی وقوع پذیر ہوئی۔ جان نے سٹیٹن کے بکنگ کلرک سے جب کہا کہ سٹیٹن کے دو ٹکٹ دے دو تو اس نے فوراً چونک کر ان کی طرف دیکھا اور کہا: ''براہِ کرم اپنے شناختی کاغذات دکھائیے۔''

جان نے نہایت سکون سے تھیلے میں سے جعلی کاغذات نکال کر کلرک کی طرف بڑھا دیئے۔ کلرک نے کاغذات کو غور سے دیکھا' چند بار گردن ہلائی۔ ادھر جان اور پیٹر کے دل زور زور سے دھڑک رہے تھے۔ ان کے چہروں کا رنگ اڑ گیا تھا اور اسی لیے وہ کھڑکی سے قدرے پیچھے ہٹ کر منہ پھیرے کھڑے تھے۔ کچھ دیر کے بعد کلرک نے کاغذات اور سفر کے ٹکٹ انہیں دے دیئے اور ان کی جان میں جان آئی۔ انہیں کسی طرح یقین نہ آتا تھا کہ سٹیٹن کے ٹکٹ اتنی آسانی سے مل جائیں گے۔ قدرت قدم قدم پر ان کی مدد کر رہی تھی۔

سٹیٹن کو جانے والی گاڑی میں لوگ بھیڑ بکریوں کی طرح بھرے ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ ریل کا وہ اندرونی راستہ جس کے ذریعے ایک سرے سے دوسرے سرے تک آسانی سے جایا جا سکتا ہے' وہاں بھی مسافر کھڑے تھے۔ جان اور پیٹر بھی اسی راستے میں جا کر کھڑے ہو گئے۔ وہ دونوں اپنے اردگرد اجنبیوں اور جرمن لوگوں کو دیکھ کر خوفزدہ سے ہو گئے' لیکن خیریت ہی رہی کہ یہاں ذرا اندھیرا تھا' اس لیے دوسرے لوگ انہیں پہچان نہیں سکے کہ یہ کون ہیں۔ مسلسل ایک گھنٹے تک گاڑی چلتی رہی۔ وہ دونوں ایک ہی جگہ بے حس و حرکت کھڑے کھڑے تھک چکے تھے۔ خدا خدا کر کے ایک سٹیشن آیا جہاں گاڑی رکی۔ بہت سے مسافر یہاں اتر گئے اور اتنی جگہ نکل آئی کہ جان اور پیٹر اپنے اپنے تھیلوں کے اوپر بیٹھ سکیں۔ پلیٹ فارم کے قریب ہی ایک ہال نما کمرہ نظر آ رہا تھا۔ جہاں بہت سے مسافر کچھ کھا پی رہے تھے۔ اگرچہ انہیں بھی سخت بھوک اور پیاس لگی

ہوئی تھی مگر اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ بھی وہاں جا کر کچھ کھا پی لیتے۔ وہ وہیں ریل گاڑی میں بیٹھے رہے۔ گاڑی جب دوبارہ چلی تو انہوں نے اطمینان کا سانس لیا اور ادھر ادھر دیکھا۔ ایک گوشے میں اتنی جگہ تھی کہ وہ پیر پھیلا کر سو سکتے تھے۔ پس وہ سرک کر وہیں چلے گئے اپنے تھیلوں کا تکیہ بنایا اور تھوڑی ہی دیر میں سو گئے۔

نا معلوم وہ کتنی دیر سوئے رہے کیونکہ جب ان کی آنکھ کھلی تو انہوں نے ٹکٹ چیکر کو کھڑے ہوئے پایا جس کے ساتھ وردی پہنے ہوئے ریلوے پولیس کے دو آفیسر بھی تھے۔ ٹکٹ چیکر چلا چلا کر مسافروں سے ٹکٹ مانگ رہا تھا اور اس کی آواز سن کر ہی وہ جاگے تھے۔ باری باری ہر مسافر کا ٹکٹ اور شناختی کاغذات دیکھتا ہوا اب لحہ بہ لحہ ان کے قریب آ رہا تھا۔ پیٹر نے کنکھیوں سے جان کو دیکھا۔ خدا رحم کرے۔ اس کا چہرہ دھلے ہوئے کپڑے کی مانند سفید تھا۔ آنکھوں میں موت کی سی زردی جھلکتی تھی۔ جیسے کسی نے اس کی رگوں سے سارا خون نچوڑ لیا ہو۔ یک لخت ایک ایسا عظیم تغیر اس کی حالت میں رونما ہوا کہ خود پیٹر بھی کانپ گیا۔ ٹکٹ چیکر کا رویہ مسافروں سے نہایت درشت اور ظالمانہ تھا' وہ کسی کو ٹھوکر مارتا اور کسی کو گھونسا اور جب کوئی مسافر ٹکٹ دکھانے میں تاخیر کرتا تو اپنے کرخت لہجے میں گالیوں کی بوچھاڑ کر دیتا۔ پولیس آفیسر بالکل مشین کی مانند اس کے ساتھ چل رہے تھے۔ ان کا کام صرف مسافروں کے شناختی کاغذات چیک کرنا تھا۔

آخر اس بڑھیا کی باری آئی جو جان اور پیٹر کے قریب ہی بیٹھی تھی اور جونہی ٹکٹ چیکر اس کی طرف بڑھا' بڑھیا کے چہرے پر بے چینی اور اضطراب کی علامات نمودار ہوئیں اور ایسا نظر آتا تھا کہ اسے انتہائی تکلیف کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ٹکٹ چیکر نے اس کی کیفیت کی پروا کیے بغیر تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''او بڑھیا! جلدی اپنا ٹکٹ دکھا' کہاں ہے تیرا ٹکٹ؟''

بڑھیا نے زبان سے کچھ نہ کہا اور اپنی جیب سے کاغذ کا ایک بوسیدہ سا پرزہ نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ٹکٹ چیکر نے کاغذ کے اس پرزے کو دیکھا اور غصے سے چلایا۔ ''کم بخت! میں کہتا ہوں اپنا ٹکٹ دکھا۔ ٹکٹ......ٹکٹ...... بڑھیا پھر بھی چپ چاپ اپنی گٹھڑی پر بیٹھی رہی۔ ٹکٹ چیکر کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور پھر اس کی زبان سے مغلظات کا ایک سیلاب سا ابل پڑا۔ اس نے پولیس والوں سے کہا...... ''اسے پکڑ کر باہر پھینک دو۔'' عورت رونے چیخنے لگی۔ مگر پولیس والوں نے زبردستی اسے بازوؤں سے پکڑا اور دھکیلتے ہوئے گاڑی کے آخری حصے میں لے گئے۔ اتنے میں ٹکٹ چیکر بڑبڑاتا اور بڑھیا کو برا بھلا کہتا ہوا جان کی طرف متوجہ ہوا۔ جان نے چپکے سے اپنے دونوں ٹکٹ اس کے ہاتھ میں تھما دیے۔ ٹکٹ چیکر نے سرسری نظر سے ٹکٹ دیکھے اور واپس کر دیے۔

اس کے جانے کے بعد جب ان دونوں نے اپنی حالت کا جائزہ لیا تو اپنے آپ کو سر سے پیر تک پسینے میں نہایا ہوا پایا۔ بد مزاج ٹکٹ چیکر اور پولیس آفیسروں کی اتنی دہشت ان پر طاری ہوئی کہ وہ آپس میں بات چیت بھی نہ کر سکے۔ یہاں تک کہ گاڑی سٹیشن پر پہنچ کر رک گئی۔

''آہ...... باہر تو موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔'' جان نے کہا: ''اگر رات کو سونے کی جگہ نہ ملی تو صبح تک سڑکیں صاف کرنے والوں کو ہماری اکڑی ہوئی لاشیں ملیں گی۔''

مسافر جلد جلد اترنے لگے۔ آخر میں یہ دونوں بھی اترے۔ باہر جانے والے گیٹ پر چیکنگ ہو رہی تھی مگر جان نے جلد ہی معلوم کر لیا کہ صرف ٹکٹ دیکھے جا رہے ہیں۔ کاغذات دکھانے کی ضرورت نہیں۔ وہ اب گاڑی سے باہر نکلے تو بحیرۂ بالٹک کی طرف سے آنے والی یخ بستہ ہواؤں کے تھپیڑوں نے ان کا استقبال کیا۔

''وہ بڑھیا تو ہمارے حق میں رحمت کا فرشتہ ثابت ہوئی۔ ٹکٹ چیکر اسے گالیاں دینے میں مصروف رہا ورنہ وہ ہم سے کاغذات کا مطالبہ ضرور کرتا۔''

''واقعی اس وقت تو معجزہ ہی ہوا۔'' جان نے اقرار کیا...... ''ورنہ میں تو بالکل مایوس ہو چکا تھا۔ آؤ اب باہر نکلیں۔ سب لوگ جا چکے ہیں۔'' گیٹ پر اب چند ہی آدمی دکھائی دے رہے تھے۔ پیٹر اور جان نے اپنے اپنے ٹکٹ دکھائے اور شہر میں داخل ہو گئے۔ بارش اور تیز ہو گئی۔ مجبوراً انہیں سٹیشن کے قریب ایک شکستہ عمارت کے برآمدے میں پناہ لینا پڑی۔ سٹیشن پر اتحادی طیاروں نے دل کھول کر بمباری کی تھی۔ سڑکیں ٹوٹی ہوئی تھیں اور عمارتیں ٹوٹی پھوٹی۔ شہر میں بجلی کا نظام بھی معطل تھا اس لیے چاروں طرف تاریکی کا راج تھا۔ بارش کے ساتھ طوفانی ہوا چل رہی تھی جس نے چند ہی منٹ میں جان اور پیٹر کا جسم سن کر کے رکھ دیا۔

''خدا کے لیے کوئی پناہ گاہ ڈھونڈو ورنہ میں تو مر جاؤں گا۔'' پیٹر کپکپاتی آواز میں بولا: ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں رات کو کرفیو لگتا ہے۔ اور ہم ویسے بھی اجنبی اور غیر ملکی ہیں۔ آدھی رات سے پہلے پہلے ہمیں کسی ہوٹل یا کسی محفوظ مقام پر چلے جانا چاہئے۔''

''ٹھیک ہے۔'' جان نے کہا: ''مگر یہ تو سوچو کہ آج ہفتہ ہے۔ ہوٹل میں جگہ بمشکل ہی مل سکے گی۔ کیوں نہ سٹیشن کے ویٹنگ روم میں ڈیرہ جمایا جائے۔''

''خدا کی پناہ۔'' پیٹر کے منہ سے بے اختیار نکلا: ''تم تو پاگل ہو گئے ہو۔ ویٹنگ روم سے زیادہ خطرناک جگہ تو سارے شہر میں کوئی اور نہ ہو گی۔ پولیس والے رات کو ہر دو تین گھنٹے کے بعد ویٹنگ روم کی ضرور چیکنگ کریں گے۔ اس سے تو یہی بہتر ہے کہ ہم خود ہی پولیس سٹیشن پہنچ کر اپنے آپ کو ان کے سپرد کر دیں۔'' بارش ذرا تھمی تو وہ دونوں باہر نکلے اور شہر میں گھومنے لگے۔ جگہ جگہ ملبے کے ڈھیر لگے تھے اور بہت سے مکانات جنہیں بمباری سے سخت نقصان پہنچا تھا' خالی پڑے تھے۔ انہوں نے طے کیا کہ کسی مکان میں پناہ لی جائے' مگر پھر خیال آیا کہ اگر کسی نے دیکھ لیا تو وہ یہ سمجھے گا کہ چوری کی نیت سے داخل ہوئے تھے اور جنگ کے زمانے میں قانون یہ تھا کہ جو شخص

چوری اور ڈاکے کی نیت سے پکڑا جائے اسے فوراً گولی مار دو۔ وہ ہر مکان میں جھانکتے' ادھر ادھر دیکھتے' آگے چلے جا رہے تھے۔ تاریکی اس قدر تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا اور راہ میں قدم قدم پر بارش کے پانی اور کیچڑ سے سابقہ پڑ رہا تھا۔ ''توبہ' توبہ۔ لندن میں بھی ایسا اندھیرا کبھی نہیں دیکھا۔'' جان تنگ آ کر بڑبڑایا۔

اب وہ شہر کے مرکزی حصے میں پہنچ چکے تھے۔ جہاں کئی ہوٹل دکھائی دیئے' مگر کسی ہوٹل میں انہیں جگہ نہ ملی۔ بارش' تھکن اور سردی کے ہاتھوں اب وہ اتنا عاجز آ چکے تھے کہ زندگی سے بھی بیزار تھے۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کدھر جائیں۔ انہیں ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ جونہی کسی نے انہیں مشکوک سمجھا' وہ پولیس کی حراست میں ہوں گے اور اس کے بعد جو سلوک ہو گا وہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے سائے سے بھی بدکتے تھے۔ آخر انہوں نے طے کیا کہ شہر سے باہر نکل کر رات گزارنے کی کوئی جگہ تلاش کرنی چاہیے۔ اب سوال یہ تھا کہ وہ کس سمت میں جائیں۔ پیٹر نے ایک جگہ رک کر اپنی جیب سے قطب نما نکالی اور ٹارچ کی روشنی میں اسے دیکھا۔

''ہمارے سامنے صرف جنوب کی طرف کا راستہ کھلا ہے۔ شمال' مشرق اور مغرب میں سمندر ہے۔'' اب وہ جس سڑک پر چل رہے تھے وہ کنکریٹ کی بنی ہوئی پختہ اور وسیع سڑک تھی جس کے ایک جانب دور تک قبرستان چلا گیا تھا اور ایک جانب کوئی بڑی سی عمارت تھی۔

''اگر ہمیں سونے کی جگہ نہ ملی تو پھر یہ قبرستان ہی مناسب رہے گا۔'' جان نے کہا۔

''مگر ہم اس میں داخل نہیں ہو سکتے' کیونکہ اس کا دروازہ مقفل ہو گا۔'' پیٹر کا جواب تھا۔

''ہم دیوار پھاند لیں گے۔''

''اور اگر کسی نے دیکھ لیا تب؟ نہ بابا' میں یہ خطرہ مول لینے کو تیار نہیں اور پھر قبرستان میں ہم کہاں سوئیں گے؟''

چلتے چلتے وہ کافی دور نکل گئے' یہاں تک کہ کوارٹر نما مکانوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا' لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ کسی طرف کوئی آدمی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ''میرا خیال ہے کہ اس علاقے میں ہر شام ہی کرفیو لگ جاتا ہو گا۔'' جان بولا۔ ''ذرا گھڑی میں دیکھو اب کیا بجا ہے؟''

''ساڑھے گیارہ بج رہے ہیں۔'' پیٹر نے کہا۔ وہ چلتے رہے۔ اتنے میں آسمان پر پھر بادل گرجے بجلی کڑکنے لگی اور بارش شروع ہو گئی...... وہ بھیگ جانے کے خوف سے بھاگنے لگے۔ دفعتہً پیٹر کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی اور اس نے جان کو رکنے کا اشارہ کیا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ کوئی ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر ایک فوجی سپاہی اپنے بھاری بوٹوں سے سڑک کو کوٹتا ہوا انہی کی طرف چلا آ رہا تھا۔ سپاہی نے یقیناً انہیں دیکھ لیا تھا کیونکہ اگلے ہی لمحے اس کے بوٹوں کی آواز تیز ہو گئی۔

''آؤ واپس بھاگ چلیں۔'' پیٹر نے گھبرا کر کہا۔

''نہیں' اب بھاگنا فضول ہے۔ وہ ہمیں دیکھ چکا ہے۔ دیکھو اپنے اوسان برقرار رکھو۔ میں اب فرانسیسی بولنا شروع کرتا ہوں اور تم یوں جواب دو جیسے لڑ رہے ہو۔'' یہ کہتے ہی جان نے اونچے لہجے میں گفتگو شروع کر دی۔

❁ ❁ ❁

پیٹر اور جان آپس میں فرانسیسی زبان میں مصنوعی طور پر لڑتے جھگڑتے آگے بڑھے۔ سپاہی نے اب اپنی رفتار تیز کر دی تھی اور وہ ان کے قریب آتا جا رہا تھا۔ پیٹر نے آہستہ سے پوچھا: ''اگر وہ پوچھے اس وقت ہم کہاں جا رہے ہیں تو کیا جواب دو گے؟'' جان نے جواب دیا: ''کہہ دیں گے ہم اپنے چند دوستوں سے ملنے ادھر آئے ہیں' وہ اسی علاقے میں رہتے ہیں۔'' اتنی دیر میں جرمن سپاہی ان کے قریب پہنچ چکا تھا۔

ان دونوں کی زبانی جنگ اب عروج پر تھی۔ جان کندھے اور بازو ہلا ہلا کر نہایت پرجوش لہجے میں اول فول بک رہا تھا۔ انہوں نے یہ ظاہر کیا کہ سپاہی کو دیکھا تک نہیں۔ سپاہی نے انہیں گھور کر دیکھا اور رک گیا۔ یہ دونوں جلدی جلدی آگے نکل گئے۔ تھوڑی دور جا کر جان نے یونہی پیچھے پلٹ کر دیکھا تو سپاہی اب بھی وہاں کھڑا ہوا انہیں دیکھ رہا تھا۔ شاید وہ یہ سوچ رہا تھا کہ ان کا تعاقب کرے یا نہ کرے۔

''یار غضب ہو گیا' سپاہی کو ضرور شک ہو گیا ہے۔ وہ بس ہمارے پیچھے آنے ہی والا ہے۔ جلدی سے نکل چلو۔'' یہ کہتے ہی وہ دونوں دوڑ پڑے اور ایک قریبی گلی میں گھس گئے جہاں گھپ اندھیرا تھا۔ پھر انہوں نے سپاہی کے بھاری بوٹوں کی مدھم آواز سنی جو لمحہ بہ لمحہ قریب آ رہی تھی۔ یہ دونوں بھاگتے ہوئے گلی کے آخری سرے تک چلے گئے۔ ان کے سانس پھول گئے تھے اور دل دھک دھک کر رہا تھا۔ وائے بدنصیبی کہ گلی آگے بند تھی۔ اب کیا کریں؟ کدھر جائیں؟ وہ بدحواسی کے عالم میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے گرد و پیش کو گھورنے لگے۔ یکایک کسی مکان کی ڈیوڑھی میں سے کتا بھونکا اور وہ لرز گئے۔

سپاہی شاید گلی کے نکڑ پر ہی رک گیا تھا اور جونہی پیٹر نے ٹارچ روشن کی' سپاہی دور فاصلے پر انہیں کھڑا ہوا نظر آیا۔ روشنی میں اس نے دیکھا کہ گلی کو جس دیوار نے بند کیا ہے۔ وہ ایک باغ کی دیوار ہے اور زیادہ اونچی بھی نہیں ہے۔ جان جلدی سے پیٹر کے کندھوں پر کھڑا ہوا اور دیوار پر چڑھ گیا۔ اس نے جھک کر پیٹر کا ہاتھ پکڑا اور سہارا دے کر اسے بھی دیوار پر چڑھا لیا پھر انہوں نے باغ میں چھلانگیں لگا دیں اور ایک جانب کو بھاگ نکلے۔ بارش کے باعث باغ میں پھسلن اس قدر تھی کہ کئی مرتبہ وہ منہ کے بل گرے۔ ان کے کپڑے کیچڑ سے لت پت ہو چکے تھے۔ اس موقع پر اگر وہ پکڑے جاتے تو انہیں چور سمجھ کر عبرت ناک سزا ملنے کا امکان تھا۔

"وہ دیوار پر اکیلا تو چڑھ نہیں سکتا۔" جان نے ہانپتے ہوئے کہا: "اس لیے ضرور سڑک سے ادھر آئے گا۔"

"کیوں نہ ہم واپس ہو جائیں' مجھے یقین ہے کہ وہ اب وہاں نہیں ہو گا۔" پیٹر نے کہا۔ وہ وہاں سے پلٹ آئے اور دیوار کے قریب آ گئے۔ ایک مرتبہ پھر جان نے پیٹر کے کندھوں پر کھڑے ہو کر گلی میں جھانکا۔ اب اس کی آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہو چکی تھیں۔ گلی میں دور دور تک سناٹا پھیلا ہوا تھا اور کوئی متنفس دکھائی نہ دیتا تھا۔ وہ دونوں آہستہ سے گلی میں کود گئے اور دبے پاؤں باہر سڑک پر نکل آئے۔ سپاہی خدا جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ اندھیرے میں وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتے رہے۔ "خدا اس کمبخت پر اپنی لعنتیں نازل کرے۔ خواہ مخواہ ہمیں پریشان کیا۔" جان غصے سے بڑبڑایا اور پھر ہنس پڑا۔

اب پھر ان کے سامنے وہی مسئلہ تھا۔ جس نے ایک روز پہلے ان سے کرسٹین کی گلیوں اور بازاروں کی خاک چھنوائی تھی۔ تھکن اور نیند کے مارے ان کا برا حال تھا۔ کپڑے سب کیچڑ میں لت پت تھے۔ خدا کی وسیع و عریض سرزمین پر' جہاں کروڑوں انسان بستے ہیں' یہ دو ذی روح ایسے تھے جن کے مقدر میں آرام نہ تھا اور نہ انہیں کہیں پناہ ملتی تھی۔

چلتے چلتے وہ ایک ایسے مقام پر پہنچے جہاں اکا دکا مکان دکھائی دیتا تھا۔ اور پھر انہوں نے یہاں ایک زیرزمین پناہ گاہ دیکھی جو غالباً بمباری کے دوران میں پناہ لینے کے لیے بنائی گئی تھی۔ ٹارچ کی روشنی میں اس پناہ گاہ کا معائنہ کرنے سے اندازہ ہوا کہ وہ اس میں پیر پھیلا کر سو سکتے ہیں۔ وہ بے محابا اس میں کود پڑے اور لیٹتے ہیں خواب خرگوش کے مزے لوٹنے لگے۔

سب سے پہلے پیٹر کی آنکھ کھلی۔ اس نے دیکھا کہ ابھی تک اندھیرا ہے اور آسمان

پر تارے ٹمٹما رہے ہیں۔ پھر اس نے ٹارچ روشن کر کے جان کو دیکھا تو وہ یوں میٹھی نیند سو رہا تھا جیسے اپنے گھر کی خواب گاہ میں آرام دہ مسہری پر پڑا ہے۔ گھڑی میں دیکھنے سے پتہ چلا کہ صبح کے پونے چھ بج چکے ہیں۔ وہ خندق سے باہر نکلا۔ رات بارش ہوئی تھی۔ اور اس پناہ گاہ کے اوپر ٹین کی چھت نہ ہوتی تو وہ ضرور بھیگ جاتے۔ اس نے چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ ہر شے پرسکون اور محوخواب تھی۔ البتہ کافی فاصلے سے ریل گاڑی کے چلنے کی مدھم سی آواز آ رہی تھی۔ چھک...... چھک...... چھک...... چھک...... وہ دیر تک آواز سنتا رہا۔

یکا یک قریب ہی کسی مکان سے مرغ نے بلند آواز سے آمدِ صبح کا اعلان کیا۔ اس نے اپنی حالت کا جائزہ لیا۔ ہاتھ پاؤں اور کپڑے کیچڑ سے سنے ہوئے تھے جو اب خشک ہو چکی تھی۔ چہرے پر ہاتھ پھیرا تو داڑھی کے سخت بالوں کا احساس ہوا۔ وہ سوچنے لگا تین کام کرنے ہیں: پیٹ کی آگ بجھانے کا انتظام' جسم اور کپڑے صاف کرنے کا مرحلہ' اور داڑھی مونڈھنا۔ رات کو اس نے سونے سے پیشتر ایک چھوٹا سا ٹین کا ڈبہ باہر رکھ دیا تھا جس میں بارش کا پانی جمع ہو چکا تھا۔ پیٹر نے تھیلے میں سے جو کے ستوؤں کا ڈبہ نکالا اور اس میں سے تھوڑے سے ستو لے کر پانی میں گھول دیئے۔ اس کے بعد اس نے جان کو جگایا۔ دونوں نے جلدی جلدی ستو پیئے اور وہاں سے اپنا سامان سمیٹ کر باہر نکل آئے۔ جہاں تک ممکن ہو سکا انہوں نے اپنے خشک کپڑوں سے خشک کیچڑ بھی جھاڑی اور ہاتھ منہ صاف کیا۔ انہیں خوف یہ تھا کہ اگر کسی نے انہیں خندق کے اندر دیکھ لیا تو سارا کھیل بگڑ جائے گا۔ وہ جلد از جلد اس مقام سے دور ہٹ جانا چاہتے تھے۔

اب ایک مرتبہ پھر وہ گلی کوچوں سے گزرتے ہوئے شہر کے مرکز میں پہنچ گئے۔ لوگ اپنی ضروریات کے لیے باہر نکل آئے تھے اور شہر میں زندگی کی ہل چل شروع ہو چکی تھی۔ پیٹر نے جان سے کہا:

''اگر ہمیں آج بھی رات بسر کرنے کی معقول جگہ نہ ملی تو اسی خندق میں پڑ رہیں گے۔''

''شاید۔'' جان نے جواب دیا۔ مگر مجھے یقین ہے کہ ہم یہاں سے آج ہی کسی نہ کسی جہاز پر سوار ہو کر نکل چلیں گے۔'' انہوں نے فیصلہ کیا کہ اب یہاں سے سیدھے گودی پر چلنا چاہیے۔ ممکن ہے یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ مل جائے۔ جب وہ بندرگاہ پر پہنچے تو وہاں کئی جہاز لنگر انداز تھے۔ یہ سب کے سب جنگی جہاز تھے اور ان پر نازی جھنڈے لہرا رہے تھے۔ ان جرمن جہازوں سے ذرا ہٹ کر دوسرے کئی جہاز بھی بندرگاہ میں کھڑے تھے' مگر ان پر جھنڈا نہ تھا۔ اس لیے معلوم نہ ہو سکتا تھا کہ آیا وہ بھی جرمن جہاز ہیں یا کسی اور غیر جانبدار ملک کے ہیں۔ انہوں نے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پوری بندرگاہ کا چکر لگایا' مگر وہ خاص جہاز جس پر سوار ہو کر وہ اپنے وطن یا کسی غیر جانبدار ملک میں پہنچ جانے کا تصور باندھے ہوئے تھے' انہیں دکھائی نہ دیا۔ ان کے چہرے مایوسی سے لٹک گئے اور وہ ایک جگہ رک کر سوچنے لگے کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ ٹرین سے سفر کرنا اب نہایت مشکل تھا۔ کیونکہ اس میں صریحاً جان کا خطرہ تھا۔ ان کے جعلی کاغذات کسی وقت بھی شناخت کئے جا سکتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اگر سویڈن کا کوئی جہاز مل جائے تو اس میں سوار ہو جائیں۔ نہایت مایوسی اور افسردگی کے عالم میں وہ شہر کی طرف واپس ہوئے۔ ان کا خیال تھا کہ ایک بار پھر شہر کے ہوٹلوں میں قیام کے لیے جگہ کی تلاش کی جائے تا کہ وہ اطمینان سے اپنے بھاگ نکلنے کا منصوبہ تیار کر سکیں۔ لیکن تین گھنٹے کی مسلسل آوارہ گردی اور شہر کے ہر چھوٹے بڑے ہوٹل میں گھومنے پھرنے کے بعد بھی انہیں کوئی ایسی جگہ نہ مل سکی جسے وہ اپنے ''ہیڈ کوارٹر'' کے طور پر استعمال کر سکتے۔ آخر وہ بندرگاہ کی طرف پلٹے۔ بارہا انہوں نے ارادہ کیا کہ کسی ملاح سے معلومات حاصل کریں۔ مگر ان کے منہ سے بات ہی نہ نکلتی تھی۔ موقع ہی ایسا

تھا کہ کسی پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بندرگاہ پر کام کرنے والے بہت سے مزدور اور جہازوں کے ادنیٰ کارکن ادھر ادھر پھر رہے تھے۔ ان میں مختلف قوموں کے لوگ تھے۔ پولینڈ، یوکرائن اور لتھونیا کے باشندے زیادہ تعداد میں تھے۔ اور وہیں انہوں نے فرانسیسی جنگی قیدیوں کو بھی دیکھا جو مسلح فوجی سپاہیوں کی نگرانی میں کام کر رہے تھے۔ ان فرانسیسی قیدیوں میں سے اکثر نے اپنی فوجی وردیاں پہن رکھی تھیں اور بعض شہری کپڑوں میں تھے۔ آخر ایک مقام پر انہوں نے بہت سے دبلے پتلے آدمیوں کو دیکھا جو پھٹے پرانے کپڑوں میں ایک جگہ جمع تھے۔ یہ سب کے سب روسی قیدی تھے۔ غالباً انہیں کئی دنوں سے بھوکا رکھا گیا تھا جس کے باعث ان کے جسم کی ایک ایک ہڈی صاف نظر آ رہی تھی۔ اب بھی ان سے بوجھ اٹھوانے کی مشقت لی جا رہی تھی۔ انہیں دیکھ کر رومیوں کا وہ بدترین دور یاد آتا تھا' جب وہ اپنے جنگی قیدیوں سے سالہا سال تک غلاموں کی طرح کام لیتے تھے۔

یہ دونوں ایک جانب کھڑے سوچنے لگے کہ کیا کیا جائے پیٹر مصر تھا کہ موقع پا کر کسی فرانسیسی مزدور سے بات کی جائے لیکن جان کہتا تھا کہ نہیں یہ بہت بڑا خطرہ مول لینے والی بات ہے۔ یہاں چپے چپے پر گستاپو کے آدمی ہوں گے۔ ان سے بچنا آسان کام نہیں۔ پیٹر کا اصرار یہی تھا کہ اب خطرہ مول لیے بغیر چارہ نہیں...... اسی بحث میں انہوں نے کافی وقت گزار دیا۔ جب سورج غروب ہونے لگا تو بندرگاہ پر کام کرنے والے جنگی قیدیوں کو واپس جانے کا حکم دیا گیا۔ اور مسلح جرمن سپاہی انہیں اپنی نگرانی میں لیے ہوئے گودی سے باہر نکلے اور ٹرکوں پر لاد لاد کر لے گئے۔ ان جنگی قیدیوں کے باہر جانے کے بعد بھی بہت سے مزدور وہاں باقی رہ گئے تھے۔ شاید ان سے رات کو بھی کام لیا جانے والا تھا۔ ان میں فرانسیسی بھی تھے۔ چنانچہ جان اور پیٹر نے فیصلہ کیا کہ وہ ان کے کسی ایک آدمی سے ضرور بات کریں گے۔ کافی دیر تک وہ موقع کی تلاش میں ادھر

ادھر گھومتے رہے۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ کبھی کوئی مزدور ضرور گھومتا ہوا ان کے قریب سے بھی نکل جاتا ہے۔

انہیں ڈیڑھ گھنٹہ اور انتظار کرنا پڑا۔ وہ چاہتے تھے کہ جب تاریکی ذرا اور گہری ہو جائے' تو وہ کسی شخص کو اپنی طرف متوجہ کریں۔ انہوں نے یہ پہلے ہی سے طے کر لیا تھا کہ وہ اس شخص کو ساتھ لے کر گودی سے ذرا دور چلے جائیں گے اور اگر اس نے شور مچانے کی کوشش کی تو اس کا گلا وہیں گھونٹ دیا جائے گا کیونکہ یہ عین ممکن تھا کہ وہ فرانسیسی مزدور انہیں جرمن جاسوس سمجھ لیتا۔ آخر انہوں نے ایک ادھیڑ عمر فرانسیسی مزدور کو دیکھا جو لڑکھڑاتا ہوا انہی کی طرف آ رہا تھا۔ جان نے پیٹر کو ایک طرف چھپ جانے کا اشارہ کیا اور خود ٹہلتا ہوا اس مزدور کی طرف بڑھا اور اسے بازو سے پکڑ کر ایک جانب لے گیا۔ پھر پیٹر کو ان کی آواز سنائی دی۔ وہ فرانسیسی بول رہے تھے۔ پیٹر کا دل ایک بار پھر دھڑکا۔ وہ دعا مانگنے لگا کہ جان اپنی مہم میں کامیاب ہو جائے۔ وہ انتظار نہ کر سکا اور فوراً ہی ان کے قریب پہنچ گیا۔ جان نے جلدی سے پیٹر کا تعارف اس سے کرایا۔ فرانسیسی شخص نے مسکراتے ہوئے پیٹر کی پیٹھ تھپکی' کچھ کہا اور پھر ادھر ادھر دیکھ کر جلدی سے ایک جانب کو چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد پیٹر نے جان سے پوچھا: ''یہ کیا کہتا تھا؟''

''میں نے اپنے بارے میں اسے صحیح بات تو نہیں بتائی۔'' جان بولا: ''مگر میرا خیال ہے کہ وہ سمجھ ضرور گیا ہے۔ اس نے مجھے ایک ہوٹل کا پتہ بتایا ہے۔ شوبل ہوٹل...... اور یقین دلایا ہے کہ وہاں قیام کا انتظام ہو جائے گا مگر اس کے ساتھ ہی شرط بھی ہے کہ اس ہوٹل میں دو دن سے زیادہ عرصہ ٹھہرنا خطرناک ہو گا۔ کیونکہ ہوٹل والے تمہارے شناختی کاغذات کی تصدیق کریں گے اور پولیس کو اطلاع بھی دیں گے۔ بتاؤ اب کیا ارادہ ہے؟

''میری صلاح کیا پوچھتے ہو۔'' پیٹر کہنے لگا: ''اب معاملہ خدا پر چھوڑیں اور چلیں۔ یہ ہوٹل ہے کس طرف؟''

''وہ کہتا تھا یہیں گودی کے قریب ہی ہے۔ جگہ تو کچھ اچھی نہیں مگر سستا ضرور ہے۔''

شوبل ہوٹل کے جرمن مالک نے نہایت خندہ پیشانی سے ان کا استقبال کیا۔ جان نے جرمن زبان میں اس سے کچھ کہا تو اس نے میز کی دراز سے نیلے رنگ کے فارم نکالے اور جان کی طرف بڑھا دیئے۔ نام' تاریخ' پیدائش اور ملازمت وغیرہ کے خانے پر کرنے کے بعد یہ فارم ہوٹل کے مالک کو واپس کر دیئے گئے۔ جس نے ان کا بغور معائنہ کیا اور پھر ان دونوں سے شناختی کاغذات اور سفر کرنے کا سرکاری اجازت نامہ طلب کیا گیا۔ جعلی کاغذات جیب سے نکالتے وقت جان اور پیٹر کے ہاتھ اگرچہ کانپ رہے تھے مگر انہوں نے جلد ہی گھبراہٹ پر قابو پا لیا۔ ہوٹل کے مالک نے ان کاغذات پر سرسری نظر ڈالی' اپنی ایک مخصوص رجسٹر کی فہرست سے ان کا مقابلہ کیا اور پھر گویا مطمئن ہو کر یہ کاغذات انہیں واپس لوٹا دیئے۔ اس کے بعد انہوں نے کمرے کا کرایہ پیشگی ادا کیا اور چابی حاصل کر لی۔

نہانے' شیو بنانے' کپڑے دھونے اور کھانے کے بعد انہوں نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا اور بستر پر ایک نقشہ پھیلا کر غور و فکر کرنے لگے کہ فرار کی کونسی راہ اختیار کی جائے۔ یہ نقشہ اسی شہر کا تھا جو انہیں غسل خانے کی دیوار سے لٹکا ہوا ملا تھا۔

''یہ دیکھو...... یہ ہے فری ہافن...... اگر ہم ریلوے سٹیشن سے دوسرا پل عبور کر لیں تو یہ راستہ سیدھا یہاں تک آتا ہے۔'' جان نے پیٹر کو سمجھایا۔ ''اور مجھے یقین ہے کہ سویڈن کا کوئی نہ کوئی جہاز یہاں ہو گا۔ آج صبح ہم جس گودی پر دھکے کھاتے پھر رہے تھے' وہاں ہمارا مقصد پورا نہیں ہو گا۔ وہ غلط جگہ ہے۔ اور فرض کرو اگر ہمیں فری ہافن کی

گودی پر بھی موقع نہ ملا تو ہم رائیر واڈر سٹیشن چلے جائیں گے وہاں کوئی نہ کوئی موٹر بوٹ ضرور مل جائے گی۔ آؤ اب زیادہ فکر مت کرو اور سو جاؤ۔ منہ اندھیرے ہی ہمیں فری ہافن جانا ہے۔''

جنگی کیمپ سے فرار ہونے کے بعد وہ پہلی رات تھی جو انہوں نے نہایت سکون اور میٹھی نیند کے مزے لے کر گزاری۔ وہ اب اپنے آپ کو تر و تازہ اور پہلے سے کہیں زیادہ ''بیدار مغز'' محسوس کرنے لگے۔ اور انہیں یہ احساس ضرور تھا کہ کوئی نادیدہ مہربان قوت ہے جو انہیں ہر آفت سے بچاتی منزل مقصود کی جانب کھینچے لے جا رہی ہے۔

جب وہ صبح سویرے فری ہافن کی گودی پر پہنچے تو یہ دیکھ کر سخت مایوس ہوئے کہ گودی کے گرد اٹھارہ فٹ اونچی خاردار تاروں کی ایک دیوار کھنچی ہوئی ہے اور جا بجا لکڑی کے دروازوں پر مسلح پہریدار چوکس کھڑے ہیں۔ بالکل یوں معلوم ہوتا تھا جیسے یہ بھی کوئی جنگی قیدیوں کا کیمپ ہے۔ وہ گودی کے بیرونی حصے میں گھومتے رہے۔ دور سمندر میں بہت سے بحری جہاز کھڑے تھے۔ یکا یک جان نے پیٹر کا بازو تھام لیا اور آہستہ سے کہا:

''وہ دیکھو...... غالباً وہ جہاز سویڈن کا ہے۔''

''ہاں جہاز تو بے شک سویڈن کا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس زبردست پہرے کی موجودگی میں ہم اس تک کیسے پہنچ سکتے ہیں۔''

جان کی پیشانی پر غور و فکر کی گہری شکنیں نمودار ہوئیں۔ ''واقعی یہ ٹیڑھی کھیر ہے۔ بہر حال کوشش تو کرنی چاہئے۔ پھر خدا کو جو منظور ہو۔ ہم رات کو دوبارہ یہاں آئیں گے۔''

''اور اگر ہمارے آنے سے پہلے ہی جہاز یہاں سے چل دیا تو؟'' پیٹر نے کہا۔

''پھر کوئی اور راستہ نکالیں گے۔'' جان نے جواب دیا' آؤ اب شہر کی طرف چلتے ہیں۔''

دوپہر کا وقت انہوں نے فلم دیکھنے میں گزارا اور جب شام کے سائے ڈھلنے لگے تو وہ ایک بار پھر فری ہافن کی گودی میں پہنچ گئے۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک گھوم کر انہوں نے اس دیوار کا جائزہ لیا جو خاردار تاروں کی صورت میں گودی کی حفاظت کے لئے کھڑی کی گئی تھی۔ انہوں نے دیکھا کہ پہرے دینے والے سنتریوں کی تعداد دن کے مقابلے میں نصف رہ گئی ہے۔ یہ پہرے دار رائفلیں کندھوں سے لٹکائے اپنی حدود میں ادھر سے ادھر چکر لگا رہے تھے۔ پیٹر اور جان کو جلد ہی ایک ایسی جگہ دکھائی دی جہاں سے وہ پہرے دار کی نظر بچا کر لوہے کے خاردار تاروں کی یہ باڑ پھلانگ سکتے تھے۔ یہ تار ایک دوسرے کے اس قدر قریب لگے ہوئے تھے کہ ان کے درمیان میں سے نکلنا محال تھا۔ البتہ لکڑی کے ستون پر چڑھ کر دوسری جانب آسانی سے اترا جا سکتا تھا۔ اور یہ کام نہایت ہی خطرناک تھا۔

اس مقام سے پہریدار کوئی ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھا اور بائیں کندھے پر رائفل لٹکائے نہایت چستی سے گشت کر رہا تھا۔ انہوں نے اندازہ کیا کہ پہرے دار سنتری جب ان کی جانب پیٹھ موڑ کر دوسری طرف جاتا ہے اور واپس آتا ہے تو اسے تین منٹ لگتے ہیں...... بس یہ دو تین منٹ ہی ان کی جانیں بچا سکتے تھے یا انہیں موت کے منہ میں دھکیل سکتے تھے۔

گودی پر ایک وحشت انگیز سناٹا چھایا ہوا تھا۔ البتہ کبھی کبھی کسی پہریدار یا کتے کے بھونکنے کی آواز اس خاموشی کو توڑتی ہوئی نکل جاتی تھی۔ باڑ کے اندر لگے ہوئے لکڑی کے ستونوں پر بجلی کے بلب روشن تھے۔ جب سنتری پیٹھ موڑ کر دوسری طرف چلا تو جان پھرتی سے لکڑی کے ستون پر چڑھنے لگا۔ سہارے کے لیے وہ تار پکڑتا جاتا تھا۔ دس گیارہ فٹ اونچا ہی چڑھا تھا کہ اس کا دایاں ہاتھ کانٹوں سے لہولہان ہو گیا۔ پہرے دار سنتری اب اپنی گشت کے آخری مقام پر پہنچ کر واپس آنے ہی والا تھا۔ پیٹر نیچے کھڑا

اپنے ساتھی کی مسلسل ہمت بندھا رہا تھا۔ آخر جان پوری طاقت کے ساتھ باڑ کے آخری سرے پر پہنچ گیا اور لکڑی کے ستون پر تیزی سے پھسل کر دوسری جانب جا گرا۔ پھر اس نے پیٹر کو ہلکے سے آواز دی کہ آ جاؤ' لیکن پیٹر کو وہیں دبک کر چار منٹ تک انتظار کرنا پڑا۔ پہرے دار اس سے کوئی دس فٹ کے فاصل تک ٹہلتا ہوا آیا اور واپس مڑ گیا۔ اور جب وہ کچھ فاصلے پر چلا گیا تو پیٹر جلد جلد ستون پر چڑھنے لگا۔ کئی بار بدحواسی میں اس کے ہاتھ پھسلے اور قمیض کی آستین کانٹوں سے الجھ گئی۔ مگر جوں توں کر کے وہ آخری حد تک جا پہنچا اور پھر آہستہ سے' دوسری جانب اتر گیا۔

پھر وہ پنجوں کے بل چلتے ہوئے گودی کی جانب بڑھے جہاں سمندر کی پرسکون اور خاموش لہروں پر بہت سے جنگی جہاز ساکت وساکن کھڑے تھے اور ان میں سے روشنی کی ہلکی سی کرن بھی دکھائی دیتی تھی جب وہ نزدیک پہنچے تو یہ دیکھ کر دونوں کے دل دھک سے رہ گئے کہ سویڈن کا جہاز وہاں نہ تھا۔ پہلے پہل انہیں یہ خیال آیا کہ شاید وہ غلط جگہ پر آ گئے ہیں' مگر نہیں' یہ وہی مقام تھا جس کا جائزہ وہ دن میں لے کر گئے تھے۔ سویڈش جہاز کے قریب ہی دن کے وقت انہوں نے ایک بہت بڑے جرمن جہاز کو دیکھا تھا اور وہ جرمن جہاز اب بھی وہاں کھڑا تھا۔ گودی کے اس حصے میں اگرچہ کوئی پہرے دار نہ تھا تاہم ان کا زیادہ دیر یہاں ٹھہرنا سخت خطرناک تھا۔ کیا معلوم کب اور کدھر سے گولی سنسناتی ہوئی آئے اور انہیں ڈھیر کر دے۔ پیٹر نے واپسی کا ارادہ کیا مگر جان کہنے لگا۔

''دوست مرنا جینا خدا کے ہاتھ میں ہے' اب جان ہتھیلی پر رکھ کر یہاں آئے ہیں تو کچھ کر کے ہی جائیں گے۔ آؤ ذرا ان جہازوں کے نام تو پڑھیں۔ ممکن ہے ان میں سویڈن یا کسی اور غیر جانبدار ملک کا کوئی جہاز دکھائی دے دے۔'' گھپ اندھیرا ہونے کے باعث وہ جہازوں پر لکھے ہوئے نام نہ پڑھ سکے۔ آخر انہیں اپنی ٹارچ استعمال کرنی ہی پڑی۔ اور پھر وہ باری باری ہر پشتے پر جا کر جہازوں کو دیکھنے لگے۔ ابھی وہ تیسرے پشتے

کے سرے پر پہنچے ہی تھے کہ سامنے سے دفعتۃً روشنی کا ایک جھپاکا سا ہوا۔ اس پر سب سے پہلے پیٹر کی نظر پڑی اور وہ دہشت زدہ ہو کر چلایا:

''غضب ہو گیا۔ انہوں نے ہمیں دیکھ لیا ہے۔''

اتنے میں گودی میں چاروں طرف سیٹیاں بجنے لگیں اور آناً فاناً سرچ لائیٹس سے سارا سمندر جگمگا اٹھا۔ جان نے پیٹر کا ہاتھ پکڑا اور اندھا دھند اس طرف بھاگا جدھر سے وہ آئے تھے۔ دائیں بائیں بھاگتے ہوئے وہ خدا جانے کس طرف جا نکلے۔ سنتریوں کے چلانے اور ایک دوسرے کو آوازیں دینے سے گودی میں عجیب ہنگامہ سا برپا ہو چکا تھا۔ یکا یک ایک جگہ انہیں ٹین کے بڑے بڑے ڈرم رکھے ہوئے دکھائی دیئے اور دونوں ان کے درمیان گھس کر چھپ گئے۔ ان کا سانس پھول چکا تھا' ہاتھ پیر سنسنا رہے تھے اور سارا جسم پسینے سے تر تھا۔ اتنے میں کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ یہ آوازیں لحہ بہ لحہ قریب آ رہی تھیں۔

''وہ ہمیں تلاش کر رہے ہیں۔ اب ایک ہی راستہ ہے کہ ہم کسی نہ کسی طرح ان کی نگاہوں سے بچ کر سمندر میں چھلانگیں لگا دیں اور کسی جہاز میں جا کر چھپ جائیں ورنہ......''

وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ پیٹر نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

''ذرا سننا کوئی ادھر آ رہا ہے۔'' وہ دونوں سانس روکے آنے والے کے قدموں کی چاپ سننے لگے۔ وہ پہریدار تھا جس کے بھاری بوٹوں کی آواز گودی کے سخت فرش پر گونج پیدا کرتی ہوئی آہستہ آہستہ ان کے قریب آ رہی تھی۔ انہوں نے ٹین کے ڈرم کے پیچھے سے جھانک کر دیکھا تو ایک سنتری ہاتھ میں لالٹین لیے اور کندھے پر رائفل لٹکائے انہی کی طرف چلا آ رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ لالٹین کو سر سے اونچی کر کے اپنے گرد و

پیش کا جائزہ لے لیتا اور پھر آگے چل پڑتا۔ اس کے پیچھے ایک کتا بھی تھا۔ ممکن ہے عام حالات میں یہ دونوں ہٹے کٹے برطانوی افسر اس اکیلے جرمن سپاہی سے خوف نہ کھاتے۔ مگر اب وہ بالکل نہتے تھے۔ دشمن کے آدمی انہیں دیکھ چکے تھے اور فرار کی کوئی راہ دکھائی نہ دیتی تھی۔

نہایت اضطراب اور بدحواسی کے عالم میں انہوں نے ادھر ادھر دیکھا۔ بائیں جانب کچھ فاصلے پر ایک مال گودام تھا۔ ”جلدی کرو اس مال گودام کی طرف بھاگ نکلو۔“ پیٹر نے کہا اور پھر وہ خطرے کی پروا کیے بغیر چاروں ہاتھ پیروں کے بل بندروں کی طرح چلنے لگا۔ یکایک ان کے عقب سے ایک گرجدار آواز بلند ہوئی۔

”ٹھہرو تم کون ہو؟“ وہ رکے نہیں اور سیدھے کھڑے ہو کر مال گودام کی طرف بھاگے۔ انہیں ہر لحہ یہ توقع تھی کہ ابھی گولیوں کی بوچھاڑ شروع ہو جائے گی‘ لیکن ایک بار پھر سنتریوں کے چیخنے، کتوں کے بھونکنے اور سیٹیاں بجنے کی آوازیں بلند ہوئیں اور سرچ لائٹس سے گودی کا ایک ایک گوشہ روشن ہو گیا۔

پیٹر اور جان دونوں ایک دوسرے کے شانہ بشانہ بھاگے جا رہے تھے۔ مال گودام کے قریب سے وہ گزر گئے‘ کیونکہ اس کا دروازہ بند تھا اور اگر دروازہ کھلا بھی ہوتا تو شاید وہ اس میں نہ جاتے۔ اس مال گودام کے ساتھ ہی ایک دوسرا مال گودام تھا اور یہ لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ ان دونوں گوداموں کے درمیان ایک تاریک سی راہداری تھی جس میں کنکریٹ کا بنا ہوا کوئی اٹھارہ انچ اونچا ایک پلیٹ فارم تھا جس پر سے ریل کی آہنی پٹڑی گزرتی تھی پٹڑی سامان لانے اور لیجانے کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ وہ دونوں لپک کر اس کے اندر گھس گئے اور کان لگا کر باہر کی آوازیں سننے لگے۔ گودی پر ایک ہنگامہ برپا تھا۔ غالباً اب بہت سے سپاہی انہیں تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ جرمن زبان میں وہ کرخت گالیاں بکتے اور ایک دوسرے پر سستی اور غفلت کا الزام دیتے ہوئے خوب چلا

رہے تھے۔ کئی بار وہ دوڑتے ہوئے اس طرف بھی آئے جہاں کنکریٹ کے پلیٹ فارم کے نیچے وہ بدنصیب انگریز چھپے ہوئے تھے۔ مگر جرمن سپاہیوں نے جھانک کر نہیں دیکھا۔ آدھے گھنٹے تک گودی میں انہیں تلاش کیا جاتا رہا۔ غالباً سنتریوں نے ایک ایک چپہ چھان مارا اور پھر ان کے قدموں کی چاپ آہستہ آہستہ دور ہوتی گئی۔ پیٹر اور جان بے جان لاشوں کی مانند اس اندھیری قبر میں پڑے رہے تھے۔ انہوں نے کئی بار حرکت کرنے کی کوشش کی مگر ایسا معلوم ہوا جیسے ان کے جسم فالج زدہ ہو چکے ہیں۔ کامل ڈیڑھ گھنٹے تک وہ اسی حالت میں پڑے رہے اور جب ان کی جان میں جان آئی اور حواس بجا ہوئے تو رینگتے ہوئے باہر نکلے۔

گودی پر ایک بار پھر سناٹے کی حکمرانی تھی۔ یہ پراسرار خاموشی انہیں دہشت زدہ کر رہی تھی۔ کئی منٹ تک وہ چپ چاپ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھتے رہے اور جب اطمینان ہو گیا کہ دشمن کا کوئی آدمی قریب نہیں تو وہ پیروں کے بل کھڑے ہوئے۔ آخر جان نے زبان کھولی:

”خدا کی پناہ...... آج موت ہمارے کس قدر قریب آ کر پلٹی ہے۔ آؤ اب اسی راستے سے چلیں جدھر سے آئے تھے۔“

انہیں جلد ہی وہ مقام مل گیا جہاں سے لکڑی کے ستون پر چڑھ کر انہوں نے خاردار باڑ عبور کی تھی۔ پہریدار سنتری بہت دور ٹہل رہا تھا۔ باری باری وہ دونوں ستون پر چڑھے اور خیریت سے دوسری جانب اتر گئے اور پھر تیزی سے چلنے لگے۔ یکایک کسی نے جرمن زبان میں چلا کر پوچھا:

”رک جاؤ...... تم کہاں جا رہے ہو؟“

پیٹر اور جان پتھر کے مجسموں کی مانند اپنی جگہ رک گئے۔ وہ ان پہریدار سنتریوں کے نشانے سے بھی خوب واقف تھے۔ ان کا نشانہ بہت کم خالی جاتا تھا۔

"اپنے ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔" اس مرتبہ آواز ان کے عقب سے آئی۔ ان دونوں نے اپنے ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ کئی منٹ تک وہ اسی طرح کھڑے رہے۔ شاید پیچھے کھڑا ہوا جرمن سپاہی ان کا جائزہ لے رہا تھا۔ یک بیک وہ ان کے سامنے آ کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں ٹامی گن تھی اور چمکتی ہوئی آنکھیں ان دونوں کے چہروں پر گڑی تھیں۔

رائفل کی نالی باری باری جان اور پیٹر کے سینے پر مارتے ہوئے اس نے کرخت لہجے میں کچھ کہا۔ پیٹر تو کچھ نہ سمجھا' البتہ جان نے اپنا دایاں ہاتھ جیب سے نکال کر شناختی کارڈ نکالا اور اس کے حوالے کر دیا۔ پھر اس نے پیٹر کو اشارہ کیا اور پیٹر نے بھی اپنا کاغذ نکال کر اسے دکھایا۔ سنتری نے اپنی رائفل کا رخ اسی کی طرف رکھا۔ چند قدم پیچھے ہٹ کر اپنی پیٹی میں لگی ہوئی برقی ٹارچ روشن کی اور کاغذات کو بغور دیکھا۔ پھر اس نے رائفل نیچے کر لی اور کاغذات انہیں واپس کرتے ہوئے چند فقرے اور کہے۔ جان نے ٹوٹے پھوٹے جرمن لہجے میں اس کا جواب دیا۔ جرمن سپاہی جان کا جواب سن کر زور سے ہنسا اور اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

وہ چپ چاپ چلتے رہے۔ آخر پیٹر نے پوچھا: "وہ کیا کہتا تھا۔"

"شکر کرو اس بار بھی ہم موت کے منہ سے بال بال بچے ہیں۔ میں تو اس کی آواز اور ٹامی گن دیکھ کر ہی زندگی سے مایوس ہو گیا تھا۔ وہ ان پڑھ سپاہی تھا۔ کیونکہ میں نے دیکھ لیا تھا کہ وہ کاغذات الٹے دیکھ رہا تھا۔"

"اس نے تم سے کچھ پوچھا بھی تو تھا؟"

"ہاں۔ وہ پوچھتا تھا کہ یہ گودی کے اندر ابھی ابھی کیا شور و غل برپا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ کوئی سپاہی سمندر میں گر پڑا تھا اور دوسرے لوگ اسے نکالنے کی کوشش کر رہے تھے۔"

* * *

دوسرے روز جب دوپہر کو پیٹر کی آنکھ کھلی تو اس نے جان کو کمرے کے اندر ٹہلتے ہوئے پایا۔ اس کے چہرے پر پریشانی اور تشویش کی علامات ہویدا تھیں۔ پیٹر نے پوچھا: "کیا معاملہ ہے؟" جان نے ایک عجیب داستان سنائی۔

"میں آج علی الصبح اکیلا ہی رائی ہرورڈ کے سٹیشن پر گیا تھا۔ تم اس وقت بے خبر سو رہے تھے۔ میں نے تمہیں جگانا مناسب نہ سمجھا۔ میرے دوست ذرا ہمت کی ضرورت ہے اور اس کے بعد ہم اس منحوس ملک سے باہر ہوں گے۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ آج صبح جب میں گودی کی جانب گیا وہاں فرانسیسی کیمپ کے مزدور کام پر جا رہے تھے۔ میں نے جان پر کھیل کر ایک فرانسیسی نوجوان سے بات کی اور اسے بتایا کہ میں انگریز اور اس طرح فرار ہو کر آیا ہوں اور اب سویڈن جانا چاہتا ہوں۔ کوئی تدبیر بتا سکتے ہو؟ میری اس بات پر وہ شخص پہلے تو مشکوک نگاہوں سے مجھے تکتا رہا۔ پھر کہنے لگا تم رات کے وقت اگر ہمارے کیمپ میں کسی طرح آ سکو تو بھاگ نکلنے کی تدبیر پر غور کیا جا سکتا ہے؟ بڑی مصیبت تو یہ تھی کہ میں اس کا فرانسیسی لہجہ بھی اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا تھا بہرحال اتنا ضرور معلوم ہو گیا کہ اسی کیمپ میں دو ایک آدمی ایسے بھی ہیں جو انگریزی زبان جانتے ہیں اور وہ ان سے میری ملاقات کرا سکتا ہے۔ اس نے پھر مجھے وہ جگہ بھی اشارے سے دکھائی جہاں سے میں رات کو باڑ سے پھلانگ کر کیمپ میں جا سکتا ہوں۔"

"خدا رحم کرے۔" پیٹر کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "کیا ہم ایک مرتبہ پھر موت کے منہ میں جائیں گے؟ کیا بھول گئے کہ گزشتہ رات گولی کا نشانہ بنتے بنتے بچے ہیں۔ میرا خیال ہے کوئی اور تدبیر کرو۔ دیدہ دانستہ اپنے آپ کو موت کے حوالے کرنا کہاں کی دانشمندی ہے۔"

یہ سن کر جان چند منٹ تک پیٹر کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر جذباتی لہجے میں بولا:

"دیکھو' عزیزِ من! اب تو قدم قدم پر انہی خطرات سے کھیلنا پڑے گا۔ میں دیکھتا

ہوں کہ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں، ورنہ ہم یہیں کسی روز کتے کی موت مارے جائیں گے۔ جب موت کا ایک وقت معین ہے، پھر گھبرانا اور خوف کھانا کیسا۔ اس فرانسیسی قیدی نے کہا تھا کہ بات چیت کے لیے کیمپ کے سوا اور کوئی جگہ محفوظ نہیں۔"

"کیمپ کی نگرانی نہیں کی جاتی؟" پیٹر نے جرح کی۔

"پہلے نگرانی دن رات کی جاتی تھی۔ مگر اب چند روز سے یہ پابندیاں نرم کر دی گئی ہیں۔ اب صرف ایک سنتری دروازے پر پہرہ دیتا ہے اور وہی قیدیوں کو باہر نکلنے اور اندر آنے کی اجازت دینے کا اختیار رکھتا ہے اور ویسے بھی مجھے معلوم ہوا ہے کہ فرانسیسیوں پر زیادہ سختی نہیں کی جاتی۔"

"اچھا دوست، جو کچھ تم کہتے ہو، منظور ہے۔ میں آج رات تمہارے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوں۔"

رائی ورڈر کا سٹیشن شہر سے کئی میل دور تھا۔ وہ دونوں سورج غروب ہونے تک وہاں پہنچ گئے۔ کیمپ کے اندر داخل ہونے کے لیے انہیں زیادہ کاوش نہیں کرنی پڑی۔ یہاں سب کے سب فرانسیسی قیدی جمع کیے گئے تھے۔ کیمپ کی باڑ پھلانگتے ہی وہ پہلی بیرک میں گھس گئے۔ جہاں چھ سات فرانسیسی مزدور بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ان دو اجنبیوں کو یوں اچانک آتے دیکھا تو سب کے سب سراسیمہ ہو کر ان کی طرف تکنے لگے۔ اتفاق سے وہ شخص بھی وہاں موجود تھا۔ جس سے صبح جان کی ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے جان کو فوراً پہچان لیا۔ اپنے ساتھیوں سے چند الفاظ کہہ کر انہیں مطمئن کیا اور پھر جان اور پیٹر کو بیٹھنے کا اشارہ کر کے کمرے سے باہر نکل گیا۔

کمرے کے گوشے میں بیٹھنے کے بعد انہوں نے چاروں طرف ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی۔ ماحول تقریباً وہی تھا جو اس سے پہلے وہ سٹیلگ (برلن) کے جنگی کیمپ میں دیکھ چکے تھے۔ البتہ ان کے اردگرد چہرے سب اجنبی اور غیر مانوس تھے۔ فرانسیسی قیدی

حیرت سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔" وہ شخص کہاں چلا گیا؟" پیٹر نے چپکے سے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ وہ اس آدمی کو بلانے گیا ہے جو انگریزی بول سکتا ہے۔" جان نے جواب دیا۔ "اسے اب تک آ جانا چاہئے تھا۔"

اتنے میں وہی فرانسیسی قیدی ایک دوسرے فرانسیسی کے ساتھ آیا اور باتیں شروع ہوئیں۔

اس نے ان کو بتایا کہ وہ کیمپ کا حجام ہے اور دوسرے قیدیوں کے بال کاٹتا ہے۔ جان اور پیٹر کا خیال تھا کہ وہ انگریزی اچھی طرح جانتا ہوگا مگر بات کرنے سے اندازہ ہوا کہ وہ بھی دوسرے فرانسیسیوں کی طرح غلط سلط چند جملے بول سکتا ہے۔ چنانچہ جب جان نے اس سے سویڈن کے جہازوں اور ملاحوں کے بارے میں سوالات کئے تو وہ گونگوں کی مانند ان کے منہ تکنے لگا۔ غالباً وہ ان کا مدعا سمجھ ہی نہ سکا۔ اس دوران میں دوسرے تمام لوگ چپ چاپ بیٹھے ان کی طرف دیکھتے رہے۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کی طرف آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے کرتے رہے۔ ان کے چہروں سے عیاں تھا کہ وہ یہ معاملہ نہایت خطرناک اور پراسرار سمجھتے ہیں۔ فرانسیسی حجام نے کہا: "مجھے بڑی خوشی ہے کہ آپ کیمپ سے فرار ہو جانے میں کامیاب ہو گئے اور اب جہاں تک آپ کو مدد دینے کا تعلق ہے ہم ہر طرح حاضر ہیں۔ لیکن..... اگر جرمن افسروں کو پتہ چل گیا تو وہ ہم میں سے کسی کو زندہ نہ چھوڑیں گے۔" اس صورت حال سے جان اور پیٹر سخت مایوس ہوئے مگر وہ ان پر زیادہ زور بھی تو نہیں دے سکتے تھے۔

کیمپ سے رخصت ہوتے وقت اگرچہ ان کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ مگر دل میں ابھی تک امید کی ہلکی سی کرن باقی تھی۔ فرانسیسی حجام نے انہیں شہر کے ایک ہوٹل کا پتہ بھی بتایا جہاں وہ بوقت ضرورت قیام کے لئے کرایے پر جگہ حاصل کر سکتے تھے۔ تاہم

ایک خیال نے انہیں بے حد مضطرب کر دیا۔ اب ان کے پاس روپیہ بہت تھوڑا رہ گیا تھا۔ جو کچھ اب ان کے پاس تھا' اس سے وہ زیادہ سے زیادہ چار دن اور نکال سکتے تھے۔ اس کے بعد کیا ہوگا؟ یہ تصور ہی اتنا اذیت ناک تھا کہ وہ کچھ سوچ ہی نہیں سکتے تھے۔ اب ایک اور مسئلہ سر اٹھا رہا تھا۔ وہ جس ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے' وہاں دوسرے لوگ انہیں شک کی نگاہوں سے دیکھنے لگے تھے اور ایک دو مرتبہ ہوٹل کے جرمن مالک نے ان سے الٹے سیدھے سوال بھی کیے تھے جن کا مطلب یہ تھا کہ اسے بھی کچھ نہ کچھ شک ضرور ہو گیا ہے۔

اگلے روز ناشتے سے فارغ ہو کر باہر نکل گئے۔ ان کا خیال تھا کہ شاید کوئی اور ایسا شخص مل جائے جو ان کی مدد کر سکے۔ آخر وہ اس ہوٹل میں پہنچے جس کا پتہ کیمپ کے فرانسیسی حجام نے انہیں بتایا تھا۔ اس ہوٹل میں زیادہ تر غیر ملکی مزدور اور کارکن رہتے تھے۔ جان اور پیٹر کو یہاں آ کر کچھ اطمینان سا ہوا۔ یہ پہلی جگہ تھی جہاں انہوں نے ہٹلر کی تصویر دیوار پر لٹکی ہوئی نہیں پائی اور نہ لوگوں کو ''ہیل ہٹلر'' کے نعرے بلند کرتے سنا' ورنہ وہ جس جگہ جاتے' ہٹلر کی تصویر ان کے سامنے آتی تھی۔ باغوں میں' سینماؤں میں' ہوٹلوں میں' سٹیشن میں' بسوں کے اندر' دیواروں پر' دروازوں پر غرضیکہ کوئی جگہ ہٹلر کی تصویر سے خالی نہ تھی۔ ایک دوہری پریشانی یہ تھی کہ نہ وہ جرمن زبان جانتے تھے اور نہ فرانسیسی...... انگریزی بولتے ہوئے اس لئے ڈرتے تھے کہ ہر جگہ اپنے آپ کو فرانسیسی ظاہر کرتے تھے۔ اب وہ جس ہوٹل میں گئے' وہاں سب فرانسیسی تھے۔ یہ ایک علیحدہ میز پر جا کر بیٹھ گئے اور گہری نظروں سے لوگوں کا جائزہ لینے لگے۔ ان کی میز کے بالکل سامنے دو فرانسیسی نوجوان بیٹھے تھے اور ان کی طرف دیکھ کر آپس میں چپکے چپکے باتیں کر رہے تھے۔ پیٹر اور جان چوکنے ہو گئے۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ یہ فرانسیسی نوجوان کس بات پر کھسر پھسر کر رہے تھے۔ ضرور کوئی معاملہ ہے۔ دفعتہً جان پیٹر کی جانب جھکا اور آہستہ سے بولا:

''دیکھو تم یہیں بیٹھے رہنا۔ میں ان فرانسیسی نوجوانوں کے پاس جاتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بھی ہماری طرح ہی آفت زدہ ہیں۔ شاید ہم ان سے کوئی مدد لے سکیں۔'' اور اس سے پیشتر کہ پیٹر اسے روکتا' جان کرسی سے اٹھ کر دوسری میز کی جانب جا چکا تھا۔

فرانسیسی نوجوانوں نے جب اسے اپنی طرف آتے دیکھا تو ان کے چہروں کا رنگ فق ہو گیا اور سہم کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ جان نے اطمینان سے کرسی سنبھالی اور ان کے پاس بیٹھ گیا۔ پیٹر نے دیکھا کہ اس نے جھک کر ان نوجوانوں سے کچھ کہا اور پھر اپنی جیب سے شناختی کارڈ نکال کر دکھایا تو فرانسیسی نوجوانوں کے چہرے پر اطمینان کے آثار نمودار ہونے لگے۔ پھر وہ دو تین منٹ تک سرگوشیوں میں باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد جان وہاں سے اٹھا اور پیٹر کے پاس آ گیا۔ اس کے لبوں پر معنی خیز تبسم تھا یہ دیکھ کر پیٹر کی جان میں جان آئی۔ اور وہ نئے انکشاف کے لیے سنبھل کر بیٹھ گیا۔

''میں نے تو انہیں دہلا ہی دیا تھا۔'' جان مسکرا کر بولا۔ ''مگر بعد میں پتا چلا کہ وہ بیچارے تو ہم سے بھی گئے گزرے ہیں۔ وہ خود یہاں سے سویڈن کے جہاز پر سوار ہو کر فرار ہونے کی فکر کر رہے ہیں۔ میں نے ان سے کہا ہے کہ اگر وہ کسی سویڈش ملاح سے ملیں تو اس کا پتہ ہمیں ضرور بتائیں۔ وہ کہتے ہیں کہ سویڈن کے ملاح یہاں سے انہیں لے جانے کا معاوضہ بہت زیادہ مانگتے ہیں۔ چنانچہ وہ گزشتہ چھ ماہ سے کام کر کے رقم پس انداز کر رہے ہیں۔ انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ کیمپ میں آنے جانے کا اجازت نامہ بھی ہمارے لیے مہیا کر دیں گے۔ اس طرح ہمیں فرانسیسیوں سے ملنے جلنے میں بڑی آسانی رہے گی۔ انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر ضرورت پڑی تو تم بھی اجازت نامے تیار کر لینا۔''

قہوہ پینے کے بعد وہ یہاں سے نکلے اور بازار میں گھومنے لگے۔ سٹیلگ کے کیمپ سے فرار ہوئے انہیں پانچواں روز تھا اور خوراک کا ذخیرہ ان کے پاس ختم ہو رہا تھا۔ وہ دونوں اب اس فکر میں سرگرداں تھے کہ روپیہ اور خوراک کا ذخیرہ ختم ہونے کے بعد کیا کریں گے؟ اور پھر ہوٹل میں زیادہ عرصے تک ٹھہرنا بھی خطرناک تھا۔ کیونکہ انہیں تنبیہہ...... کر دی گئی تھی کہ وہ دو دن سے زیادہ وہاں قیام نہ کریں۔ اگر پولیس نے چھان بین کی تو وہ ضرور پکڑے جائیں گے۔

دوپہر اور سہ پہر تک وہ اسی طرح آوارہ گردہ کرتے رہے۔ ان کے ذہن میں بس ایک ہی بات سمائی ہوئی تھی کہ جس طرح بھی ممکن ہو' خواہ کسی کو قتل ہی کیوں نہ کرنا پڑے' وہ یہاں سے نکل کر سویڈن پہنچ جائیں۔ مگر راستہ کوئی نہیں سوجھتا تھا۔ ایک سنسان گلی سے گزرتے ہوئے انہوں نے ایک ادھیڑ عمر فرانسیسی کو دیکھا۔ جس کی قمیض کے پیچھے صرف (P) لکھا ہوا تھا۔ یہ اس بات کی علامت تھا کہ وہ کیمپ میں کام کرتا ہے۔

''آہ...... موقع اچھا ہے۔'' جان کہنے لگا۔ میں اس سے بات کرتا ہوں۔ شاید ہماری مدد کرے۔'' اور دیکھو تم ہوشیار رہنا اگر اس گدھے نے فرار ہو کر چیخنے چلانے کی کوشش کی تو تم اس کا گلا گھونٹ دینا۔ میں اسے وہاں تاریکی میں لے جاتا ہوں۔ تم بعد میں آ جانا۔''

پیٹر وہیں رک گیا اور جان لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اس فرانسیسی کے سر پر پہنچ گیا اور اس کا بازو پکڑ کر فرانسیسی زبان میں آہستہ سے کہا۔ ''موسیو! میں آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔ ذرا ادھر آیئے۔''

ادھیڑ عمر فرانسیسی نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ اس کے چہرے پر حیرت و خوف کی ملی جلی علامات نمودار ہوئیں۔ پھر اس نے ادھر ادھر دیکھا اور جان کا ہاتھ پکڑ کر خود ہی ایک جانب کھڑا ہوا۔ اور تیز تیز لہجے میں بولا: ''تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟''

''آہ...... موسیو ذرا آہستہ' جان نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''میں آپ کو شناختی کاغذ دکھاتا ہوں یہ لیجیے۔''

اتنے میں پیٹر بھی حالات حوصلہ افزا دیکھ کر وہاں پہنچ چکا تھا۔ فرانسیسی نے دونوں کے کاغذات دیکھے۔ مطمئن ہو کر سر ہلایا اور اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے آگے چل پڑا۔ چند منٹ تک وہ تینوں خاموش چلتے رہے۔ آخر فرانسیسی نے ان سے مخاطب ہو کر کہا:

''میں تمہیں ایک کیفے میں لیے چلتا ہوں۔ وہاں سویڈن کے اکثر ملاح آتے رہتے ہیں۔ اگر تمہاری قسمت نے یاوری کی تو تمہارا کام بن جائے گا۔ اور یاد رکھو اگر مجھے تمہارا تعارف کرانے کی ضرورت پڑی تو میں یہی کہوں گا تم دونوں بھی سویڈن کے باشندے ہو۔ اب چپکے چپکے میرے ساتھ چلے آؤ۔''

جس کیفے میں وہ انہیں لے گیا' وہ کوئی عام جگہ نہ تھی۔ نہایت سجا سجایا اور روشنیوں سے بقعۂ نور بنا ہوا ایک وسیع و عریض ہال تھا جس میں سینکڑوں چیزیں رکھی تھیں۔ سٹیج پر ایک موسیقار پیانو کے کمالات دکھا رہا تھا اور حاضرین' جن میں زیادہ تر جرمن سپاہی' فوجی آفیسر اور حسین و جمیل لڑکیاں تھیں' کھانے پینے اور خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ یہ تینوں شخص ہال کے عقبی دروازے سے اندر داخل ہوئے اور ایک الگ میز پر بیٹھ گئے۔ فوراً ایک ویٹریس ان کے قریب آئی اور جب ادھیڑ عمر فرانسیسی نے نہایت شستہ اور بے عیب جرمن زبان میں اسے قہوے کا آرڈر دیا تو پیٹر اور جان تعجب سے اسے گھورنے لگے۔ انہیں اپنا دل بیٹھتا ہوا محسوس ہوا' کیونکہ پہلا خیال ہی جو ان کے ذہن میں آیا وہ یہ تھا کہ یہ شخص ضرور گسٹاپو سے تعلق رکھتا ہے۔ ان کے چہرے خوف سے سفید پڑ گئے اور ٹانگیں کانپنے لگی تھیں۔

ویٹرس کے جانے کے بعد فرانسیسی ان سے کہنے لگا۔ ''دوستو! اگر تمہاری یہی کیفیت رہی تو مجھے یہ کہنا پڑے گا کہ تم کبھی بھی سویڈن نہیں جا سکو۔گے۔ تمہیں اپنے اوپر قابو رکھنا چاہیے۔ اگر ویٹرس تمہیں اس حال میں دیکھ لے تو کیا سمجھے؟ کیا تم مجھے جرمن جاسوس سمجھتے ہو؟ اور تم نے یہ شبہ شاید میرے جرمن زبان بولنے پر کیا ہے۔ اگر یہ بات ہے تو مطمئن رہو میں جرمنوں کا اتنا ہی دشمن ہوں جتنے تم۔ اور یہ جرمن زبان میں نے بہت عرصہ پہلے سیکھی تھی۔ میں جنگ سے پہلے کئی سال اس ملک میں رہ چکا ہوں۔''

یہ سن کر پیٹر اور جان کے اوسان بحال ہوئے۔ اس احسان کے عوض جان نے قہوے کا بل ادا کرنے کی پیش کش کی۔ مگر فرانسیسی نے انہیں روک دیا۔ اتنے میں ہال کے صدر دروازے سے چار طویل القامت اور قوی الجثہ جرمن سپاہی اندر داخل ہوئے جنہوں نے گھورتی ہوئی نظروں سے ہال کا جائزہ لیا اور اسی طرف بڑھے جہاں یہ تینوں قہوہ پی رہے تھے۔ جرمن سپاہیوں کو اپنی طرف آتے دیکھ کر پیٹر اور جان کے حواس باختہ تو ہوئے ہی تھے' خود فرانسیسی کے چہرے پر بھی پسینے کے قطرے جھلملانے لگے۔ لیکن آدمی تھا سمجھ دار اور نہایت ہی گھاگ۔ جرمن سپاہی قریب آئے' اس نے ہاتھ کے اشارے سے ویٹرس کو اپنے پاس بلایا اور نہایت اونچے جرمن لہجے میں بولا:

''دیکھو' یہ ہمارے دوست ہیں۔ سویڈن کے رہنے والے ہیں۔ بیچارے یہاں بالکل تنہا ہیں۔ اگر یہاں کوئی سویڈش ملاح آئے تو ان کا تعارف اس سے کرا دینا۔ یہ یہیں بیٹھے ہیں۔''

یہ کہہ کر وہ اپنی نشست سے اٹھا اور ہال سے باہر نکل گیا۔ جرمن سپاہیوں نے شاید اس کے یہ الفاظ سن لیے تھے۔ کیونکہ فوراً ہی انہوں نے گھوم کر جان اور پیٹر کی طرف دیکھا اور پھر منہ پھیر کر ایک دوسری میز پر جا کر بیٹھ گئے۔

اب یہ دونوں اس فکر میں تھے کہ خطرے کے وقت بھاگنے کا کونسا راستہ موزوں ہو سکتا ہے۔ ان کے بائیں ہاتھ پر ایک تنگ سی راہداری تھی جو غالباً بیت الخلا کی جانب کھلتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک کھڑکی نما دروازہ تھا۔ انہوں نے سوچا کہ اسی طرف سے فرار ہونے کا راستہ ہے۔

یکا یک ایک سرخ بالوں والی نوجوان عورت آئی اور ان کے پاس بیٹھ گئی اور پیٹر سے مخاطب ہو کر جلد جلد کچھ کہنے لگی۔ یہ زبان پیٹر کی سمجھ سے بالا تر تھی' کیونکہ نہ وہ انگریزی تھی' نہ جرمن اور نہ فرانسیسی...... پیٹر حیرت سے اس کا منہ تکنے لگا۔ معاً اس کے ذہن میں ایک تدبیر آئی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور فرانسیسی زبان میں ایک الٹا سیدھا معذرت آمیز جملہ کہہ کر سامنے راہداری میں چلا گیا۔ اب عورت جان کی طرف متوجہ ہوئی اور اسی عجیب زبان میں کچھ کہا:

''محترمہ معاف کیجئے۔ میں سویڈش زبان نہیں بول سکتا۔'' جان نے جرمن لہجے میں کہا:

''آہ......مگر ابھی تمہارے دوست نے کہا تھا کہ تم دونوں سویڈن کے ہو؟'' عورت کے لہجے میں تحکم تھا۔

''آپ کو غلط فہمی ہوگئی ہے۔ میرا وہ دوست جو ابھی اٹھ کر گیا ہے' وہ سویڈن کا ہے اور میں فرانس کا ہوں۔''

''آں...... ہاں۔'' عورت کی پیشانی پر شکنیں سی نمودار ہوئیں۔ ''لیکن حلیے اور شکل شباہت سے تمہارا دوست سویڈن کا معلوم نہیں ہوتا۔''

یہ سنتے ہی جان کے پاؤں تلے کی زمین سرک گئی۔ وہ تو یوں کہیے کہ ہال میں اس وقت بہت ہی شور و غل مچ رہا تھا' اس لیے کسی نے اس کی آواز نہیں سنی۔ ورنہ ضرور کئی لوگ شک کرتے۔ جان کی حاضر دماغی کام آ گئی۔

"محترمہ! آپ نے دیکھا نہیں وہ اس وقت بری طرح پٹے ہوئے ہے۔ وہ خالص سویڈن کا باشندہ ہے۔"

اس پر عورت نے معذرت پیش کرتے ہوئے ایک طویل تقریر شروع کر دی اور جان بار بار گھبرا کر راہداری کی جانب دیکھتا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس بلا سے کیونکر چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ آخر تنگ آمد بجنگ آمد وہ اٹھا اور کہنے لگا:

"آپ بیٹھیے میں ذرا اس کم بخت کو دیکھ آؤں کہیں گر نہ پڑا ہو۔"

پھر وہ راہداری میں گیا۔ بیت الخلا کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ جان نے اپنے مخصوص انداز میں دروازے پر دستک دی تو اندر سے پیٹر نے کھنکھار کر جواب دیا اور پھر دروازہ کھول دیا۔ اس کا جسم پسینے سے شرابور تھا اور چہرہ زرد تھا۔ جان کو دیکھتے ہی وہ بولا:

"خدا کے واسطے یہاں سے بھاگ چلو۔ ورنہ کسی مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔"

وہ دونوں اسی راہداری میں چلتے ہوئے ایک اونچی کھڑکی سے کود کر باہر نکل گئے۔

"پتہ نہیں وہ عورت کون تھی؟ اگر اس پر ظاہر ہو جاتا کہ ہم نہ فرانسیسی ہیں اور نہ سویڈش تو ہمارا کیا حشر ہوتا۔ اس وقت بال بال بچے ہیں۔ خدا اس موذی کو غارت کرے جو ہمیں لایا۔" جان نے غصے سے بل کھا کر کہا۔ رات زیادہ گزر گئی۔ وہ گرتے پڑتے ہوٹل کی طرف روانہ ہوئے۔

دوسرے روز علی الصبح جان بیدار ہوا۔ پہلے اس نے پیٹر کو جگانا چاہا مگر کچھ سوچ کر رک گیا۔ ہاتھ منہ دھو کر اس نے تھیلے میں سے بسکٹوں کے بچے کھچے ٹکڑے کھائے، پانی کا ایک گلاس پیا اور باہر جانے کے لیے تیار ہو گیا...... آج وہ اکیلا ہی کچھ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ پیٹر کے نام اس نے کاغذ پر چند سطریں لکھیں:

"میں ذرا باہر جاتا ہوں...... تم میری واپسی تک یہیں ٹھہرو گے، گھبرانا نہیں...... میں جلد واپس آنے کی کوشش کروں گا۔ اگر میں شام تک نہ آؤں تو تم کیمپ میں جا کر

اس فرانسیسی حجام سے ملنا۔" یہ رقعہ اس نے جان کے سرہانے رکھا۔ آہستہ سے دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔

وہ دراصل اس کیفے میں جانا چاہتا تھا جہاں گزشتہ روز اس جرمن عورت نے انہیں پریشان کیا تھا۔ جان کا خیال تھا کہ شاید آج وہاں سویڈن کے کسی ملاح سے ملاقات ہو جائے۔ اگرچہ اس کے دل میں خوف تھا کہ وہ پہچان لیا گیا تو اس کا برا حشر ہوگا مگر اب خطرہ مول لیے بغیر چارہ بھی نہ تھا۔ وہ سر جھکائے انہی خیالات میں گم اسی جانب جا رہا تھا کہ یکا یک پیچھے سے کوئی شخص تیزی سے آیا اور جان سے ٹکرا گیا...... جان نے گھوم کر دیکھا تو وہی فرانسیسی حجام تھا جو اٹک اٹک کر انگریزی بولتا تھا۔

"چپ چاپ میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ......" اس نے آہستہ سے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ اب جان نے دیکھا کہ فرانسیسی حجام کے ساتھ ایک اور شخص بھی ہے۔ وہ ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ بہت دیر تک وہ اسی طرح گلیوں اور بازاروں میں گھومتے رہے، یہاں تک کہ جان کی ٹانگوں میں درد ہونے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر یہ لوگ کدھر جا رہے ہیں...... مگر بات کرنے کا موقع نہ تھا۔ وہ ان کا تعاقب کرتا رہا۔ آخر وہ دونوں ایک معمولی سے کیفے کے سامنے پہنچے جس کے باہر لکھا تھا...... "کیفے ڈیکورڈیں" ...... وہ دونوں جب کیفے کے اندر چلے گئے تو جان باہر کھڑا سوچتا رہا کہ آیا اسے بھی اندر جانا چاہیے یا نہیں...... اس کے ذہن میں یہ وہم سا گیا تھا کہ اس میں ضرور کوئی نہ کوئی چال ہے۔ کہیں یہ لوگ اسے کسی جال میں پھنسانا تو نہیں چاہتے اسی گومگو کے عالم میں دس پندرہ منٹ گزر گئے...... آخر اس نے دل مضبوط کیا اور خدا کا نام لے کر کیفے میں داخل ہو گیا...... یہ کیفے کے بجائے ایک چھوٹا سا شراب خانہ تھا جس میں ٹوٹی پھوٹی کرسیاں پڑی تھیں اور فرش پر گرد اور کوڑے کے ڈھیر لگے تھے۔ فرانسیسی حجام اور اس کا ساتھی ایک گوشے میں بیٹھے دکھائی دیئے۔ ان کے علاوہ وہاں اور بھی فرانسیسی موجود تھے جو آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ جان کو دیکھتے ہی فرانسیسی حجام نے اسے اشارے سے اپنے قریب بلا کر کرسی پر بٹھا لیا اور مسکراتے ہوئے بولا:

"یار' تم کہاں غائب ہو گئے تھے۔ ہم نے تمہاری تلاش میں زمین آسمان ایک کر ڈالا۔ ہمیں خدشہ یہ تھا کہ...... تم گستاپو کے ہتھے نہ چڑھ گئے ہو...... اچھا ان سے ملو' یہ ہیں میرے دوست پیری اور یہ تمہاری کافی مدد کر سکتے ہیں۔"

جان نے پیری سے ہاتھ ملایا اور اس کی طرف تکنے لگا۔ پیری کہنے لگا:...... "میں نے تمہاری ساری داستان سن لی ہے اور میں دل سے تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔ میرا ایک دوست آج کل یہاں سے ایک موٹر بوٹ کے ذریعے سویڈن جا رہا ہے۔ میں نے اس سے تم لوگوں کا ذکر کیا تھا۔ اگر تم میرے ساتھ چلو تو تمہاری اس سے ملاقات کراؤں۔"

"وہ صاحب اس وقت کہاں ہیں؟" جان نے سوال کیا۔

"یہ میں نہیں بتا سکتا۔ البتہ تمہیں ان کے پاس لے کر جا سکتا ہوں۔"

"کیا زیادہ دور جانا پڑے گا؟"

"نہیں' اتنا دور بھی نہیں...... چلنا چاہتے ہو تو اٹھ کھڑے ہو۔"

جان گہری سوچ میں گم ہو گیا۔ اس کے دل میں متضاد خیالات آتے اور نکل جاتے۔ معاملہ کچھ ایسا پیچیدہ اور عجیب تھا کہ وہ قطعی طور پر کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر تھا۔ آخر اس نے کہا:

"دیکھیے میں آپ کے ساتھ چلنے کو تیار ہوں' مگر میرا دوست وہیں ہوٹل میں ہے۔ وہ میری غیر حاضری پر پریشان ہو گا۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ میں اسے اطلاع دے آؤں یا اسے ساتھ لے آؤں؟"

"مجھے افسوس ہے کہ ہم آپ کو اس بات کی اجازت نہیں دے سکتے۔ آپ کو ہم پر کلی اعتماد کرنا ہو گا......" پیری نے کہا۔

"آئیے اب چلیں...... فکر نہ کیجیے' اگر آپ واقعی مدد کے مستحق ہوئے تو ہم دل و جان سے حاضر ہیں۔ اور اگر......" اس نے جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔ مگر اس کے لہجے کی سختی سے ظاہر ہو گیا کہ وہ کیا کہنا چاہتا تھا۔

فرانسیسی حجام کو وہیں چھوڑ کر جان اور پیری دونوں کیفے سے باہر نکلے اور دس گز کا درمیانی فاصلہ رکھ کر چلنے لگے...... پھر کئی گلی کوچوں اور بازاروں میں گھومنے کے بعد وہ ایک مختصر سے مکان پر پہنچ گئے۔ پیری نے جان کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ جان نے اپنے آپ کو ایک ایسے کمرے میں پایا۔ جس میں فرانسیسی تمباکو کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ دیواروں پر فرانسیسی لیڈروں کی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ جن میں جنرل ڈیگال کی تصویر بھی شامل تھی۔

"آپ تھوڑی دیر کے لیے یہاں بیٹھیے۔ میں ابھی آیا۔" پیری نے کہا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔ چند منٹ بعد ہی وہ دو اور آدمیوں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ یہ دونوں اجنبی خاصے قوی ہیکل تھے اور ایک کے ہاتھ میں لکڑی کا موٹا سا ڈنڈا تھا اور ڈنڈے والا شخص دروازے کے پاس یوں کھڑا ہو گیا جیسے پہرہ دے رہا ہے۔ اس کے بعد دوسرے شخص نے فرانسیسی میں جان سے پوچھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"جان کلنٹن' اور میں ایک برطانوی آفیسر ہوں۔"

ڈنڈے والے شخص نے یہ سن کر کہا:

"صورت سے تو تم انگریز معلوم نہیں ہوتے......" جان خاموش رہا۔ نووارد فرانسیسی کہنے لگا: "کوئی بات نہیں' ابھی چند منٹ میں اینڈری آنے والا ہے۔ وہ سب کچھ معلوم کر لے گا۔" کمرے میں ایک بھیانک خاموشی چھا گئی۔ جان کا دل کسی نامعلوم خطرے کے ڈر سے دھک دھک کرنے لگا۔ وہ اپنے آپ کو کوس رہا تھا کہ کہاں آن پھنسا۔ یہ لوگ کون ہیں؟ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟ اور یہ اینڈری کس کا نام ہے؟ تھوڑی دیر بعد وہی ڈنڈے والا شخص بولا:

"مجھے یقین ہے کہ یہ شخص فرانسیسی ہے۔ اس کے خدوخال غمازی کر رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے......" دوسرا بولا: "مگر کسی کے خدوخال دیکھ کر ہی اس کی قومیت کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔"

"میں کہتا ہوں کہ یہ شخص اور کچھ ہو تو ہو' فرانسیسی ہرگز نہیں ہے۔" اس مرتبہ پیری نے رائے زنی کی۔

"خدا کی پناہ...... آپ لوگ عجیب بات کرتے ہیں۔ جب میں خود کہہ رہا ہوں کہ انگریز ہوں تو آپ یقین نہیں کرتے۔" جان نے تڑخ کر کہا۔

"آہ...... میرے دوست' ناراض نہ ہو۔ ہم یہ کام اپنی جانوں پر کھیل کر کر رہے ہیں اور تمہارے فائدے کے لیے...... اگر یہ ثابت ہو گیا کہ تم انگریز ہو تو ہم تمہاری مدد کریں گے...... اور اگر تم اس معاملے میں جھوٹے ثابت ہوئے تو جانتے ہو تمہارے ساتھ کیا سلوک ہوگا؟"

یہ کہہ کر اس شخص نے ایک آنکھ میچ لی اور اپنے گلے پر یوں انگلی پھیری جیسے قصاب بکرے کے گلے پر چھری پھیرتا ہے۔ "سمجھ گئے؟ تمہاری لاش وہاں پھینکی جائے گی جہاں حشر تک کسی کو تمہارا سراغ نہ ملے گا۔"

جان کا کلیجہ اچھل کر حلق میں آ گیا اور اس کے ہاتھ پیر سنسنانے لگے اور پھر کمرے میں موت کی سی خاموشی پھیل گئی۔ ہر شخص کسی گہری فکر میں گم نظر آتا تھا۔ آخر اس خاموشی کو باہر سے آتی ہوئی قدموں کی چاپ نے توڑا۔

"لو وہ اینڈری آ گیا......" ڈنڈے والا شخص بولا۔

اینڈری کمرے میں آیا تو پیری اسے ایک جانب لے گیا اور ہولے ہولے اس کے کان میں کچھ کہا۔ اینڈری نے جان کی طرف دیکھا' اس کی طرف بڑھا اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی زبان میں بولا: "کیا تم فرانسیسی بول سکتے ہو؟"

"جی ہاں' مگر زیادہ روانی سے نہیں۔"

"خوب میں کل سویڈن جا رہا ہوں۔ ہماری ایک خاص تنظیم کام کر رہی ہے۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں تمہیں تفصیلات سے آگاہ کروں۔ تمہیں اپنے آپ کو شناخت کرانا ہوگا......"

"میرے پاس شناختی کاغذات موجود ہیں۔ اگر آپ دیکھنا چاہیں تو......" جان نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔

نہیں...... شناختی کاغذات سے کام نہ چلے گا۔ وہ جعلی بھی ہو سکتے ہیں۔ تمہارا نام؟"

"جان کلنٹن"

"عمر؟"

"تئیس سال۔"

"کیا تم فوجی سپاہی ہو؟"

"جی ہاں۔"

"تمہارا عہدہ؟"

"کپتان۔"

"تم کس کیمپ میں تھے؟"

"سٹیلگ تھری۔"

"تمہارا تعلق کس رجمنٹ سے تھا؟"

"یہ میں آپ کو نہیں بتا سکتا۔"

"آہ...... تم مجھ پر اعتماد نہیں کرتے" ...... اینڈری بولا۔ "بے شک تمہیں کرنا بھی نہیں چاہیے۔ بہرحال میں ثبوت چاہتا ہوں: تم جو کچھ کہو گے سچ ہوگا۔ اچھا تم یہ بتاؤ کہ جرمن کیمپ سے فرار کب ہوئے؟"

''گذشتہ جمعے کے روز......''

''تم گرفتار کب ہوئے تھے؟''

''17 دسمبر 1942ء کو۔''

''کہاں گرفتار ہوئے؟''

''افریقہ میں۔''

''کیا تم کسی ٹینک میں تھے؟''

''جی نہیں' میں اپنی موٹر سائیکل پر تھا۔''

''کونسی موٹر سائیکل تھی تمہارے پاس؟''

''بی' ایس' اے۔''

''زخمی بھی ہوئے تھے؟''

''جی ہاں میرا بازو زخمی ہوا تھا۔''

''دکھاؤ۔''

جان اپنا کوٹ اتارنے ہی والا تھا کہ اینڈری نے کہا: ''بس رہنے دو...... کافی ہے......''

کمرے میں پھر خاموشی چھا گئی...... ہر شخص ایک دوسرے کی جانب مشکوک نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ یکا یک اینڈری نے پھر سوال کیا:

''تمہاری ماں کا کرسچین نام کیا تھا؟''

''میری ایلزبتھ۔''

''تمہارا والد اسے کس نام سے پکارتا تھا؟''

''بیٹی کہہ کر۔''

''کیا تمہارے گھر کے ساتھ باغیچہ بھی تھا؟''

''ہاں۔''

''باغیچے میں کون کون سے پھول تھے؟''

''گلاب' گیندا' سوسن......''

''تمہارے پاس کار تھی؟''

''ہاں......''

''کون سی؟''

''مارس۔''

''کتنے ہارس پاور کی؟''

''دس......''

''کیا تم لندن میں رہے ہو؟ وہاں کے مقامات کو پہچانتے ہو؟''

''خوب اچھی طرح۔''

''اچھا بتاؤ پکاڈلی سرکس میں جو مجسمہ نصب ہے' اس کا کیا نام ہے؟''

''ایرز۔''

''پکاڈلی سرکس کس لیے مشہور ہے؟''

''پھول بیچنے والوں کی وجہ سے۔''

''اچھا' اب ایک سوال اور......'' اینڈری نے یہ کہتے ہوئے جان کے منہ پر ہلکا سا طمانچہ مارا۔

''یہ کیا بیہودگی......'' جان غصے میں چلایا اور کمرے میں بیٹھے ہوئے سب لوگ ہنس پڑے۔

"بھئی معاف کرنا......" اینڈری نے کہا ...... یہ امتحان کا ایک سوال ہی تھا اور مجھے خوشی ہے کہ تم اس کڑے امتحان میں کامیاب ہو گئے...... یہ کہہ کر وہ اس ہٹے کٹے' پست قامت فرانسیسی کی طرف مڑا اور بولا: "میں ضمانت دیتا ہوں کہ یہ شخص اصلی انگریز ہے۔"

* * *

جان جب واپس ہوٹل پہنچا تو پیٹر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ جان نے مختصر الفاظ میں اپنی کامیابی کا قصہ سنایا اور کہا "بس چلنے کے لیے تیار ہو جاؤ......شام کو ہم اس ہوٹل کے باہر ڈنمارک کے ایک ملاح کا انتظار کریں گے جو ہمیں اپنے ساتھ لے جا کر جہاز پر سوار کر دے گا......اور ہم کوپن ہیگن چلے جائیں گے۔"

"ڈنمارک؟ پیٹر نے حیرت سے پوچھا۔"ڈنمارک پر تو جرمنوں کا قبضہ ہے۔"

"ہمیں کوپن ہیگن ہی جانا ہوگا اور وہاں سے ہم آسانی کے ساتھ سویڈن پہنچ جائیں گے۔ یہاں سے براہ راست سویڈن جانے میں سینکڑوں مشکلات ہیں......آج کی رات شاید ہمیں فرانسیسی کیمپ میں بسر کرنی پڑے' کیونکہ یہاں ٹھہرنا اب خطرے سے خالی نہیں۔کیمپ کے اندر داخل ہونے کے اجازت نامے میرے پاس ہیں۔ وہ حجام واقعی بہت اچھا آدمی ہے۔تمام کام اسی نے سرانجام دیا۔"

پیٹر کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ جان کیا کہنا چاہتا ہے۔کوپن ہیگن' ڈنمارک...... یہ تو وہی بات ہوئی کہ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا۔ وہاں بھی گسٹاپو موجود ہے اور غیر ملکیوں کے لیے وہی سخت قانون۔ اور پھر ہمارے پاس کوپن ہیگن کے شناختی کاغذات بھی تو نہیں ہیں۔ اور نہ روپیہ...... وہ یہ سب باتیں جان سے پوچھنا چاہتا تھا لیکن جان اپنی کامیابی پر اتنا مسرور تھا کہ اس نے پیٹر کی کسی بات پر کان نہ دھرا۔

شام ہوتے ہی وہ اپنے اپنے تھیلے کندھوں پر لاد کر ہوٹل سے باہر نکلے...... کرایہ انہوں نے پیشگی ادا کر دیا تھا۔ اس لیے مالک کو ان کی رخصت پر کوئی اعتراض نہ تھا۔

اب وہ ایک جانب کھڑے' بے چینی سے ڈنمارک کے ملاح کا انتظار کر رہے تھے۔شام کے چھ بجے' سات بجے' آٹھ بجے اور پھر نو بج گئے۔ چار گھنٹے مسلسل انتظار کے بعد بھی جب وہ نہ آیا تو ان کی مایوسی اور پریشانی کی انتہا نہ رہی...... ہوٹل میں دوبارہ جانا انہیں مشتبہ بنا دیتا اور کہیں پناہ ملنے کا امکان نہ تھا۔انہوں نے سوچا کہ چل کر اسی زیر زمین پناہ گاہ میں رات بسر کی جائے۔ عین اسی وقت نیلی وردی پہنے ہوئے ایک نوجوان شخص ان کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور انگریزی زبان میں سلام کیا۔جان اور پیٹر اسے دیکھتے ہی خوش ہو گئے اور اس کے ساتھ چل پڑے۔راستے میں اس نے بتایا کہ "ڈنمارک کے بہت سے لوگ سویڈن جا رہے ہیں اور وہاں آپ کو بہت سے دوست مل جائیں گے۔ ہمارا جہاز کل دوپہر کو روانہ ہو جائے گا۔ یہ رات آپ جہاز پر گزاریں گے...... جہاز کے کپتان کو آپ کے ناموں سے مطلع کر دیا گیا ہے اور وہ خود آپ سے ملنے کا مشتاق ہے۔"

فری ہافن کی گودی ایک بار پھر ان کے سامنے تھی۔ وہی فری ہافن جہاں وہ جرمن سنتری کی گولی کا نشانہ بنتے بنتے بچ گئے تھے۔ وہی پہریدار وہاں موجود تھے۔ ملاح نے انہیں گودی پر جانے کے اجازت نامے دکھائے۔سویڈن کا ایک بڑا جہاز ایس آئی یورنس لنگر انداز تھا اور عرشے پر بتیاں جل رہی تھیں۔ کپتان لارنس نے ان کا استقبال کیا۔ اس نے انہیں کھانا کھلایا' قہوہ پلایا اور سونے کے لیے ایک کیبن دکھایا اور یہ کہہ کر رخصت ہوا کہ "کل دوپہر ہمارا جہاز لنگر اٹھائے گا۔ اس سے پہلے جرمن آفیسر جہاز کی تلاشی لیں گے...... اگر آپ ان کی نظروں سے پوشیدہ رہ سکے تو پھر یقین کیجئے کہ کوپن ہیگن تک آپ کو کوئی خطرہ پیش نہیں آئے گا۔ اچھا شب بخیر......"

انہیں سوتے ہوئے بمشکل تین گھنٹے ہوئے ہوں گے کہ وہی ملاح جو انہیں ہوٹل سے لے کر آیا تھا۔گھبرایا ہوا کیبن میں داخل ہوا اور انہیں جھنجھوڑ کر جگا دیا۔

"جلدی کرو یہ وردیاں پہن لو......" جرمن افسر جہاز کی تلاشی لینے آ رہے ہیں......

اگرچہ ان کے پاس جہاز کے عملے کی فہرست اور تصویریں ہیں لیکن تم احتیاطاً یہ وردیاں پہن لو اور فوراً میرے ساتھ چلو نیچے ایک تہ خانہ ہے...... تم دوپہر تک وہیں رہنا۔"

وہ دونوں اٹھے۔ جلدی جلدی اپنے کپڑے اتار کر جہاز کے ملاحوں کی نیلی وردیاں پہنیں اور ملاح سگمنڈ کے ساتھ چلتے ہوئے جہاز کے انجن روم میں پہنچے جہاں کپتان لارنس بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ ان کو دیکھتے ہی وہ کہنے لگا:

"غضب ہو گیا...... کسی نے جرمن آفیسروں کو اطلاع دی ہے کہ دو مفرور انگریز قیدی اس جہاز میں چھپے ہوئے ہیں اور اب وہ کسی بھی لمحے یہاں چھاپا مارنے والے ہیں...... تم اب میرے ساتھ آؤ۔"

کپتان نے انجن روم کی فولادی دیوار میں لگا ہوا ایک بٹن دبایا۔ فوراً ہی ایک خفیہ کھڑکی نمودار ہوئی اور وہ تینوں اس میں داخل ہو گئے۔ یہاں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ اس تہ خانے میں گھٹنوں گھٹنوں پانی بھرا ہوا تھا...... کپتان نے کہا: "جہاز میں صرف یہی ایک محفوظ جگہ ہے جہاں وہ نہیں پہنچ سکیں گے۔ اور یاد رکھو جب تک میں نہ آؤں کوئی آہٹ پیدا نہ کرنا اور نہ شور مچانا...... خواہ تم مر ہی کیوں نہ جاؤ...... اگر انہوں نے تمہارا سراغ لگا لیا تو تم ہی نہیں مرو گے' بلکہ وہ ہم سب کو فوراً شوٹ کر دیں گے۔"

جان اور پیٹر کے چہروں پر مردنی سی چھائی ہوئی تھی۔ اس اندھیرے میں کپتان نہیں دیکھ سکا کہ وہ کس قدر خوفزدہ ہیں۔ وہ کپتان سے کچھ کہنا چاہتے تھے۔ مگر ان کے حلق سے آواز نہ نکل سکی۔ کپتان نے بٹن دبایا اور آہنی دروازہ پر شور آواز کے ساتھ بند ہو گیا اور ان دونوں کو یوں محسوس ہوا جیسے اب اس بھیانک قبر سے کبھی نہ نکل سکیں گے۔ بالآخر ملاحوں کا شور اونچی اونچی آوازوں اور دوڑتے ہوئے قدموں کی چاپ نے ایک زبردست ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ پھر انہوں نے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنیں...... اور ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے...... شاید جرمن افسروں کے ساتھ سراغرساں کتے بھی

تھے۔ تہ خانے کا پانی اس قدر سرد تھا کہ چند ہی منٹ میں ان دونوں کے جسم سردی سے سن ہو گئے اور خون رگوں میں جمنے لگا۔ جان نے پیٹر سے کہا کہ اس تہہ خانے میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے سے کہیں بہتر تھا کہ ہم جرمنوں کی گولیوں کا نشانہ بن جاتے...... خدا معلوم ہمیں یہاں سے کب رہائی ملے گی...... جہاز دوپہر تک روانہ ہوا اور ہم یہیں سڑتے رہے تو کپتان کو ہماری اکڑی ہوئی لاشیں ہی مل سکیں گی۔ یکایک انجن روم کے عین اوپر بھاری جوتوں کی آواز سنائی دی اور وہ دونوں سہم کر یہ آواز سننے لگے۔ بہت سے آدمی بھی تھے جو ادھر ادھر پھر رہے تھے۔ پھر چیزیں ہٹانے اور جرمن افسروں کے زور زور سے بولنے کی آوازیں آئیں۔ غالباً وہ جہاز کے عملے لوگوں سے پوچھ گچھ کر رہے تھے۔ کئی گھنٹے گزر گئے۔ تلاشی کسی طرح ختم ہونے میں نہ آتی تھی۔ جہاز میں بدستور ہنگامہ برپا تھا۔ پیٹر اور جان آہنی دیوار کے ساتھ گھٹنوں گھٹنوں تک یخ بستہ پانی میں ڈوبے ایک دوسرے کے قریب کھڑے تھے۔ ان کا بس چلتا تو وہ اسی وقت باہر نکل کر تمام جرمن افسروں کو گولی مار دیتے...... دفعتہً انجن روم کے اندر قدموں کی چاپ سنائی دی اور پھر انہوں نے کپتان لارنس کو نہایت عاجزانہ لہجے میں بولتے ہوئے سنا۔ وہ ٹوٹے پھوٹے جرمن لہجے میں گڑگڑا رہا تھا:

"جناب...... نہیں نہیں...... جناب...... میرے جہاز میں کوئی غیر شخص نہیں آ سکتا...... آپ کو معلوم ہے جناب کہ ہم غیر جانبدار لوگ ہیں...... ہم بالکل الگ تھلگ رہنا چاہتے ہیں۔ ہمیں انگریزوں سے کوئی دلچسپی نہیں' ہم فرانسیسیوں کو ویسے ہی پسند نہیں کرتے...... ہم نے جرمنوں سے کبھی دھوکا نہیں کیا...... ہم......"

پھر اس نے ملاحوں کو حکم دیا کہ مہمانوں کی خاطر تواضع کریں۔ فوراً ہی جان اور پیٹر نے بوتلوں اور گلاسوں کے کھڑکھڑانے کی آوازیں سنیں...... شاید وہ جرمن افسروں کو شراب پلا کر خوش کرنا چاہتا تھا۔ ایک ایک لمحہ ان دونوں کے لیے ناقابل برداشت بنتا جا

رہا تھا۔ پیٹر نے اس اندھیرے میں اپنی گھڑی کی چمکتی ہوئی سوئیوں کو دیکھا۔ گیارہ بجنے میں چند منٹ باقی تھے...... اف خدایا! انہیں اس تہ خانے میں قید ہوئے چار گھنٹے گزر چکے ہیں۔ پھر انہوں نے فوجی جوتوں کی آوازیں سنیں۔ شاید وہ جا رہے تھے۔ رفتہ رفتہ جہاز پر ہنگامہ اور شور کم ہوتا گیا اور تھوڑی دیر بعد ایک گہرا سناٹا ہر طرف چھا گیا اور یوں محسوس ہونے لگا جیسے جہاز پر کوئی ذی روح موجود نہیں ہے۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ کوئی شخص انجن روم میں آیا اور تہ خانے کا دروازہ کھول کر ہولے سے ان کو پکارا۔ یہ کپتان لارنس تھا۔ جان اور پیٹر بے جان لاشوں کی مانند باہر نکلے اور بیہوش ہو کر گر پڑے۔ جب ان کی آنکھ کھلی تو انہوں نے اپنے آپ کو جہاز کے عرشے پر لیٹا ہوا پایا۔ آسمان پر سورج چمک رہا تھا اور جہاز ڈنمارک کی طرف چلا جا رہا تھا۔ اور وہاں سے سویڈن اور پھر...... ان کے وطن میں...... انگلینڈ کی طرف۔

* * *

ویران دُنیا

انٹارکٹک...... ساٹھ لاکھ مربع میل کا یہ براعظم اگرچہ کرۂ ارض ہی کا ایک حصہ ہے لیکن ہے اس سے الگ تھلگ' ویران' منجمد' اداس اور خاموش' دنیا بھر کی دلچسپیوں اور رعنائیوں سے ناآشنا' دور دراز...... وہ قرنہا قرن سے اسی حالت میں ہے۔ برف ہی برف...... برف کے میدان' برف کے پہاڑ اور برف کے طوفانوں کی سرزمین...... لیکن انسان کے عزم و ہمت نے اس سرزمین کو بھی بالآخر مسخر کر لیا۔ اس نے اس کا چپہ چپہ چھان مارا ہے۔ اگرچہ اس راہ میں اسے کتنی ہی قربانیاں دینی پڑی ہیں۔ یہ کہانی بڑی ہی دل چسپ ہے۔

دسمبر 1911ء سے لے کر فروری 1913ء تک کے درمیانی عرصے میں انٹارکٹک کے سٹیج پر تین تاریخی ڈرامے کھیلے گئے۔ عزم و استقلال' جرأت و ہمت' ایثار و قربانی اور لگن و جانفشانی کے حیرت انگیز ڈرامے جن کی یاد آج بھی لوگوں کے دلوں میں تازہ ہے۔

سب سے پہلے ناروے کے شہرۂ آفاق محقق ارض رولڈ ایمنسن کا نام آتا ہے جس نے 14 دسمبر 1911ء کو قطب جنوبی پر اپنی فتح کا جھنڈا نصب کیا۔ دوسرا نام کیپٹن آبرٹ سکاٹ کا ہے جو ایمنسن کی کامیابی کے ایک ماہ بعد قطب جنوبی تک پہنچا۔ لیکن واپسی میں اسے اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔ تیسرا نام ایک آسٹریلین محقق ڈاکٹر ڈگلس ماسن کا ہے جو 18 آدمیوں کی ایک جماعت کے ساتھ قطب جنوبی کی مہم پر روانہ ہوا تھا۔

قطب جنوبی کے نئے نئے خطوں کی دریافت کے ساتھ اس مہم کا مقصد وہاں کے جغرافیائی اور ارضی حالات کا جائزہ لینا تھا۔ ڈاکٹر ڈگلس ماسن کی عمران دنوں اکتیس سال کی تھی اور وہ ایڈلائڈ یونیورسٹی میں علم طبقات الارض کا پروفیسر تھا۔ خوراک' سائنسی آلات' خیموں اور دوسری ضروریات کا سارا سامان لے کر وہ بحیرِ قطب جنوبی کے ایک جزیرے ایڈلائی تک پہنچ گئے۔ اندازے کے مطابق ڈاکٹر ماسن کی جماعت کا قطب جنوبی میں اپنی تحقیق کے لیے کافی عرصے تک ٹھہرنا ضروری تھا۔ اس لیے جس جہاز میں سوار ہوکر وہ یہاں تک پہنچے تھے اسے اس ہدایت کے ساتھ واپس کر دیا گیا کہ 15 جنوری 1913ء تک جہاز یہاں آئے اور مہم کے ارکان کو واپس لے جائے۔

ڈاکٹر ماسن کے سامنے اب ایک کٹھن اور دشوار ترین کام تھا۔ اسے تین سو میل دور تک تمام علاقے کی پیائش کرنی تھی۔ اس کے ساتھیوں میں سے دو فرد ایسے تھے جو اس کام میں اس کی مدد کر سکتے تھے۔ ایک سوئٹزر لینڈ کا باشندہ ایکس ویرمز اور دوسرا لیفٹیننٹ بی' ای ایس نِنس تھا اور دلچسپ بات یہ تھی کہ ڈاکٹر ماسن کے علاوہ ان دونوں میں سے کسی کو بھی قطب جنوبی کی سرزمین پر اس سے پہلے قدم رکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا' البتہ وہ برف پر تختوں کی مدد سے پھسلنے کی خوب مشق رکھتے تھے۔

قطب جنوبی میں موسم گرما کا آغاز نومبر میں ہوتا ہے اور نصف جنوری تک رہتا ہے اور یہی وہ مختصر سی مدت ہے جس میں برفانی طوفانوں سے نجات ملتی ہے۔ 10 نومبر 1912ء کو ڈاکٹر ماسن اور اس کے دو ساتھیوں نے ایڈلائی لینڈ سے رخت سفر باندھا جہاں ان کی جماعت نے عارضی ہیڈ کوارٹر بنا رکھا تھا۔ برف پر پھسلنے والی لکڑی کی تین بڑی بڑی گاڑیوں پر انہوں نے اپنا سامان لادا۔ اس سامان میں سائنسی آلات اور خیموں کے علاوہ تین آدمیوں اور گاڑی کھینچنے والے سولہ کتوں کی خوراک بھی شامل تھی۔

دو دوز تک وہ خیریت سے آگے بڑھتے رہے' لیکن تیسرے روز برف کا ایک زبردست طوفان نازل ہوا جس نے آگے بڑھنے کا راستہ بند کر دیا۔ تینوں آدمی اور کتے برف میں

دھنس گئے۔ جب یہ طوفان تھما تو برف کے بڑے بڑے تودے ان کے چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ پھاؤڑوں کے ذریعے انہوں نے برف کو اپنے چاروں طرف سے ہٹایا اور دوبارہ سفر اختیار کیا۔ ان کے راستے کی سب سے بڑی مصیبت وہ بڑے بڑے گڑھے تھے جن کے اوپر کائی کی مانند برف جمی رہتی تھی اور جونہی اس پر بوجھ پڑتا' یہ برف ٹوٹ جاتی اور آدمی اس گڑھے میں گر کر ہمیشہ کی نیند سو جاتا۔ یہ جان لیوا برفانی گڑھے قدم قدم پر موجود تھے اور ڈاکٹر ماسن ان سے بچتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ یکا یک یخ بستہ ہوائیں اتنی شدت سے چلنے لگیں کہ کئی کئی گرم کپڑوں اور سمور کے باوجود جسم کے اندر خون جمنے لگا۔ خاص طور پر یہ ہوائیں آنکھوں کی بصارت پر بہت بُرا اثر ڈالتی تھیں اور تھوڑی دیر کے لیے تو آدمی بالکل اندھا ہو جاتا۔ اس حالت میں برفانی گڑھوں کو عبور کرنا جان جوکھوں کا کام تھا۔ چناں چہ ڈاکٹر ماسن نے وہیں خیمے لگا لیے۔

34 دن کے تکلیف دہ اور انتہائی صبر آزما سفر کے بعد وہ ہیڈ کوارٹر سے 315 میل دور ایک ایسے مقام پر پہنچ گئے جہاں ان سے پیشتر کسی انسان نے قدم نہیں رکھا تھا۔ یہاں انہوں نے سروے اور پیائش کا جو کام کرنا تھا' آسانی سے مکمل کیا اور واپسی کی تیاریاں کرنے لگے۔

اپنا سامان انہوں نے پھر پھسلنے والی گاڑیوں پر لادا۔ معلوم ہوا کہ ایک گاڑی کچھ خستہ اور خراب حالت میں ہے۔ اسے انہوں نے وہیں چھوڑا اور بقیہ دو گاڑیوں پر سامان کی تقسیم یوں کی کہ آگے رہنے والی گاڑی پر سائنسی آلات' خوراک کا تھوڑا سا ذخیرہ اور ایک خیمہ اور پچھلی گاڑی پر خوراک کا زیادہ حصہ اور خیموں کا بھاری سامان رکھا گیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اگر آگے جانے والی گاڑی کسی پوشیدہ گڑھے میں گر پڑے تب بھی خوراک کا وافر حصہ ان کے پاس محفوظ رہ جائے۔ ایکس ویرمز کی ڈیوٹی سب سے آگے لگائی گئی کہ وہ برفانی گڑھوں کا خیال رکھ کر رہنمائی کرے' کیونکہ اسے برف پر پھسلنے کی کافی مشق تھی۔ اس کے پیچھے پیچھے ڈاکٹر ماسن پہلی گاڑی اپنی نگرانی میں لے کر چلا اور ڈاکٹر ماسن کے پیچھے نِنس نے دوسری گاڑی کی ذمہ داری سنبھال لی۔

موسم خوش گوار اور صاف تھا۔ وہ ایک نرم برفانی میدان میں پھسلتے چلے جا رہے تھے۔ اس میدان میں برفانی گڑھوں کا کوئی خطرہ بھی نہ تھا۔ ابتدائی چار روز تک کسی حادثے اور رکاوٹ کے بغیر وہ آگے بڑھتے رہے' لیکن پانچویں دن دفعتہً ایک لرزہ خیز حادثہ پیش آیا۔ ایکس ویر حسب معمول سب سے آگے برف پر پھسلتا جا رہا تھا' اس کے پیچھے ڈاکٹر ماسن تھا اور ڈاکٹر ماسن کے پیچھے نِنّس کی گاڑی کو کُتے کھینچتے ہوئے آ رہے تھے کہ یکا یک ایک پُرشور آواز کے ساتھ برف پھٹی اور اس میں سے پانی نکلنے لگا۔ یہ یقیناً کوئی برفانی گڑھا تھا۔ ایکس ویر اور ڈاکٹر ماسن اس گڑھے سے آگے نکل چکے تھے' لیکن نِنّس پیچھے تھا۔ وہ دونوں پیچھے مڑے اور للکار کر نِنّس کو رُک جانے کی ہدایت کی مگر دوسرے ہی لمحے انہوں نے دیکھا کہ نِنّس' اس کی گاڑی اور کُتے اس گڑھے میں گر کر نظروں سے غائب ہو گئے۔ یہ وقت ایسا نازک اور خطرناک تھا کہ خود ان کی اپنی جانیں بھی خطرے میں تھیں' کیوں کہ برفانی گڑھا لمحہ بہ لمحہ وسیع ہوتا جا رہا تھا اور عین ممکن تھا کہ اس کے نیچے پانی کا دباؤ اور بڑھ جاتا تو جس مقام پر ایکس ویر اور ڈاکٹر ماسن کھڑے تھے وہاں بھی اچانک گڑھے نگل آتے۔ پس نِنّس کو انہوں نے موت کے فرشتے کے حوالے کیا اور خود آگے چل پڑے' لیکن تھوڑی دور جا کر جب انہوں نے پلٹ کر دیکھا تو برفانی گڑھا اپنی جگہ رُک گیا تھا۔ ڈاکٹر ماسن کا ضمیر بار بار اسے ملامت کر رہا تھا کہ نِنّس کو اس حال میں چھوڑ کر جانا انسانیت سے بعید ہے۔ اس نے بلند آواز سے ایکس ویر کو بلایا اور کہا: ''دوست! تُف ہے ہماری کم ہمتی اور بزدلی پر۔ نِنّس اگر مر گیا ہے تو ہم اسے بچا تو نہیں سکتے' لیکن اگر ہم اس طرح اپنی جانیں بچا کر بھاگ گئے تو خدا کے سامنے کیا جواب دیں گے۔'' رسّے کا ایک سرا ڈاکٹر ماسن نے اپنی کمر میں اور دوسرا سرا ایکس ویر کی کمر میں باندھا اور پھر دونوں پیٹ کے بَل ایک ایک انچ رینگتے ہوئے اس گڑھے کے کنارے تک پہنچے۔ گڑھے میں نظر ڈالتے ہی ان دونوں کے سر چکرا گئے۔ گڑھا اندازاً ڈیڑھ سو فٹ گہرا ہوگا اور اس کی تہہ اندھیرے میں چھپی ہوئی تھی

اور وہاں نِنّس اور چند کُتے کیا اگر ایک ہزار آدمی بھی گر جاتے' تو ان کا سراغ نہ ملتا۔ تاہم انہوں نے اس امید پر کہ شاید نِنّس زندہ ہو' حلق پھاڑ پھاڑ کر اسے آوازیں دیں' مگر ان کی آوازیں برفانی گڑھے میں ایک بھیانک گونج پیدا کر کے گڑھے میں گم ہو جاتیں۔ البتہ انہوں نے ایک دو مرتبہ کسی کُتے کے کراہنے اور ہلکے ہلکے بھونکنے کی آواز سُنی...... یہ آواز گڑھے میں سے آ رہی تھی۔ کُتے کی یہ آواز سُن کر ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کامل تین گھنٹے تک وہ وہیں رُک کر نِنّس کو پکارتے رہے مگر کوئی جواب نہ آیا...... مایوسی اور صدمے سے ان کی آنکھیں تر ہو گئیں۔ اپنے عزیز دوست اور رفیق کی یاد میں انہوں نے کافی دیر تک اپنے سر جھکائے رکھے' خدا کے حضور میں اس کی مغفرت کی دعا مانگی اور وہاں سے آگے روانہ ہوئے۔

ہیڈ کوارٹر اب بھی تین سو میل دور تھا اور ان کی گاڑی پر خوراک کی جو معمولی سی مقدار تھی' وہ صرف چند روز تک کفالت کر سکتی تھی اور اگر مزید کفایت سے کام لیا جاتا تو یہ خوراک دو ایک روز اور نکال دیتی......اس کے بعد کیا ہوگا؟ یہ سوال ڈاکٹر ماسن اور ایکس ویر کے ذہنوں پر لوہے کے ہتھوڑے کی مانند بار بار برس رہا تھا۔ اس بچی کھچی خوراک کے علاوہ ان کے پاس لکڑی کے پھسلنے والے دو لمبے لمبے تختے اور ایک خیمہ تھا جس میں ضرورت کے وقت وہ برف سے محفوظ ہو سکتے تھے۔ خوش قسمتی سے ڈاکٹر ماسن کی گاڑی پر اس سامان کے علاوہ دو گرم تھیلے بھی تھے جن میں وہ آرام سے سو سکتے تھے۔ چولہا اور مٹی کے تیل کی ایک بوتل بھی ان کے پاس تھی۔

خوراک کا آخری دانہ جب مقررہ وقت پر ختم ہو گیا' تو انہوں نے پیٹ بھرنے کے لیے کُتوں کا گوشت کھانے کا فیصلہ کیا......ڈاکٹر ماسن کی گاڑی کو تین کُتے کھینچ رہے تھے' انہوں نے مجبوراً ایک کُتے کو ہلاک کیا اور اس کے بدمزہ گوشت سے اپنا پیٹ بھرا......انہوں نے کُتے کا گوشت مٹی کے تیل کے چولہے پر اُبالا' اس کا بھیجا بھُنا' حتیٰ کہ کھال کے سوا' اس کے ہاتھ اور پیروں کی انگلیاں بھی اُبال لیں۔ ہڈیاں' کھال اور

آنتیں دوسرے کُتوں کو کھلا دی گئیں اور اس طرح کُتوں کے پیٹ بھرنے کا مسئلہ بھی حل ہو گیا...... اس طرح انہوں نے مزید چودہ دن کا سفر اور طے کر لیا اور پہلا کُتا کھانے کے پندرہ روز بعد انہوں نے آخری کُتا بھی ہڑپ کر ڈالا۔ ایکس اور ڈاکٹر ماسن کی حالت اس کے باوجود روز بروز دگرگوں اور خستہ ہوتی جا رہی تھی۔ کُتے کے گوشت نے ان کے جسمانی نظام پر بہت بُرا اثر ڈالا۔ اُن کے تن کے کپڑے بھی پھٹ رہے تھے اور ناقابل برداشت سردی کے باعث ان کے جسموں کی کھال آہستہ آہستہ اپنی جگہ چھوڑ رہی تھی۔ بال تو پہلے ہی جھڑ چکے تھے' لیکن کھال جھڑنے سے انہیں بہت زیادہ تکلیف کا سامنا کرنا پڑا۔ اونی کپڑوں کے روئیں جب نئی کھال کے ساتھ چھوتے تو سارے جسم میں درد کی ٹیسیں اٹھنے لگتیں۔ اس عذاب کے ساتھ انہیں سائنسی آلات سے لدی ہوئی گاڑی بھی کھینچنی پڑ رہی تھی۔ اب انہیں ایک اور پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ قطب نما کی سوئی دفعتہً ٹوٹ گئی اور اس طرح راستہ بھول جانے کا خطرہ موت کی شکل میں ان کی نگاہوں کے سامنے رقص کرنے لگا۔ ایکس ویری کی حالت روز بروز ابتر ہوتی جا رہی تھی۔ وہ خاصا ہٹا کٹا اور ورزشی جسم کا آدمی تھا' لیکن ناقابل برداشت بھوک' ٹھنڈ اور تھکن نے اسے ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا کر رکھ دیا۔ آخر سِسک سِسک کر ایک روز اس نے دم توڑ دیا...... اب ڈاکٹر ماسن اس دنیا میں' جہاں ہیبت ناک سناٹا طاری تھا اور حدِ نظر تک برف ہی برف دکھائی دیتی تھی' ایک حقیر اور ذلیل کیڑے کی مانند تنہا رہ گیا۔ ننّس کی موت کو چوبیس روز گزر چکے تھے اور سفر کا ابھی دو تہائی حصہ باقی تھا۔ ماسن کا جسم اگرچہ تھک چکا تھا' لیکن روح میں ابھی تک ولولے اور جوش کی وہی تازگی تھی جو قطب جنوبی کا سفر اختیار کرتے وقت اس میں پیدا ہوئی تھی۔ اس نے پھسلنے والی گاڑی پر سے زائد سامان اٹھا کر وہیں پھینک دیا اور اپنے سونے کے لیے صرف ایک تھیلا اور کُتے کے بچے کھچے گوشت کے چند ٹکڑے رہنے دیئے۔ اس نے سائنسی آلات اور دوسری قیمتی اشیاء بھی اِدھر اُدھر پھینک دیں' البتہ برف کھودنے کی چھوٹی سی کدال اپنے پاس رکھ لی کہ اس کی

قدم قدم پر ضرورت پڑتی تھی۔ تنہا اس نے ابھی چند میل کا سفر طے کیا تھا کہ اس کے پیروں میں شدید درد ہونے لگا۔ آخر مجبور ہو کر اس نے ٹھٹھرے ہوئے ہاتھوں سے اپنے جوتے اتارے اور یہ دیکھ کر اس کی روح سمٹ کر کلیجے میں آ گئی کہ جوتوں کے ساتھ ہی دونوں ایڑیوں کی گلی ہوئی کھال اس کے ہاتھوں میں آ چکی ہے۔ ایک لمحے کے لیے وہ پتھر کے بُت کی مانند ایڑیوں کی اس کھال کو تکتا رہا۔ اسّی میل کا سفر ابھی باقی تھا۔ وہ سوچنے لگا یہ سفر کیا میں کبھی طے کر سکوں گا۔ اس نے اون کی دھجیاں کس کر اپنی ایڑیوں پر باندھیں' جن پر نئی کھال آ رہی تھی' پھر جوتے اور مضبوطی سے باندھے اور خدا کا نام لے کر گرتا پڑتا اپنی منزل مقصود کی طرف چل پڑا۔

پانچ دنوں میں وہ بمشکل تیس میل طے کر پایا اور ابھی ہیڈ کوارٹر پچاس میل دور تھا۔ تھکن اور بھوک کے ہاتھوں نڈھال ہو کر وہ ستانے کے لیے ہر آدھے گھنٹے کے بعد برف پر لیٹ جاتا۔ پچاس میل...... پچاس میل...... اُف خدایا...... وہ سوچتا...... پچاس میل اُسے صدیوں کی راہ دکھائی دینے لگے۔ میں وہاں کبھی نہیں پہنچ سکتا...... کبھی نہیں...... لیکن پھر کوئی نادیدہ قوت اس کے جسم میں بیدار ہوتی اور اسے آگے بڑھنے پر اُکساتی...... ایکس ویری کی موت کے دس روز کے بعد جب کہ ڈاکٹر ماسن آخری گلیشیر بھی خیریت سے عبور کر چکا تھا' دفعتہً اس کے قدم ڈگمگائے' اس نے سنبھلنا چاہا' لیکن اسے احساس ہوا کہ زمین پاؤں تلے سے نکلی جا رہی ہے اور اس سے پہلے کہ وہ معاملے کی نزاکت سے آگاہ ہوتا' برف کی زمین شق ہوئی اور ڈاکٹر ماسن گہری تاریکی میں گرتا چلا گیا۔ پھر ایک جھٹکا سا لگا اور وہ گہرے گڑھے میں لٹک گیا۔ یہ حادثہ اتنی سرعت سے اور غیر متوقع طور پر پیش آیا کہ چند لمحوں کے لیے ڈاکٹر ماسن کے حواس جواب دے گئے۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا' تو اسے پتہ چلا کہ قدرت نے نہایت معجزانہ انداز میں اس کی جان بچائی ہے۔ برف پر پھسلنے والی گاڑی' جو رسّے کے ایک سرے سے بندھی ہوئی تھی' گڑھے کے کنارے آ کر برف میں دھنس گئی تھی اور

رسے کا دوسرا سرا ڈاکٹر ماسن کی کمر کے گرد بندھا ہوا تھا۔ گاڑی بھی اگر گڑھے میں آن پڑتی تو ڈاکٹر ماسن کسی طرح بھی زندہ نہیں بچ سکتا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ اس شدت کی سردی میں موت کی دہشت سے اس کے چہرے کا کھلا ہوا تھوڑا سا حصہ پسینے میں تر ہو گیا۔ رسے کی لمبائی چودہ فٹ تھی' اس لیے یہ اندازہ کرنا دشوار نہ تھا کہ وہ گڑھے میں چودہ فٹ کی گہرائی پر لٹک رہا ہے۔ اس قسم کے نازک حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے اس نے پہلے ہی رسے میں جابجا موٹی گرہیں لگا رکھی تھیں تاکہ انہیں پکڑ پکڑ کر آسانی سے اوپر چڑھا جا سکے۔ استقلال اور ہمت کے ساتھ رسے کی ان گرہوں کو اپنے ہاتھوں میں سختی سے تھامتا ہوا ڈاکٹر ماسن اوپر چڑھنے لگا...... یہ کام اگرچہ انتہائی خطرناک تھا' کیوں کہ کسی بھی وقت دھچکا لگنے پر برف میں اڑی ہوئی گاڑی وہاں سے ہٹ کر گڑھے میں گر سکتی تھی' تاہم وہ اس آسانی سے جان دینے پر آمادہ نہ تھا۔ ایک ایک انچ کر کے ڈیڑھ گھنٹے کی جدوجہد کے بعد وہ گڑھے کے کنارے تک پہنچ گیا۔ اس کا سانس پھول گیا تھا اور جسم کے روئیں روئیں میں سے جان نکلتی محسوس ہو رہی تھی' لیکن آہ...... قدرت کو ابھی ایک اور امتحان مقصود تھا۔ جونہی اس نے عجلت میں ایک ہاتھ سے رسہ چھوڑ کر کنارے پر پھنسی ہوئی گاڑی کو پکڑنا چاہا' اس کا ہاتھ پھسل گیا اور ایک بار پھر اس نے چودہ فٹ کی گہرائی میں اپنے آپ کو لٹکا ہوا پایا۔ اس کا سر زور سے چکرایا اور جسم میں تشنج کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ نقاہت اور کمزوری کے باعث وہ پہلے ہی جان ہار چکا تھا' اس کے قویٰ جواب دے چکے تھے اور زندہ رہنے کی آرزو یک لخت دم توڑ گئی تھی۔ اس کے جی میں آیا کہ چاقو سے رسہ کاٹ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے موت کی آغوش میں سو جائے۔ حقیقتاً وہ زندگی سے مایوس اور بیزار ہو چکا تھا' لیکن جب چاقو تلاش کرنے کے لیے اس نے ایک ہاتھ سے اپنی جیب ٹٹولی' تو چاقو غائب تھا۔ چاقو نہ جانے کہاں گر پڑا تھا...... رسے کے سہارے اسی طرح وہ دس منٹ تک لٹکا رہا۔ چودہ فٹ کی حقیر سی بلندی اب اسے ایورسٹ کی چوٹی معلوم ہو رہی تھی۔

ایک مرتبہ پھر اپنی قوت ارادی اور حوصلے کو مجتمع کر کے وہ رسے پر چڑھنے لگا۔ ایک انچ...... دو انچ ...... تین انچ...... آہستہ آہستہ...... وہ اوپر جا رہا تھا...... اس بار اُس نے نہایت احتیاط سے کام لیا۔ ہر بار رسے کی گرہ جب اس کے ہاتھ میں آتی' تو وہ اسے مضبوطی سے تھام لیتا اور کئی منٹ تک اپنا سانس درست کرنے کے بعد آگے بڑھتا۔ آخر وہ کنارے پر پہنچ گیا۔ گاڑی کا تختہ اس کے ہاتھ کی پہنچ سے اب ایک فٹ کے فاصلے پر تھا۔ گویا موت اور زندگی کے درمیان صرف ایک فٹ کا فاصلہ رہ گیا تھا...... کاش وہ یہ فاصلہ طے کر لے...... اس نے اوپر چڑھنے کے لیے آخری مرتبہ اپنی ساری قوت صرف کر دی...... ایک ہلکا سا جھٹکا لگا۔ گاڑی گڑھے کی طرف ذرا آگے سرکی...... ڈاکٹر ماسن کا کلیجہ منہ کو آنے لگا...... وہ پھر رک گیا۔ اب لکڑی کا تختہ اس کے ہاتھ کی انگلیوں کو چھو رہا تھا...... وہ اسے حسرت بھری نظروں سے تکنے لگا۔ لکڑی کا یہ معمولی سا تختہ اسے دنیا کی سب سے زیادہ قیمتی چیز معلوم ہو رہا تھا' کیوں کہ اسی تختے پر اس کی زندگی کا انحصار تھا۔ دھڑکتے دل اور کانپتے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ اس نے لپک کر ایک ہی دفعہ اس تختے کو پکڑ لیا...... اب وہ موت کے ظالم پنجوں سے آزاد ہو چکا تھا...... کافی دیر تک وہ وہیں گڑھے کے کنارے برف پر لیٹا ستاتا رہا...... پھر اٹھا اور گاڑی پر پھسلتا ہوا منزل مقصود کی طرف چلنے لگا۔

دو روز کے بعد یکایک ڈاکٹر ماسن نے محسوس کیا کہ اس کی رہی سہی جسمانی قوت میں بھی حیرت انگیز طور پر کمی واقع ہو رہی ہے۔ اب وہ دن بھر میں صرف چار میل چل سکتا تھا۔ اس نے حساب لگایا کہ ہیڈ کوارٹر اسے جس روز پہنچنا چاہیے تھا' اسے تو گزرے ہوئے پندرہ دن ہو چکے ہیں اور جہاز دس دن پیشتر ہی وہاں آ کر جماعت کے لوگوں کو اپنے ساتھ لے گیا ہوگا...... یہ خیال اسے مزید نڈھال کر رہا تھا' تاہم اس نے ہمت اور استقلال کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دیا اور سفر جاری رکھا۔ ہیڈ کوارٹر اب تیس میل دور رہ گیا تھا اور ڈاکٹر ماسن کے پاس صرف دو پونڈ کے قریب کتے کا گوشت باقی تھا۔

29 جنوری 1913ء کو دوپہر دو بجے کے قریب اس نے چمکتی ہوئی سفید برف پر دور ایک سیاہ دھبہ دیکھا...... وہ تیزی سے اس کے قریب پہنچا تو پتہ چلا کہ اس کے ساتھیوں نے اس امید پر کہ شاید ڈاکٹر ماسن یا اس کے دو ساتھیوں میں سے کوئی ادھر آ نکلے تو یہ نشان اسے مل جائے' برف کے ایک اونچے تودے پر خوراک سے بھرا ہوا ایک تھیلا رکھ دیا تھا۔ یہ تھیلا اسی روز اس کی جماعت کے آدمیوں نے وہاں صبح آٹھ بجے رکھا تھا۔

ڈاکٹر ماسن کو خوراک کا تھیلا کیا ملا' جیتے جی بہشت مل گئی...... مسلسل فاقوں اور کتے کے بدبودار بے مزہ گوشت نے اس کی ساری توانائیاں چھین لی تھیں۔ اس نے جی بھر کر غذا کھائی اور کافی دیر تک آرام کرنے کے بعد آگے بڑھا۔ ہیڈ کوارٹر اب 23 میل کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔ تازہ خوراک نے اس کی جسمانی قوت بحال کرنے میں بڑی مدد کی اور ایک نیا حوصلہ اور جوش اس کی طبیعت میں پیدا ہوا۔ خوش قسمتی سے وہ ایک ایسے ڈھلوان میدان میں پہنچ گیا جہاں تیز ہوا خود بخود اس کی گاڑی کو برف پر گھسیٹے لیے جا رہی تھی۔ اس روز ڈاکٹر ماسن نے چودہ میل کا سفر آسانی سے طے کر لیا' لیکن دوسرے روز جب وہ آگے بڑھنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ برف کا ایک زبردست طوفان آیا جس نے ڈاکٹر ماسن کی گاڑی کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ یہ طوفان یکم فروری کی دوپہر کو ختم ہوا اور ڈاکٹر ماسن نے اپنے آپ کو ایسے مقام پر پایا جہاں اس کے آنے سے پہلے جماعت کے آدمی قیام کر چکے تھے' کیوں کہ وہاں اس نے زمین کے اندر برف کا ایک آرام دہ تہہ خانہ پایا جس میں تازہ پھلوں کی موجودگی ظاہر کرتی تھی کہ انہیں لینے کے لیے جو جہاز آنے والا تھا' نہ صرف وہ آ چکا ہے بلکہ خوراک کا وافر ذخیرہ بھی ساتھ لایا ہے۔

دو فروری کو جب اس نے ہیڈ کوارٹر کی طرف بڑھنا چاہا تو عین اس وقت شدت کا طوفان آیا۔ اتفاق دیکھیے کہ ہیڈ کوارٹر اب صرف پانچ میل دور تھا۔ صرف ایک روز کا سفر...... مگر وہ طوفان کے ہاتھوں بے بس اور مجبور تھا۔ دراصل برفانی طوفانوں کا موسم شروع ہو چکا تھا اور یہ طوفان کئی کئی دن تک مسلسل آتے رہتے تھے۔ ڈاکٹر ماسن

پورے چھ روز تک اسی تہہ خانے میں دبکا بیٹھا رہا اور جب 8 فروری 1913ء کو اس نے باہر نکلنا چاہا تو پتہ چلا کہ تہہ خانے کے اوپر برف کے تودے جمے ہوئے ہیں۔ اس موقعے پر اس کا چھوٹا سا پھاوڑا کام آیا...... اس نے جلد جلد برف کھود کر ایک طرف ہٹائی اور باہر نکلا۔ جب وہ گرتا پڑتا ہیڈ کوارٹر کے نزدیک پہنچا تو وہاں صرف ایک خیمہ لگا ہوا تھا۔ ڈاکٹر ماسن سوچنے لگا کیا سب لوگ جہاز میں سوار ہو کر واپس چلے گئے ہیں...... اس کا دل دھک دھک کرنے لگا...... لیکن فوراً ہی اس کی نظر چند آدمیوں پر پڑی...... ایکس ویر کی موت کو 33 روز گزر چکے تھے اور اتنے دن بعد ڈاکٹر ماسن نے پہلی بار آدمی کی شکل دیکھی تھی۔ وہ بے اختیار چلایا اور دونوں ہاتھوں سے اشارے کرنے لگا...... آدمیوں نے اسے دیکھا اور دوڑتے ہوئے آئے...... اتنے میں ڈاکٹر ماسن غش کھا کر برف پر گر چکا تھا۔

جب اسے ہوش آیا تو اسے بتایا گیا کہ جہاز آیا تھا اور چند نئے آدمیوں کو چھوڑ کر واپس جا چکا ہے اور اب دسمبر کے مہینے میں آئے گا۔ ڈاکٹر ماسن جلد ہی تندرست ہو گیا...... اس نے 90 دن کا ہولناک سفر بالآخر ختم کر لیا تھا۔ بعد ازاں اس نے انٹارکٹک میں تحقیق کا زبردست کام کیا اور جب 26 فروری 1914ء کو آسٹریلیا پہنچا تو بندرگاہ پر سارا شہر اس کے استقبال کے لیے امنڈ آیا...... بادشاہ نے کارہائے نمایاں سے خوش ہو کر اسے نائٹ بنا دیا۔ ڈاکٹر ماسن نے بعد ازاں پہلی جنگ عظیم میں حصہ لیا اور پھر اپنے علمی و تحقیقی کام میں مصروف ہو گیا۔ آسٹریلیا' انگلستان' فرانس' اٹلی اور امریکہ کی تمام جغرافیائی انجمنوں اور یونیورسٹیوں نے اُسے اعزازی ڈگریاں دیں اور اس کے کارناموں کا اعتراف کیا۔

* * *

26 دن 26 راتیں

9 مارچ 1942ء کی وہ آدھی رات ایک ڈراؤنے خواب کی مانند مجھے آج بھی یاد ہے جب تارپیڈو نے ہمارے جہاز ''روز بوم'' کو غرق کر دیا تھا۔ تین روز پیشتر یہ جہاز پڈانگ سماٹرا سے سنگاپور کی طرف روانہ ہوا تھا۔ اس میں کُل پانچ سو افراد سوار تھے جن میں فوجی سپاہی' سول سروس کے آفیسرز' ان کے بیوی بچے اور بہت سے پناہ گزین شامل تھے...... جہاز کے ڈیک پر گھُپ اندھیرا تھا اور ہر طرف موت کی سی خاموشی طاری تھی' البتہ سمندر کی لہروں کا مدھم شور اور جہاز کے انجن کی آواز اس خاموشی میں مخل ہو رہی تھی۔ حادثے سے آدھ گھنٹہ پہلے میں ڈیک پر پاؤں پسار کر سویا تھا۔ یکا یک ایک قیامت خیز دھماکے نے مجھے بیدار کر دیا۔ جہاز روز بوم دائیں جانب جھک رہا تھا اور سینکڑوں لوگوں کے چیخنے چلانے اور ادھر اُدھر دوڑنے کی آوازوں سے ایک ہنگامہ برپا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھتا رہا کہ شاید میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ لیکن نہیں...... یہ خواب نہیں حقیقت تھی۔ جہاز کے لاؤڈ سپیکر پر کوئی چلا رہا تھا۔

''جلدی کرو...... سمندر میں کود جاؤ...... لائف بوٹ بائیں جانب ہے...... جہاز غرق ہو رہا ہے......'' بس یہی آوازیں تھیں جو میرے کانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ اس کے بعد پانی کی ایک زبردست لہر آئی اور اس نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ میں اب سمندر کے یخ بستہ پانی میں ڈبکیاں کھا رہا تھا اور بہت سے لوگ ڈوبتے ہوئے جہاز میں سے چھلانگیں لگا رہے تھے۔

مجھے نہیں معلوم کہ میں کس طرح جہاز کے ایک بڑے تختے پر پہنچ گیا جس پر ایک بوڑھا شخص پہلے سے سوار تھا۔ ہم دونوں اس تختے سے چمٹے ہوئے دور تک بہتے چلے گئے۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے جہاز میں آگ بھڑک اٹھی جس نے چشم زدن میں سارے جہاز کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ خدا کی پناہ ایسا بھیانک منظر میں نے اپنی زندگی میں پھر کبھی نہیں دیکھا۔ آگ کے شعلے آسمان کو چھو لینا چاہتے تھے اور ہر لمحہ دھماکوں کی آوازیں کانوں کے پردے پھاڑتی ہوئی نکل جاتی تھیں۔ جہاز آہستہ آہستہ پانی کے اندر غائب ہوتا جا رہا تھا اور بہت سے لوگ جواب بھی اس پر موجود تھے' فرار کی کوئی راہ نہ پا کر سمندر میں چھلانگیں لگا رہے تھے اور غرق ہو رہے تھے۔ اسی لمحے میں نے اس لائف بوٹ کو دیکھا جو جہاز سے صرف پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر ہچکولے کھا رہی تھی۔ جو لوگ تیرنا جانتے تھے وہ بے تابی سے ہاتھ پاؤں مار کر اس کشتی تک پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔

ہمارا تختہ کشتی سے دوسری سمت میں جا رہا تھا' اور یہ بات نہایت ہی خطرناک تھی۔ نامعلوم ہم کب تک سمندر کی بیکراں وسعتوں میں بھٹکتے رہے۔ میرا ساتھی تیرنا جانتا تھا۔ ہم دونوں نے تختے سے چھلانگیں لگائیں اور تیرتے ہوئے لائف بوٹ کی طرف بڑھے۔ کشتی میں کھڑے ہوئے چند سپاہیوں نے ہمیں بمشکل کھینچ کھانچ کر اوپر چڑھایا۔ چڑھنے کو تو ہم کشتی میں چڑھ گئے لیکن ہر لحظہ یوں احساس ہوتا تھا جیسے یہ اب ہی ڈوب جانے والی ہے۔ اٹھائیس فٹ لمبی اور آٹھ فٹ چوڑی لائف بوٹ میں آدمی کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے جن کے بوجھ سے کشتی پانی کے اندر کناروں تک ڈوب چکی تھی۔ صبح تک یہ کشتی پانی کے رحم و کرم پر اسی طرح ایک انجانی منزل کی طرف بڑھتی رہی اور جب سورج کی روشن پیشانی سمندر کے مشرقی کنارے سے نمودار ہوئی' تو کشتی میں سوار تمام مصیبت زدہ افراد نے ایک دوسرے کا جائزہ لیا۔ کُل اسّی افراد تھے اور کشتی صرف اٹھائیس مسافروں کے لیے بنائی گئی تھی۔ اب آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ لوگ اس

میں کس طرح سمائے ہوں گے۔ اکثر لوگ ایک دوسرے کے اوپر لدے کھڑے تھے' بعض پشت سے پشت ملائے ہوئے تھے۔ کسی کے لیے بھی اِدھر اُدھر حرکت یا جُنبش کرنا محال تھا۔ ان میں جہاز روز بوم کا کپتان اور بریگیڈیئر آرچی جیسے نامی گرامی فوجی افسر بھی شامل تھے جنھوں نے گیارھویں انڈین ڈویژن کی کمان کی تھی۔ کشتی میں تین عورتیں بھی تھیں۔ ان میں سے ایک عمر رسیدہ عورت مسز نن تھی جسے میں نے پہلی نظر ہی میں پہچان لیا۔ اس کا شوہر سنگاپور میں کسی سرکاری محکمے کا افسر تھا۔ دوسری تیس سالہ عورت کسی ڈچ افسر کی بیوی اور تیسری عورت ڈورس لِم چینی تھی۔ اس کا تعلق برطانیہ کی خفیہ جاسوسی تنظیم سے تھا۔

بریگیڈیئر آرچی نے اپنی چمکتی ہوئی آنکھوں سے کشتی کے ہر مسافر کا جائزہ لیا اور پکار کر سب کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اس کے چہرے پر بے چینی' خوف' تھکن اور اضطراب کی کوئی علامت نہیں تھی۔ وہ اس طرح پرسکون اور ہشاش بشاش دکھائی دے رہا تھا جس طرح میدان جنگ میں نظر آتا تھا۔ وہ اپنی جگہ پر فوجی انداز میں تن کر یوں کھڑا جیسے پریڈ کے میدان میں اپنی فوج کی سلامی لے رہا ہو۔ اس نے باوقار اور بلند آواز میں کہا

''وہ تمام لوگ جو اس لائف بوٹ میں پناہ لے چکے ہیں' میرے احکام غور سے سنیں۔ کپتان صاحب اس کشتی کے نگران اور محافظ ہوں گے اور میری ذمے داری یہ ہے کہ میں یہاں کوئی گڑبڑ نہ پھیلنے دوں۔ اور میں آپ سے بھی درخواست کروں گا کہ جب تک مدد نہیں پہنچتی آپ لوگ ایک دوسرے سے تعاون کریں اور حتی الامکان کسی کو تکلیف نہ ہونے دیں۔ یہ وقت بھائی چارے کا ہے۔ ہمارے پاس خوراک اور پانی کی تھوڑی سی مقدار موجود ہے۔ ہم اسے صحیح طریق پر استعمال کریں گے۔ خدا ہم پر رحم کرے۔''

ان الفاظ کے ساتھ بریگیڈیئر آرچی نے اپنی مختصر تقریر ختم کر دی۔ ہر شخص دھڑکتے ہوئے دل اور پتھرائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اسے دیکھ رہا تھا۔ بعد میں کپتان صاحب نے کہا:

''خشک دودھ اور پانی کا ایک چمچہ صبح اور ایک چمچہ شام کو تقسیم ہوا کرے گا اور بس۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس گوشت کے چند ڈبے بھی محفوظ ہیں۔ ہر ڈبے میں 12 اونس گوشت ہے۔ حساب کے مطابق ہر ڈبہ بارہ آدمیوں میں تقسیم کیا جائے گا۔''

آپ شاید اندازہ نہ کر سکیں کہ یہ حکم سن کر بدنصیب لوگوں کی کیا حالت ہوئی۔ جہاز کے حادثے اور اپنے دوستوں اور بال بچوں سے بچھڑ جانے کا غم پہلے ہی تھا اور اب فاقہ کشی اور تشنہ لبی کا ایک مہیب اژدہا ان کے سامنے منہ کھولے کھڑا تھا۔ کشتی پر سوار اسی افراد میں سے بیشتر زخمی بھی تھے۔ کسی کا سر زخمی تھا تو کسی کا سینہ۔ چند لوگوں کے بازوؤں اور چہرے پر خراشوں کے گہرے نشانات تھے' مگر ان کے لیے کہیں آرام کرنے کی جگہ نہ تھی۔ سورج کی حدت سے محفوظ رہنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ پینے کو نہ پانی تھا اور نہ کھانے کے لیے خوراک۔ غرضیکہ ان بدنصیبوں پر جان کنی کی سی کیفیت طاری تھی۔

دوپہر کے وقت جب کہ ہماری کشتی سمندر کی بپھری ہوئی موجوں کے تھپیڑے کھاتی کسی نامعلوم منزل کی طرف بڑھ رہی تھی' انڈین آرمی آرڈی ننس کا لیفٹیننٹ کرنل ڈگلس سمندر میں تیرتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ بہادر اور باہمت آدمی نجانے کب سے کشتی کا تعاقب کر رہا تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے میجر میکڈانلڈ تھا۔ وہ دونوں جلد ہی کشتی کے قریب پہنچ گئے اور ہم لوگوں نے انہیں سہارا دے کر کشتی میں سوار کرا لیا۔ کرنل ڈگلس نے ہانپتے ہوئے اپنی روداد سنائی:

''خوش قسمتی سے ہمارے ہاتھ ایک لمبا تختہ لگ گیا تھا۔ میں نے اور میجر میکڈانلڈ نے اس پر پناہ لی۔ ہمارے قریب ہی ایک عورت سمندر میں ڈبکیاں کھا رہی تھی۔ ہم نے بمشکل اسے نکالا اور تختے پر سوار کر لیا۔ جہاز جب پھٹا ہے تو عورت کی ایک ٹانگ بھی

اس حادثے میں ضائع ہوگئی تھی۔ وہ اس وقت بے ہوش تھی۔ دو گھنٹے تک وہ ہمارے ساتھ اسی تختے پر رہی اور اس بے ہوشی کے عالم میں اس کی حرکت قلب بند ہوگئی۔
ہمارے اردگرد سمندر میں بے شمار مرد' عورتیں اور بچے ڈبکیاں کھا رہے تھے۔ بہت سی لاشیں تیر رہی تھیں اور خود ہمارا ذہنی توازن بھی بگڑ چکا تھا۔ رات بھر ہم مُردوں کی طرح اس تختے پر پڑے بہتے رہے۔ ہمیں اتنا معلوم تھا کہ ایک لائف بوٹ چند آدمیوں کو بچا کر لے جانے میں کامیاب ہوگئی ہے۔ صبح سویرے ہمارے حواس کچھ بجا ہوئے تو ہم نے سوچا اس کشتی کا پیچھا کرنا چاہیے وہ ابھی زیادہ دور نہیں گئی ہوگی۔ میجر میکڈانلڈ کی پشت پر بندھے ہوئے تھیلے میں بسکٹوں کے ڈبے اور شراب کی دو بوتلیں تھیں۔ ان چیزوں نے ہمیں بڑی تقویت پہنچائی۔ آخر ہم یہاں تک آ جانے میں کامیاب ہوگئے۔"
میں نے میجر میکڈانلڈ کو دیکھا۔ وہ تو شاید اس وقت بھی اپنے حواس میں نہ تھا۔ برانڈی کی آدھی بوتل اس کے ہاتھ میں تھی جسے وہ بار بار اپنے منہ تک لے جاتا۔ کبھی کبھی وہ وحشیانہ انداز میں چاروں طرف گھورنے لگتا اور آپ ہی آپ مسکراتا۔ اتنے میں ڈگلس نے پھر سلسلہ تقریر شروع کر دیا۔ اس مرتبہ اس کا لہجہ بہت عجیب تھا۔
"یہ کم بخت میکڈانلڈ پاگل ہوگیا ہے۔ اس نے راستے میں مجھے تختے پر سے گرانے کی کوشش کی تھی۔ وہ تو تقدیر اچھی تھی کہ میں بچ گیا ورنہ اس ظالم نے اپنی طرف سے کوئی کسر باقی نہ رکھی تھی۔"
دیکھتے ہی دیکھتے کرنل ڈگلس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ آنکھیں باہر کو اُبل پڑیں اور ہونٹ کپکپانے لگے۔ اور اب وہ انگریزی کے بجائے اردو میں تقریر کرنے لگا۔ پھر یک لخت قہقہہ مار کر ہنسا اور اپنے اردگرد کھڑے ہوئے حیرت زدہ افراد کو گھونسے مارنے کی کوشش کی۔ چند آدمیوں نے اسے جکڑ لیا۔ تب کہیں اس کا وحشیانہ پن ختم ہوا۔ اتنے میں کسی نے چلّا کر کہا:

"اس بدمعاش کو سمندر میں پھینک دو۔" سب نے گھوم کر اس آواز دینے والے کو دیکھا۔ میجر میکڈانلڈ تھا۔ تب بریگیڈیئر آرچی نے مداخلت کی اور سخت لہجے میں ان دونوں کو ڈانٹ پلائی...... وہ پورا دن ہمیں کشتی پر گزر گیا۔ کہیں سے کوئی مدد نہ آئی۔ ہمارے اردگرد حد نظر تک سمندر ہی سمندر پھیلا ہوا تھا جس میں ایک معمولی سی کشتی بھٹکتی چلی جا رہی تھی۔ دن بھر بھوک پیاس اور گرمی کی شدت نے ہر شخص کو بدحواس اور بے چین کر دیا تھا۔ زخمیوں کی حالت تو بہت ہی بُری تھی۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی دن کے مہمان ہیں۔ اُدھر کشتی کا یہ حال تھا کہ آدمیوں کے ناقابل برداشت بوجھ سے بار بار اس کے اُلٹ جانے کا خطرہ پیدا ہو رہا تھا۔ اس صورت میں شاید کوئی بھی زندہ نہ بچتا۔ دوسرے روز علی الصبح جب خشک دودھ اور پانی تقسیم ہونے لگا تو بہت سے لوگوں میں اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ اپنی جگہ کھڑے رہ سکتے۔ دفعتہً شور ہوا کہ کرنل ڈگلس مرا پڑا ہے۔ اس کی لاش اکڑی ہوئی تھی۔ نامعلوم وہ رات کو کس وقت چل بسا۔ بریگیڈیئر کے حکم سے اس کی لاش سمندر کی لہروں کے حوالے کر دی گئی۔ اور اس طرح میجر میکڈانلڈز کی بات حیرت انگیز طور پر پوری ہوگئی جو اس نے بارہ گھنٹے پیشتر کہی تھی۔
کشتی میں ایک اور شخص میجر نویل کوری بھی تھا جو جہاز روز بوم میں فوجی انجینئر کے عہدہ پر کام کرتا تھا اس نے دیکھا کہ کشتی کے اردگرد کچھ فاصلے پر چند بڑے بڑے تختے پانی کی لہروں پر اچھلتے بہتے چلے جا رہے ہیں۔ وہ چلایا: "ان تختوں کو جوڑ کر اگر ہم کشتی کے پیچھے باندھ دیں تو بہت سے آدمیوں کے لیے جگہ نکل سکتی ہے۔"
کپتان اور بریگیڈیئر آرچی نے اس تجویز سے اتفاق کیا۔ چند سپاہی' جن کے قویٰ ابھی مضبوط تھے' فوراً تیرتے ہوئے گئے اور تختوں کو کھینچ کر کشتی کے قریب لے آئے۔ پھر انتہائی جدوجہد اور استقلال سے میجر نویل نے ان تختوں کو کپڑوں کی دھجیوں اور رسیوں سے باندھا اور کشتی کے پیچھے لگا دیا۔ پھر ایک ایک کر کے بیس آدمی ان تختوں پر اتار دیئے گئے۔ ان آدمیوں میں میجر نویل بھی شامل تھا۔ اس طرح کشتی کے اندر خاصی

یہ وقت نہایت احتیاط اور ہوشیاری سے کام لینے کا تھا اور معمولی سی غلطی یا جلد بازی کا نتیجہ مہلک ثابت ہو سکتا تھا۔ میں نے اپنے گردوپیش کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ یہ لکڑی کی بنی ہوئی ایک مضبوط جھونپڑی تھی جس کی شمالی دیوار کے ساتھ میں چھپا کھڑا تھا۔ اس کا دروازہ دوسرے رخ تھا۔ یکا یک میں نے اپنے عقب میں آہٹ سی سنی۔ میں فوراً ہی پیچھے مُڑا، تو وہاں ایک دراز قامت بوڑھے کو کھڑے پایا جو اپنی روشن آنکھوں سے میری جانب دیکھ رہا تھا۔ میرا دایاں بازو فوراً ہی فضا میں بلند ہوا اور قریب تھا کہ میں اپنا دس سیر وزنی ہتھوڑا بوڑھے کے سر پر دے ماروں کہ وہ آہستہ سے بولا: ''ٹھہرو...... میں تمہیں نقصان نہیں پہنچاؤں گا...... کیا تم ان مفرور قیدیوں میں سے ایک ہو جن کی گرفتاری پر انعام کا اعلان کیا گیا ہے؟''

میرا اٹھا ہوا ہاتھ رُک گیا...... میں نے اس بوڑھے کا گہری نظروں سے جائزہ لیا۔ اس کی عمر اسّی نوے برس سے کسی طرح کم نہ تھی، کیوں کہ لمبی گھنی ڈاڑھی کے ساتھ ساتھ اس کی بھنویں بھی سپید ہو چکی تھیں۔ اس کی صحت قابلِ رشک تھی۔ خصوصاً اس کی آنکھوں کی بے پناہ چمک نے مجھے بڑی حد تک مرعوب کر دیا۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ میں کیا کہوں کہ وہ دوبارہ بولا۔ اس مرتبہ اس کا لہجہ مشفقانہ تھا۔

''میرے بچے، گھبراؤ نہیں...... میں تمہاری مدد کروں گا...... آؤ میرے ساتھ......''

اُس نے آہستہ سے جھونپڑی کے دروازے کو دھکا دیا اور مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے اندر چلا گیا...... جھونپڑی کے اندر اسی کی عمر کے تین بوڑھے اور تھے۔ جب میں اندر گیا، تو انہوں نے دروازہ بند کر دیا اور اس طرح میرا جائزہ لینے لگے جیسے میں کسی اور دنیا کی مخلوق تھا۔ ان میں سے ایک نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا:

''دیکھو جوان...... سب سے پہلے تم ہمیں یہ بتاؤ کہ تمہارے پاس مال کتنا ہے؟ اس کے بعد ہی ہم تمہارے متعلق کچھ سوچیں گے؟''

''میرے پاس دو سو فرانک ہیں۔''

''آہ...... دو سو فرانک؟'' وہ تینوں بیک وقت بول پڑے۔ ''تم جھوٹ کہتے ہو۔''

میں نے پتلون کی اندرونی خفیہ جیب میں ہاتھ ڈالا اور نوٹ نکال کر ان کے آگے پھینک دیئے۔

''اوہ خدایا...... یہ تو واقعی دو سو فرانک ہیں......'' اُن کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ وہ رازدارانہ انداز میں ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرتے رہے۔ پھر وہی بوڑھا جو مجھے جھونپڑی میں لایا تھا، کہنے لگا:

''ٹھیک ہے۔ ہم تمہاری مدد کرنے کے لیے تیار ہیں۔ سورج نکلنے سے پہلے ہم تمہیں دریا تک پہنچا دیں گے۔ کشتی کا انتظام بھی ہو جائے گا، لیکن ایک بات کا وعدہ تمہیں کرنا ہوگا۔''

''وہ کیا؟''

''اگر خدانخواستہ تم پکڑے گئے، تو تم ہمارے بارے میں کبھی زبان نہ کھولو گے۔ بولو منظور ہے؟''

''میں وعدہ کرتا ہوں کہ خواہ کچھ ہو تمہارا ذکر میرے ہونٹوں پر نہ آئے گا۔''

''شاباش...... اب تم غور سے ہماری بات سنو اور اس پر عمل کرو...... سب سے پہلے تم یہ پتلون اتار کر وہ نیکر پہن لو...... اس کے بعد تم اس اُسترے سے اپنی ڈاڑھی مونڈ ڈالو۔ صبح چار بجے ان پہرے داروں کی ڈیوٹی بدلتی ہے۔ نئے پہرے دار عموماً آدھ گھنٹہ تاخیر سے آتے ہیں۔ بس اسی آدھے گھنٹے میں تم دریا تک پہنچ سکو گے۔ اس وقت تک بستی کے دوسرے لوگ بھی باہر نکل آتے ہیں، لیکن دریا پر جانے کی اجازت آج کل کسی کو نہیں ہے۔ تمہیں احتیاط سے کام لینا پڑے گا۔ تم کونے میں پڑی ہوئی یہ ٹوکری اور اپنا ہتھوڑا اٹھا کر باہر نکل جانا...... راہ میں کسی سے بات نہ کرنا...... تمہارا رُخ بستی کے جنوب میں ہونا چاہیے۔ جب تم دور نکل جاؤ گے، تو ایک بلند پہاڑی دکھائی دے گی۔ اس پہاڑی کے دائیں طرف ایک چھوٹی سی جھونپڑی بنی ہے، اس میں ایک ماہی

کھلی جگہ نکل آئی اور وہ لوگ جو دو دن اور دو راتوں سے مسلسل ایک ہی جگہ کھڑے تھے' آرام سے اپنی اپنی جگہ ایک دوسرے سے لگ کر بیٹھ گئے۔ ہر شخص اپنی زندگی سے بیزار اور دوسرے کی جان کا لاگو دکھائی دیتا تھا۔ ایک ایک انچ جگہ پر جھگڑا ہونے لگتا تھا۔ تیسرا دن بھی اسی طرح گزر گیا۔ آدھی رات کو' جب کہ کشتی کے سب لوگ بے خبر پڑے تھے' ایک بے پناہ شور سنائی دیا۔ معلوم ہوا کہ کشتی کے پیچھے بندھے ہوئے تختے جن رسیوں اور کپڑوں کی دھجیوں سے بندھے ہوئے تھے' وہ ٹوٹ گئی ہیں اور ان پر بیٹھے ہوئے بیس آدمیوں کو سمندر کی لہریں بہائے لیے جا رہی ہیں۔ بدقسمتی سے ان میں کوئی بھی شخص تیرنا نہیں جانتا تھا اور نہ ان کی مدد کے لیے کشتی سے کوئی پہنچا۔ یہ بے چارے سب کے سب چیختے چلاتے غرق ہوگئے۔ ان میں میجر نویل بھی شامل تھا۔ صبح چند افراد کی لاشیں کشتی سے دور کافی فاصلے پر تیرتی ہوئی پائی گئیں' لیکن کشتی میں سوار کسی آدمی کو بھی ان کی حسرت ناک موت کا صدمہ نہ تھا۔

میں نے کئی لوگوں کے چہروں پر اطمینان اور مسرت کی کرنیں رقص کرتی دیکھیں۔ انہیں بیس آدمیوں کے یک لخت ختم ہو جانے کا حقیقتاً کوئی صدمہ نہ تھا۔ اس کے برعکس خوش ہو رہے تھے کہ مرنے والوں کے حصے کی خوراک بھی انہیں ملے گی۔

دن بھر سورج کی گرمی میں تپ تپ کر ہمارے جسم سیاہ اور چمڑے کی مانند سخت ہوگئے۔ پیاس کی شدت کے باعث منہ سوکھ کر کانٹا ہوگئے اور زبانیں سکڑ کر رہ گئی تھیں۔ تین دن کی بھوک اور مسلسل فاقہ کشی نے اگرچہ ہماری کمر توڑ دی تھی۔ تاہم اتنی قوت باقی تھی کہ ہم ایک دوسرے کو سہارا دے سکتے یا اِدھر اُدھر حرکت کر سکتے تھے۔ ہمارے لیے احکامات یہ تھے کہ سمندر کا پانی کسی قیمت پر بھی نہ پیا جائے' لیکن یہ حکم رات کی تاریکی میں ٹوٹ جاتا تھا اور لوگ سمندر کا نمکین اور تلخ پانی پی لیتے تھے۔ دن کے وقت بریگیڈیئر کے خوف سے کوئی شخص سمندر کا پانی نہ پیتا تھا۔ آخر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو لوگ سمندر کا پانی پیتے رہے' وہ یکے بعد دیگرے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گئے اور ہم نے ان کی لاشیں' مچھلیوں کی خوراک بننے کے لیے سمندر میں پھینک دیں۔

دن کو جونہی آفتاب کی حدت اپنے عروج پر پہنچتی' کشتی کے اندر بیٹھے ہوئے اور ایک دوسرے کے اوپر گرے ہوئے بدنصیب افراد پر جاں کنی کی سی کیفیت طاری ہو جاتی۔ بالکل یوں محسوس ہوتا جیسے ہمارے جسموں میں سوئیاں گرم کر کے چبھوئی جا رہی ہیں۔ اس عذاب سے محفوظ رہنے کے لیے اکثر لوگوں اپنے اپنے کپڑے پھاڑ دیئے اور انہیں سمندر کے پانی میں بھگو کر اپنے سروں اور بازوؤں پر رکھنے لگے۔ لیکن جوں ہی یہ پانی خشک ہوتا اور نمک کے ذرے جسم سے چمٹنے لگتے' تو سخت تکلیف ہوتی۔ زخم پر نمک چھڑکنے کا محاورہ کتابوں میں پڑھا تھا۔ کشتی کے اس ہولناک سفر میں اس کی صداقت مجھ پر عیاں ہوگئی۔

اس کے بعد یوں ہوا کہ لوگوں کے ذہن اور دماغ جواب دے گئے۔ ہر شخص دیوانے پن کا شکار تھا۔ بیداری کی حالت میں ہم عجیب و غریب خواب دیکھتے۔ ایک روز صبح ایک شخص کہہ رہا تھا:

''بس اب ہمارے مصیبت ختم ہونے والی ہے۔ رات میں نے ایک اُڑنے والی کشتی دیکھی تھی۔ وہ ہم سب کو یہاں سے نکال کر لے جائے گی۔''

یہ بات سن کر کسی اور نے حیرت سے پوچھا: ''اُڑنے والی کشتی!''

''ہاں......ہاں......'' پہلے نے جواب دیا: ''میں نے خود اسے دیکھا ہے۔ وہ کشتی بچوں اور زخمیوں کو لے گئی ہے۔''

اُسی وقت ایک سپاہی سمندر کی طرف جھکا اور چلوؤں میں پانی بھر بھر کر پینے لگا۔

''آہا......بڑا میٹھا اور تازہ پانی ہے۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے سمندر میں چھلانگ لگا دی اور چند ہی منٹ میں لہریں اسے اپنے ساتھ بہا کر لے گئیں۔

آہستہ آہستہ کشتی کے تمام مسافروں کے درمیان بھائی چارے اور ہمدردی کے بجائے دشمنی اور بے اتفاقی نے جگہ لے لی۔ ہر شخص دوسرے کے خون کا پیاسا نظر آنے

لگا اور ہر ایک کی کوشش یہی ہوتی کہ دوسرے کے حصے کی خوراک اور پانی چھین کر خود ہضم کر جائے۔ جو طاقت ور تھے وہ کم زوروں کو دبانے اور ستانے لگے۔ ابتداء میں راشن پانی پر کڑی نگرانی رکھی گئی' لیکن حالات جوں جوں خراب ہوتے گئے' لوگوں نے لوٹ مار پر کمر باندھ لی۔ ایک رات ایسا معلوم ہوا کہ دو شخص آپس میں گتھم گتھا ہو رہے ہیں۔ پھر ان میں سے ایک چیخنے لگا۔ اور دوسرے ہی لمحے سمندر میں کسی شئے کے پھینکے جانے کی آواز سنائی دی۔ دوسرے روز پتہ چلا کہ ایک سارجنٹ میجر کشتی میں موجود نہیں۔ نہ معلوم اسے کس نے ہلاک کر کے سمندر میں پھینک دیا۔ پھر تو ایسی قیامت آئی کہ روزانہ ایک ایک دو دو آدمی غائب ہونے لگے۔ کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ کون سا نادیدہ ہاتھ ہے جو رات کی تاریکی میں کسی کا گلا گھونٹ کر اسے سمندر کے حوالے کر دیتا ہے۔ سبھی لوگ سہمے ہوئے اور مضطرب نظر آتے تھے' مگر کسی میں اتنی ہمت باقی نہ تھی کہ اس بھیانک صورت حال کا تجزیہ کر سکتا۔

لیکن ایک رات ہمیں پتہ چل ہی گیا کہ ان وارداتوں کے پیچھے کس کا ہاتھ کام کر رہا ہے۔ یہ دراصل پانچ آدمیوں کا ایک گروہ تھا جس نے کشتی کے ایک گوشے میں کئی روز سے قبضہ جما رکھا تھا۔ یہ لوگ آپس میں چپکے ہی چپکے باتیں کرتے۔ ان کی حرکتوں اور نگاہوں سے صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ دماغی توازن کھو چکے ہیں اور قتل و غارت اور وحشیانہ پن پر اتر آئے ہیں۔ یہ سارا جھگڑا اس بچی کھچی خوراک پر تھا جو ابھی تک کشتی میں محفوظ تھی اور مسافر اسی کے سہارے جی رہے تھے۔ اور اب یہ قاتل لوگ چاہتے تھے کہ کشتی کے بقیہ مسافروں کو ختم کر کے اس خوراک پر قبضہ کر لیں۔ اسی رات سمندر میں ایک ہولناک طوفان آیا اور ہماری کشتی اس طوفان کے رحم و کرم پر چلنے لگی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اس رات کشتی کا کوئی مسافر بھی نہیں بچ سکے گا' کیونکہ ہر آن یہ خدشہ تھا کہ کشتی سمندر میں غرق ہو جائے گی۔ بہت سے لوگ رو رو کر اور کانپتی ہوئی آوازوں میں خدا سے کشتی کی سلامتی کی دعائیں مانگنے لگے۔ یہ طوفان چھ گھنٹے تک جاری رہا اور اس نے ہماری کشتی کو نجانے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

دوسرے روز صبح آدمیوں کا شمار کرنے سے پتہ چلا کہ بیس آدمی کم ہیں۔ کشتی میں دہشت اور سراسیمگی کی زبردست لہر دوڑ گئی۔ لیکن کسی میں اتنی جرأت نہ تھی کہ ان گم ہونے والے آدمیوں کے بارے میں تحقیق و تفتیش کر سکے۔ دو روز بعد ڈچ آفیسر نے' جس پر جاں کنی کی سی کیفیت طاری تھی' یکا یک سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ اس کا سارا جسم دھوپ میں سوکھ سوکھ کر سیاہ پڑ گیا تھا۔ چند منٹ تک وہ الٹے سیدھے ہاتھ پیر مار کر تیرتا رہا۔ پھر ایک اونچی سی لہر آئی اور ڈچ آفیسر کو اپنی آغوش میں لیتی ہوئی دور تک چلی گئی۔ اس کے بعد میں نے اس کی شکل نہیں دیکھی۔ ڈچ آفیسر کی بیوی کے چہرے پر موت کی سی زردی چھا گئی۔ فاقوں اور پیاس نے اسے پہلے ہی بے جان کر دیا تھا۔ اب شوہر کی اس دلدوز موت نے اسے بالکل ہی ختم کر کے رکھ دیا۔ اس روز وہ سارا دن روتی رہی۔ دوسری دو عورتوں نے اسے دلاسا دینے کی بڑی کوشش کی مگر اس کے آنسو نہ تھمے۔ اور پھر سورج غروب ہونے کے وقت وہ آہستہ سے اپنی جگہ سے اٹھی اور سمندر میں کود گئی۔ اس معصوم عورت کی موت کا صدمہ سبھی کو ہوا۔

بریگیڈیئر آر چی کی حالت روز بروز خراب سے خراب تر ہوتی جا رہی تھی۔ وہ نہایت لمبا تڑنگا اور قوی آدمی تھا' لیکن چند ہی روز میں وہ گھل گھل کر ہڈیوں کا چلتا پھرتا ڈھانچہ رہ گیا۔ اس کا وہ رعب داب' جو شروع شروع میں کشتی پر چھایا رہا' ختم ہو چکا تھا۔ وہ اب ایک گوشے میں پڑا زندگی کے آخری سانس گن رہا تھا۔ کیپٹن مائک بلیک وڈ البتہ اس کی دیکھ بھال اور نگرانی کرتا رہا' یہاں تک کہ وہ اپنے حصے کا پانی اور خوراک بھی بریگیڈیئر کے لیے سنبھال کر رکھ لیتا۔ ایک روز آر چی نے لیٹے لیٹے دفعتہً اپنا سر اٹھایا اور نحیف آواز میں کیپٹن بلیک وڈ سے کہا:

"آؤ میرے ساتھ کلب تک چلو۔ ذرا ایک ایک گلاس پئیں گے۔"

بلیک وڈ پھٹی پھٹی نظروں سے اپنے افسر اعلیٰ کی طرف تکنے لگا۔ اسے احساس ہوا کہ آر چی کا دماغ جواب دے گیا ہے۔ اس نے آہستہ سے جواب دیا: "شام کو چلیں

گے جناب۔ ابھی آپ آرام کیجیے۔" اس کے دو گھنٹے بعد بریگیڈیئر آرچی نے دم توڑ دیا۔ کپتان بلیک وڈ نے اس کی موت کا اعلان کیا اور جب ہم اس کی لاش سمندر کی بے تاب اور بھوکی موجوں کے حوالے کرنے لگے تو ہمارے دل زور زور سے دھڑک رہے تھے۔ بلیک وڈ نے کانپتے ہوئے اور کمزور لہجے میں بائبل کی چند آیات پڑھیں اور آرچی کی لاش سمندر میں پھینک دی گئی۔ اسی رات بلیک وڈ کو خون کی قے آئی۔ چند منٹ تک وہ بے ہوش پڑا رہا اور پھر وہ بھی رخصت ہوا اور اس کی لاش بھی مچھلیوں کی ضیافت کے لیے سمندر کے حوالے کر دی گئی۔

ان دو افسروں کی مرگ ناگہاں کا صدمہ ابھی دلوں پر تازہ تھا کہ ایک تیسری واردات رونما ہوئی۔ ڈچ کپتان کو انجینئر نے چھرا گھونپ کر ہلاک کر دیا۔ کشتی میں ایک بھیانک چیخ گونجی۔ دو آدمیوں کے ایک دوسرے سے لڑنے اور جھپٹنے کی آوازیں سی سنائی دیں اور اس سے پیشتر کہ کوئی شخص موقع پر پہنچتا' انجینئر نے کپتان کی پسلیوں میں چھرے کا چھ انچ لمبا پھل گھونپ دیا۔ "پکڑو اس بدمعاش کو۔" کسی نے پکار کر کہا اور کئی لوگ اٹھ کر انجینئر کو پکڑنے کے لیے لپکے جو پانی اور خوراک پر قبضہ جمانے کی فکر کر رہا تھا۔ انجینئر نے بدحواس ہو کر سمندر میں چھلانگ لگا دی۔

آٹھویں روز پانی کی آخری بوتل بھی ختم ہو گئی۔ اس روز لیفٹیننٹ کرنل پامر نے پہلی بار کشتی کے باقی ماندہ افراد سے مخاطب ہو کر کہا: "میرا خیال ہے کہ ہم میں سے کوئی زندہ نہیں بچے گا۔ آؤ ہم خدا سے دعا مانگیں۔"

اس وقت شمار کیا گیا تو کشتی میں پچاس افراد موجود تھے۔ لیکن اگلے ہی روز کرنل پامر اپنی جگہ مرا ہوا پایا گیا۔ اس کے گلے پر انگلیوں کے نشانات واضح تھے۔ یقیناً کسی سنگ دل نے اس کا گلا گھونٹ دیا تھا۔

قاتلوں کا گروہ اب کھل کر سامنے آ گیا تھا' کیوں کہ ان کی راہ کے جتنے روڑے تھے' یکے بعد دیگرے سب دور ہو چکے تھے۔ ایک بار تو ان وحشیوں نے سفاکی کی انتہاء

ہی کر دی' ایک سپاہی پر ٹوٹ پڑے۔ چار آدمیوں نے اس کے ہاتھ پیر پکڑے اور پانچویں نے ٹین کے ڈبے کے پتلے سرے سے جو چھری کی مانند تیز تھا' اس کا گلا کاٹ ڈالا اور لاش کو سمندر میں پھینک دیا۔ ان کی اس حرکت سے کشتی کے تمام لوگوں کو یقین ہو گیا کہ موت ہر لمحے ان کے نزدیک آ رہی ہے اور اگر ان سے چھٹکارا نہ پایا گیا تو یہ ایک ایک کر کے سبھی کو مار دیں گے۔ وارنٹ آفیسر میکنزی نے اس خطرناک صورت حال کو فوراً محسوس کیا اور مجھ سے کہا:

"مرنا تو بہر حال ہے۔ پھر کیوں نہ ان بدمعاشوں کو جہنم رسید کر کے ہی مریں؟"

میں نے اس کی رائے سے اتفاق کیا۔ رات ہوئی تو میں نے کشتی کے تمام آدمیوں سے میکنزی کی رائے کا ذکر کیا۔ چودہ آدمی ہمارے ساتھ ہو گئے۔ آہستہ آہستہ سرکتے ہوئے ہم ان موذیوں کے سر پر پہنچ گئے' جو ایک جگہ پاس لیٹے ہوئے غالباً کسی اور کو قتل کرنے کا منصوبہ باندھ رہے تھے۔

انہوں نے جب ہماری آہٹ سنی تو چوکنے ہو گئے اور ان میں سے ایک نے چلا کر کہا:

خبردار! ہمارے نزدیک کوئی نہ آئے ورنہ......"

اس کے ساتھ ہی اس نے ایک بوتل پکڑ لی اور لڑنے کے لیے تیار ہو گیا۔ ہمارے ساتھیوں میں سے ایک شخص ہارڈی نامی نے ہمت کر کے اس پر چھلانگ لگائی' لیکن بدمعاش نے بوتل اس زور سے اس کے سر پر ماری کہ ہارڈی کا بھیجا باہر نکل آیا...... اس اثناء میں ہم سب مل کر ان پر ٹوٹ پڑے۔ کافی دیر تک زور آزمائی ہوتی رہی' لیکن تا بہ کے...... آخر ہم نے ان پر قابو پا لیا' مگر حال یہ تھا کہ ہمارے جسموں سے چمٹے ہوئے کپڑے' جو پہلے ہی بوسیدہ اور تار تار ہو چکے تھے' بالکل ہی اُتر گئے۔ اب ہم سب برہنہ تھے۔ ہم نے ان پانچوں بدمعاشوں کو باری باری سمندر کے حوالے کر دیا۔

اس کے بعد مجھے یاد نہیں کہ ہم کتنے دن تک مزید سفر کرتے رہے' کیوں کہ مسلسل فاقوں اور یاس نے ہمیں قطعی نڈھال کر دیا تھا اور سوچنے سمجھنے کی قوت سلب کر لی تھی۔ کشتی آپ ہی آپ بیکراں سمندر میں بہتی چلی جا رہی تھی۔

ایک روز صبح کا ذکر ہے۔ میں اوندھے منہ کشتی کے اندر پڑا تھا کہ یکا یک اپنی پشت پر میں نے نمی سی محسوس کی۔ آہستہ آہستہ یہ نمی زیادہ ہوتی چلی گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ سمندر کا پانی کشتی کے اندر آ رہا ہے۔ بمشکل کروٹ بدلی تو معلوم ہوا کہ یہ سمندر کا پانی نہیں ہے بلکہ بارش ہے بارش...... آسمان پر پانی سے بھرے ہوئے بادل کا ایک وسیع وعریض ٹکڑا ہمارے مُردہ جسموں میں زندگی کی نئی لہر دوڑا رہا تھا۔ ہم سب مسرت سے چیخ اٹھے۔ جلد جلد ہم نے سب خالی بوتلیں اس پانی سے بھر لیں۔ بارش بہت تیز ہو رہی تھی اور کشتی کے اندر پانی کافی مقدار میں جمع ہو گیا تھا۔ اگرچہ یہ پانی کشتی کے اندر پھیلی ہوئی غلاظت سے گدلا ہو چکا تھا۔ تاہم ہمارے لیے یہ آبِ حیات سے زیادہ قیمتی تھا۔

اور پھر اسی روز ایک اور عجیب بات ہوئی......

دوپہر کا وقت تھا' ہم سب لیٹے ہوئے یہ سوچ رہے تھے کہ نامعلوم یہ سمندر کب ختم ہوگا یا اس سے پہلے ہماری زندگیاں ختم ہوں گی کہ دفعتہً کشتی کے اردگرد ہم نے چند سفید بحری پرندے اڑتے دیکھے جو غالباً خوراک کی تلاش میں ادھر آ گئے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ زمین اب قریب ہی ہے۔ ہم ان پرندوں کو حسرت بھری نظروں سے تکنے لگے۔ یہ بحری پرندے بے شمار تھے جو فضا میں چکر لگا رہے تھے۔ ان میں سے کچھ پرندے کشتی کے اوپر کناروں پر آ کر بیٹھ گئے۔ ان کی تعداد بارہ تھی۔ ہم بے حس وحرکت پڑے انہیں تکتے رہے۔ آخر سبھی نے یک لخت اُچھل کر انہیں پکڑنے کی کوشش کی۔ ہماری یہ کوشش رائیگاں نہیں گئی۔ سات پرندے ہمارے ہاتھ آ گئے...... ہم میں بھلا صبر کی تاب کہاں تھی۔ فوراً ہی ان کے پر نوچے اور کچا گوشت بھیڑیوں کی طرح چبا چبا کر ہڑپ کر گئے۔

قصہ مختصر منٹ گھنٹوں میں اور گھنٹے دنوں میں تبدیل ہوتے چلے گئے۔ زمین کا نام ونشان بھی نہ تھا۔ اب ایک بار پھر کشتی میں سے آدمی کم ہونے شروع ہوئے' یہاں تک کہ ان کی تعداد سات رہ گئی۔ ایک عورت ڈورس لم' ایک سپاہی' چار جاوا کے رہنے والے آدمی اور ایک میں...... اب ہمیں اندازے کے مطابق' سمندر میں سفر کرتے ہوئے تئیس روز گزر چکے تھے۔ پچیسویں روز دو آدمی اور چل بسے۔ اب ہم پانچ بدنصیب افراد' جو زندگی سے قطعی مایوس ہو چکے تھے' ایک دوسرے کے قریب لاشوں کی مانند پڑے تھے۔ اس سے اگلے روز صبح کے وقت جب میں نے اپنی دھنسی ہوئی آنکھیں کھولیں تو ایک آدمی کو اپنے قریب بیٹھے ہوئے پایا۔ وہ کچھ اشارہ کر رہا تھا۔ میں پوری قوت جمع کر کے اٹھا اور کشتی کے کنارے تک پہنچ کر سمندر کی طرف دیکھا...... دُور...... بہت دُور...... سمندر میں ایک سیاہ دھبہ نظر آ رہا تھا...... آہستہ آہستہ یہ دھبہ بڑا اور نمایاں ہوتا گیا۔ ہماری کشتی اس کی طرف تیزی سے چلی جا رہی تھی......

اس کے بعد مجھے یاد نہیں کیا ہوا' ...... کیوں کہ میں نقاہت کے باعث بے ہوش ہو گیا تھا۔

آنکھ کھلی تو میں نے اپنے آپ کو زمین پر لیٹے ہوئے پایا۔ میرے اردگرد بہت سے لوگ کھڑے تھے۔ معلوم ہوا کہ ہماری کشتی 26 دن کے سفر کے بعد سی پورا نامی ایک جزیرے پر رُکی ہے جو سماٹرا سے مغرب کی طرف ساٹھ میل دور ہے۔ اس جزیرے پر ہم چھ ہفتے مقامی باشندوں کے مہمان رہے۔ بعدازاں جاپانی آئے اور وہ ہمیں گرفتار کر کے ایک قیدی کیمپ میں لے گئے۔ لیکن اس بھیانک سفر کی تمام لرزہ خیز یادداشتوں میں سے اگرچہ سبھی ایسی ہیں جو میں مرتے دم تک نہ بھولوں گا' تاہم ایک بات ایسی ہے جو ان سب پر فوقیت رکھتی ہے۔ جب ہم جزیرے پر اُترے' تو ایک شخص نے آئینہ لا کر

میرے ہاتھ میں تھما دیا......اور جب میں نے آئینے میں اپنی شکل دیکھی تو جسم پر کپکپی سی طاری ہوگئی۔ میری نظروں کے سامنے ایک ایسے جانور نما انسان کی شبیہ تھی جسے دیکھ کر رحم آتا تھا۔ سوکھا اور سیاہ چہرہ' اندر کو دھنسی ہوئی زرد اور بے نور آنکھیں' گالوں کی ہڈیاں اُبھری ہوئی' سر' ڈاڑھی اور مونچھوں کے بال سب ایک ہو چکے تھے۔ جسم کی ایک ایک ہڈی نمایاں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہڈیوں کے ڈھانچے پر سیاہ اور جلی ہوئی کھال منڈھ دی گئی ہے۔ میں نے گھبرا کر آئینہ زمین پر پٹخ دیا اور ڈورس لم کی طرف دیکھا......اس کے مرجھائے ہوئے ہونٹوں پر مسرت کا ہلکا سا تبسم نمودار ہوا۔ پھر وہ زور سے ہنسی۔ میں بھی اپنی حالت پر مسکرا دیا اور غالباً یہ پہلا موقع تھا کہ جہاز تباہ ہونے کے بعد ہم پہلی بار ہنسے تھے......اور اس لیے کہ ہم ایک مرتبہ پھر موت کی سرحد سے پلٹ کر زندگی کی حدود میں داخل ہو گئے تھے۔

* * *